نشاط فاطمہ

آنسو جو بہہ نہ سکے

آنسو
جو
بہ
نہ
سکے

آنسو جو بہہ نہ سکے

نشاط فاطمہ

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ○ راولپنڈی ○ کراچی

بارِ سوئم ۱۹۷۶ء
تعداد ۲۰۰۰
قیمت [illegible]

مطبوعہ

فیروز سنز لیٹڈ لاہور باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر و پبلشر

تب کوڑھی نے آپ کے ہاتھوں کی سختی محسوس کی اور پوچھا:-

"آج صدّیق نہیں آئے۔"

امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

"صدّیقؓ وفات پا گئے۔ مگر یہ تم کو کیسے معلوم ہُوا کہ وہ آج نہیں آئے؟"

کوڑھی نے کہا "وہ مجھے اپنے ہونٹوں سے کھانا کھلاتے تھے اور مجھے تکلیف نہیں ہونے دیتے تھے۔

اِس پر حضرت عمرؓ رو پڑے۔

اُوپر چھاجوں پانی پڑتا تھا اور نیچے ذرا سی بانس کی باشا میں ٹپکا نہ لگتا تو کیا ہوتا۔ یہ اتنی کمزور جو تھی اور اُس کے اعصاب اتنے بے کار تھے کہ وہ ادھر کونے تک بھی سرک نہ پا رہا تھا۔ وہ کوڑھی تھا اور اُس کے زخم دُکھتے تھے۔ اور ادھر اس کی کُٹیا میں اندھیرا تھا اور باہر بھی اندھیارا تھا، بدلی جو اُمڈ رہی تھی۔ بجلی کی چمک پر ذرا سا اُجالا ہُوا تو اُس نے سرکنے کی کوشش کی مگر زخم دُکھتے تھے۔ ان کا مداوا اِس بارش اور بدلی کی اندھیری دُنیا میں کسی کے پاس نہ تھا۔

بڑے زور کا طُوفان آیا ہُوا تھا۔ کٹھل کچّے ہی دھما دھم زمین پر گر رہے تھے۔ چاول کے کھیت پانی میں ڈُوبے ہُوئے تھے اور کوڑھیوں کے زخم ایسے سمے کچھ اور دُکھنے لگتے ہیں۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا، اپنا گاؤں چھوڑ کے، اُس پاس کچھ کوڑھی زیادہ ہی بڑھ گئے تھے مگر اس جگہ تو وہ اکیلا ہی تھا اور کس مپرسی میں تھا۔ وہ ذرا سا کراہا، کیونکہ اُسے بھُوک لگ رہی تھا۔ شاید کوئی اس طوفان میں بھی سُن لے اور اسے کچھ کھانے کو دے دے۔ مگر یہاں تو محض طوفان تھا۔ سراجُ الدّولہ تو ختم ہو چُکا تھا اور اُس کا بنگال کوڑھی تھا جس کے لیے اس نے میر جعفر سے کہا تھا "تُو نے میرے بنگال کو بیچ دیا۔ یہ تُم نے اچھا نہ کیا" خود سراجُ الدّولہ کوڑھی کی طرح بے بس تھا۔ پھر اُس نے سوچا اِن زخموں کا کوئی چارہ گر بھی ہوگا۔ میرے نہ سہی ان آنے والی نسلوں کا۔ پھر اُس دن سے اُسے اِنتظار رہا۔

اُدھر کلکتّے میں بڑی رونق لگی تھی۔ وہاں بھی ایک طوفان تھا۔ بنگال میں اب سفید حکمرانوں کی راجدھانی تھی اور وہ مغربی بنگال کی ترقّی کے لیے کوشاں تھے۔ کلکتّے اور اُس کے آس پاس بڑی گہما گہمی تھی۔ مگر یہ تو سراجُ الدّولہ کا بنگال تھا جہاں اُس کے نام کی دُہائی دینے اور اُس سے فریاد کرنے والوں میں ایک کوڑھی بھی تھا۔ مگر اِن تاجروں کو اس بنگال سے عناد تھا۔ پھر اس میں سکت کہاں تھی۔ اور پھر وہ اندھا بھی تو تھا۔ وہ کلکتّے جا کر اس کی رونق کیسے دیکھتا۔ اُس نے تو سراجُ الدّولہ کا بنگال دیکھا تھا۔ جب اس کے آنکھیں تھیں۔

بجلی ایک بار پھر سے اُور کڑکی مگر وہ سرک نہ سکا اور نہ جانے کِس کے اِنتظار میں بیٹھا رہا۔ قریب پوکھر (تالاب) میں کنول بڑے بڑے تھے۔ مگر اِس کے لیے بھی تو بینائی چاہیے تھی اور لوگوں کے باشا سے آتی ہُوئی بانسری کی تان پر وہ کیا کان دھرتا۔ اس کی

آواز تو ایسے میں اَور بھی دُکھ کا باعث ہوتی ہے - وہ بھی کبھی
بانسری بجاتا تھا - آخری چیز جو اُس نے بیچی وہ بانسری ہی تھی -
پر اب تو وہ ہوتی بھی تو وہ بجا نہ سکتا تھا - اس کے ہونٹوں پر
زخم تھے - مگر وہ منتظر رہا .....

یہ علاقہ بے حد ہرا بھرا تھا - بانس کے جُھنڈ تھے - آموں
کے لدے پھندے درخت تھے جن پہ بھنورے اور شہد کی مکھیاں
منڈلا رہی تھیں - ہلکی ہلکی پھُوار درختوں پر پڑ رہی تھی اور جب
کوئی درخت زور سے جھُومتا تو بارش ان کے سروں پہ برستی تھی
اور وہ زور سے ہنستے تھے - اُنھیں بھیگنے کی کوئی پروا نہ تھی -
شاید اِس لیے کہ وہ بہت کم عمر تھے - اندیشوں اور واہموں سے
اُن کے ذہن آشنا نہ تھے -

وہ یہاں سیتاپُور سے آم کھانے آئے تھے - بدلی پھر جُھک
آئی تھی اور آم کے پیڑوں تلے گھور اندھیرا تھا - پر سبز دوپٹے والی
لڑکی کی چُوڑیاں اسی اندھیرے میں جھمک رہی تھیں - اُسے کِسی
نے پُکارا تھا "زہرہ!" مگر وہ پیڑوں سے نکل کر آگے سڑک
سے ذرا پرے آگئی تھی - اُس کے سیاہی مائل بھُورے بالوں پہ
پھُوار پڑ رہی تھی - غالباً وہ بھیگنا چاہتی تھی - اس سے دُور سڑک پہ
اُس نے ایک کوڑھی فقیر جاتا ہُوا دیکھا - اس کے گلے پچکے ہوئے

تھے ، وہ لمبا اور صاف رنگت کا تھا حالانکہ اُس کے چہرے پر زخم
تھے اور عجیب بات تھی کہ اس کے بال خود اُس کے بالوں کے رنگ
کے تھے اور اسی رنگ کی مونچھوں پہ بارش کے قطرے چمک
رہے تھے - اس کے سر پہ ذرا سا آسمان کھُل گیا تھا اور اتنا ٹکڑا
بدلی میں گھِرا ہُوا بہت نیلا لگ رہا تھا - شاید اِس کی نیلاہٹ میں
فقیر کی آنکھیں نیلی نظر آ رہی تھیں -

اس لڑکی نے ایک لحظہ غور سے اُس کی طرف دیکھا اور واپس
جانے کو مُڑ گئی - فقیر نے ٹھٹک کے اُسے دیکھا اور چلتے چلتے مُڑ
مُڑ کے دیکھتا رہا - حتیٰ کہ وہ چھُپ گئی - پیڑوں کے نیچے پہنچ کر
لڑکی نے ایک بار سڑک کی طرف اور نظر دوڑائی اور وہ اُسے
قبرستان میں گُم ہوتا دکھائی دیا - وہ ایک زخم خوردہ بھکاری تھا مگر
لڑکی کو اُس سے کراہت محسُوس نہیں ہُوئی -

چلتے چلتے فقیر نے سوچا اگر وہ سبز دوپٹے والی لڑکی جلدی
گھر نہیں جائے گی تو بھیگ جائے گی - بدلی بڑے زور کی آئی
ہے - بھلا یہ بھی کوئی موقع تھا بارش پانی میں نکلنے کا - مگر اِس
عُمر میں گھُومنے کا کِس قدر شوق ہوتا ہے - تھوڑی دُور آ کے
اُس نے پھر سوچا ، شاید اب وہ چلی بھی گئی ہو -

اور یہاں اس مقام پہ بھی کہر چھایا ہُوا تھا۔ سارا مُلک دُھند
میں ڈول رہا تھا۔ اور جب دُھند زیادہ چھاتا تو اُس کا دِل ڈُوبنے
لگتا۔ اُسے روشنی سے محبت تھی۔ وہ ہر گھڑی روشنی کی تلاش میں تھا۔
اسی لیے وہ وہاں جانے سے خوش تھا جہاں دُھوپ تھی۔ ویسے بھی
کم عُمری میں نئی جگہ جانے کا شوق ہوتا ہے۔ گھر میں سامان ہر طرف
بکھرا ہُوا تھا۔ یہ لوگ ہندوستان جا رہے تھے۔ گھر میں اُداسی تھی۔
اپنے مکینوں کی جُدائی کے غم کا عکس جلتے ہُوئے جھاڑ فانُوس پر بھی
پڑ رہا تھا اور ان کی روشنی دُھند میں ڈُوبا ہُوا اُجالا بکھیر رہی تھی۔
گھر کی رونق مکینوں کے دم سے ہوتی ہے۔ گھر خُود تو کُچھ بھی نہیں
ہوتا۔ گھر تو اُجڑتے اور بستے ہی رہتے ہیں اور جب اُس کے
مکینوں کے دل اُجڑ جاتے ہیں تو اُس پر ویرانی اور اُداسی آ جاتی
ہے۔ اِس گھر کے مکین ابھی موجُود تھے مگر اِس میں ویرانی اور
تنہائی تھی۔

ویسے یہ گھر بڑا شان دار تھا۔ اِس نے بڑے وقت دیکھے
تھے اور اِس کے مکینوں نے اسے ہر زمانے میں طرح طرح

سے سجایا تھا۔ اس وقت تو یہ نیو وکٹورین طرز سے سجا ہُوا تھا۔
مگر اِس میں بیروک اور رکوکو نوادرات محفُوظ تھے۔ رکوکو کی
سیپ کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بیروک زمانے کے مرمر کے آدھے
مجسّمے گھر کے مکینوں کی مُستقل خوش حالی، خوش سلیقگی اور قدامت کا
پتا دیتی تھیں۔

ان کے یہاں ایڈورڈین اور جورجین طرز کی کچھ چیزیں بھی محفوظ
تھیں۔ جس سے لگتا تھا کہ یہ اس زمانے کے قدردان تھے مگر یہ
رکوکوین وقت کے سکون اور آرام کے زیادہ قائل تھے۔

اور اب اس کے محافظ جواں سال خوش باش مگر متفکر لارڈ البرٹ
جارج ہمفری تھے، جو چند دِن میں ہندوستان روانہ ہونے والے
تھے۔

اُن کے بٹلر نے انھیں چاندی کی کشتی میں ڈاک پیش کی۔ اُنھوں
نے پائپ ایک طرف رکھا اور اپنے خط اُٹھا لیے۔ پھر اُن کی
نظر کشتی میں رکھے ہُوئے خط کے پتے پر پڑی۔ یہ فرانس سے اُن
کی بیوی کے نام ان کی خالہ ہیریٹ کی طرف سے آیا تھا، جسے
دیکھ کے ان کی گھنی مُونچھوں تلے ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار
ہُوئی۔ پھر وہ اپنے خطوط کی طرف مُتوجّہ ہو گئے۔

اُن کی بیوی نے خط پڑھ کر سر پکڑ لیا اور سامنے کھڑی ہوئی
بُوڑھی گورنس سے گویا ہُوئیں "اب یہ ایک اور مصیبت۔ آنٹ

ہیرئٹ کو خود جاکے لانا ہے ورنہ وہ نہ آئیں گی۔ کب سے میں
البرٹ سے کہہ رہی تھی مگر وہ کسی کی سُنیں بھی۔ پھر انھیں تو
ویسے بھی میری خالہ کُچھ پسند نہیں۔ اب اُس وقت تو مجھے اُن کی
ضرورت ہے۔ اِس گھر کے لیے بھی تو کوئی چاہیے ہے۔"

وہ سوچ میں پڑگئیں۔ گورنس کے چہرے پہ مُسکراہٹ نمودار
ہُوئی۔ وہ کہنے لگی "یہ بات نہیں ہے۔ لارڈ ہمفری کو بُوڑھے بُرے ہی
لگتے ہیں۔"

ایک ٹک لیڈی ہمفری نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور جزبز
ہوکر بےبسی سے سر جُھکا لیا۔ اپنے میاں اور گورنس کے درمیان
وہ غلط فہمیاں کبھی دُور نہ کرواسکیں اور مصروفیت میں تو بحث کا
کوئی وقت ہی نہ تھا۔

گورنس بچّوں کی طرف چلی گئی۔ اس نے بڑے پیار سے بڑے
لڑکے سے کہا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے جس پر وہ کہنے لگا "پھر کیا
کروں؟ ممی نے سکول سے چُھٹی کرا دی۔ ہم ہندوستان جارہے ہیں
تو کھیلوں بھی نہیں۔"

اُس نے کہا "ایسے جواب نہیں دیتے۔ تُم پڑھو۔"

لڑکے نے کاہلی سے کہا "کیا پڑھوں؟"

"تم تاریخ پڑھو۔"

بوڑھی گورنس کی نظر میں تاریخ تمام مضامین سے اہم مضمون تھا۔

اِس میں اِنگلستان کے بادشاہوں اور ملکاؤں کے قصّے تھے۔ لڑکے
نے وہی صفحہ کھول لیا جو وہ پڑھتا تھا اور جس سے وہ جلتی تھیں۔

"ہنری دوم ۱۱۸۹-۱۱۵۴ء وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ اس نے ٹامس
اے بیکٹ کو گرجا میں قتل کروایا۔ اس وقت وہ آرچ بشپ تھا۔"

اُس نے پوچھا "تم ہمیشہ یہی کیوں پڑھتے ہو؟ اُس نے بہت
بُری حرکت کی تھی آرچ بشپ کو گرجا میں قتل کروایا۔ ایسی باتوں کا
ذکر تاریخ میں نہ ہونا چاہیے۔ کیا خرافات ہے۔"

اِس پر لڑکے نے کہا "پھر وہ کہاں کرواتا۔ پوپ اور آرچ بشپ
قتل ہوں گے تو گرجا ہی میں تو ہوں گے۔"

گورنس نے غُصّے سے کہا "مگر وہ قتل کیوں ہوں؟ وہ گرجا کے
مُحافظ ہیں۔"

لڑکے نے بھی اُس کی نقل میں غُصّے سے کہا۔ "گرجا سے کچھ نہیں
ہوتا۔"

"پھر کِس سے ہوتا ہے؟" گورنس نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔"

یہ کہہ کر لڑکے نے کتاب پھینک دی اور زور زور ہنسنے لگا۔
اُس کی ہنسی کی آواز سُن کر اس کا چھوٹا بھائی دوڑا آیا اور پوچھنے لگا:

"کیا ہُوا؟"

گورنس نے بڑے لڑکے کا غُصّہ اُس پر اُتارا اور کان پکڑکے اسے

تاریخ پڑھانے لے گئی ۔

چھوٹے لڑکے نے کہا "آپ اس ایڈورڈ کو کیوں نہیں ڈانٹتیں؟ ہمیشہ مجھ ہی کو کیوں ڈانٹتی ہو"؟

"اُسے بھی ڈانٹوں گی۔"

مگر یہ بات نہ تھی وہ گورنس کا لاڈلا تھا ۔ پھر اُس نے انگلستان کی تاریخ کا زرّیں باب کھولا اور اُس پر نظریں جمائے رہی ۔ "الزبتھ اوّل جس نے سپینش آرمیڈا کو شکست فاش دی، مُلک میں پروٹسٹنٹ کا اِعتدال آمیز طریقۂ عبادت رائج کیا، (گورنس خود پروٹسٹنٹ تھی) عِلم و فن کو ترقّی دی ۔ شکسپیئر، مارلو، سڈنی اور بن جونسن جیسے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی ۔ اِس کے عہد میں فیشن اور نفاست کو عرُوج ہُوا اور عیش و نشاط کی محفلیں مُنعقد ہُوئیں ...."

اور یہ آنٹ ہیریٹ بڑے کرّوفر کی بیوی تھیں ۔ ان کی بھانجی ان کا بازو تھامے داخل ہُوئیں ۔ خالہ ہیریٹ جھالروں اور لیسوں میں غرق تھیں ۔ اُنھوں نے دونوں لڑکوں کو دیکھ کر مصنوعی خوشی کا اِظہار کیا اور اپنا گال پیش کیا ۔ پیٹر نے پنجوں کے بل ذرا سا اُچک کے اُنھیں پیار کیا ۔ نہ ایڈورڈ نے ان سے پُوچھا "آپ اپنے طوطوں کا پنجرا لائی ہیں"؟ اِس سوال اور پیار نہ کرنے پر اُنھوں نے احتجاجاً گول گول دِیدوں سے بھانجی کی طرف دیکھا اور حیرت و صدمے کی مِلی جُلی "اوہ"

کی ۔ بھانجی شرمسار ہُوئیں اور اُنھوں نے ننھے بیٹے کو گھُورا ۔ پھر اُنھیں جلدی سے اندر لے گئیں ۔

بیوی کے اِتنا سمجھانے کے باوجود لارڈ ہمفری نے خالہ ہیریٹ کا اِستقبال نہ کیا ۔ وہ رُوپوش ہو چکے تھے ۔ لیکن خالہ چُوکنے والی نہ تھیں ۔ اُنھوں نے محبّت سے پُوچھا ۔ "ڈیر البرٹ کہاں ہیں"؟

وہ کہیں ہوتے تو وہ غریب بتاتیں ۔ وہ بہانے بنانے لگیں ۔ لیکن آنٹ ہیریٹ کو اُن سے ملنے کا ایسا ارمان نہ تھا ۔ اِنھیں وہ اور اُن کی ادائیں ذرا پسند نہ تھیں ۔

دراصل لارڈ ہمفری امارت پرست نہ تھے ۔ انھیں سدا گھٹیا گھٹیا نوکریاں کرنے اور غیر تہذیب یافتہ جگہوں میں رہنے کا شوق رہا ۔ شادی کے بعد وہ افریقہ میں رہے اور اب ہندوستان جا رہے تھے ۔ یہ نہیں کہ سیاست پر دھیان دیتے ۔ ہاؤس آف لارڈز کی ممبری کے لیے کوشش کرتے ۔ اچھا جا بھی رہے تھے تو گورنر جنرل یا وائسرائے کا عُہدہ سنبھالتے ۔ یہ لارڈ ڈلہوزی اور کیننگ بھی تو تھے ۔ وہ بھی تو لارڈ ہی تھے ۔

خالہ ہیریٹ کے لیے زمانہ بدلا نہ تھا ۔ وہ فولادی دیوار بنا کھڑا تھا ۔ صرف پیارے اچھے لوگ مر جاتے تھے ۔ اُنھیں اِس کی قطعی خبر نہ تھی کہ جاگیرداری سماج قصّۂ پارینہ بن رہا ہے ۔ اُن کی نظر میں یہ لارڈ ہمفری کی سراسر بدتمیزی تھی کہ اُن کے آنے کا معلوم تھا

اور غائب تھے۔ وہ تو کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھتیں اگر بے چاری
جین خود جا کے اُنھیں نہ لائی ہوتی۔

خیر، چائے کے وقت وہ آئے لیکن خالہ ہیریٹ نے اُنھیں اپنا
گال نہیں پیش کیا۔ ایک بار وہ زک اُٹھا چکی تھیں۔ اُنھوں نے
صرف اِتنا پوچھا: "اُمید ہے سفر خوشگوار اور آرام دہ رہا ہوگا۔" پھر
وہ ہنس پڑے۔ ان کا یہ بات بے بات ہنسنا بھی انھیں بہت کھلتا
تھا۔ وہ تاؤ کھا گئیں۔ مگر چُپ رہیں۔ وہ بڑی با تکلف شائستہ خاتون
تھیں۔ اُنھوں نے طشتری ایک طرف رکھی اور بہت تکلف سے
اُن کے پوچھنے کا شکریہ ادا کیا اور چند الفاظ سفر کے متعلق کہے۔ اُنھوں
نے محسوس کیا کہ جین کا بڑا لڑکا بھی اپنے باپ کی طرح خاصا بدتمیز
ہے۔ وہ بھی بات بے بات ہنستا تھا۔ البتہ چھوٹا قدرے
معقول ہے۔

سامانِ سفر تیار تھا۔ ہر چند کہ وہ نئی جگہ جانے سے خوش
تھے مگر اب کی بار اُنھوں نے حسرت سے ایک نظر اپنے گھر پہ
ڈالی اور اپنی ماں کی تصویر کے آگے جا کے کھڑے ہو گئے۔ جس کا
کارکوفریم مُرصّع اور نازک تھا۔

وہ مُطالعے کے کمرے میں نیو وکٹورین طرز کی مُنقّش ڈیسک کے
سامنے، جس پہ چاندی کے شمعدانوں میں بے جلی شمعیں لگی تھیں،

کُرسی پہ بیٹھ گئے اور ضروری خطوط کے جوابات دیتے دیتے انھوں نے
قلمدان بڑھا دیا اور سوچنے لگے "جب میں ہندوستان جانا چاہتا تھا
تو میری حکومت نے مجھے نوعمر قرار دیا۔ وکٹوریہ جو جڑیں مضبوط کر گئی
تھی۔ وہ اُس کے جانشین کھوکھلی کرتے گئے۔ میرے جانے کا
حکومتِ برطانیہ کو اب کُچھ ایسا فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ میری ذات کو کُچھ
سہولتیں اب اور آیندہ کے لیے ہو جائیں گی۔ لیکن وہ بھی کُچھ
زیادہ نہیں ہوں گی کیونکہ میری اور وہاں جانے والے دوسرے لوگوں
کی اقدار میں فرق ہے۔ میں رشوت اور خوشامد کا بازار گرم کر کے
فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

پھر وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور ان خیالات کا اظہار اُن سے
کیا تاکہ وہ اُن سے زیادہ امیدیں وابستہ نہ رکھیں۔

اِس پہ وہ کہنے لگیں "اِس کا مطلب ہے کہ ہم اب نہیں جا
رہے ہیں"

"یہ میں کب کہہ رہا ہوں جین۔ ہم جا رہے ہیں۔ میں یہ بتا رہا
ہوں کہ یہ بیسویں صدی ہے اور اِس صدی کے آغاز میں وکٹوریہ
ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرو۔
تمھارے بچپن میں خواتین یہاں آ کے خوابناک باتیں کرتی تھیں کہ وہاں
مٹی میں سونا مِلا ہے، بس اُٹھانے کی دیر ہے۔ اب ایسی کوئی بات
نہیں ہے۔ پھر تم مجھے جانتی ہو۔"

اس پر وہ جھنجھلا کے کہنے لگیں "میں یہ سب سوچ کر کب جا رہی ہوں۔ تم افریقہ رہے۔ میں یہاں اکیلی اتنے دن رہی۔ میں اب اکیلی نہیں رہوں گی۔"

"وہ ٹھیک ہے۔ مگر پھر بھی تم پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ وہ اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا ہندوستان نہیں ہے۔ دیکھو ایک زمانہ تھا جب ۱۸۸۵ء میں تمام ہندوستان سے کُل بہتّر افراد انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کرنے آئے تھے۔ وہ شکر گزار تھے کہ حکومت برطانیہ کے ہیوم جیسے سربراہوں نے ان میں سیاسی شعور پیدا کیا تھا۔ اس وقت وہ خلاف نہ تھے۔ مگر اب بات اور ہے۔ اب وہاں سیاسی تحریکیں بہت زور پکڑ گئی ہیں۔ اور یہ سب نفرت کا بیج انھیں لارڈز کا بویا ہوا ہے۔ اکثر حکومت نے بڑے غلط آدمی بھیجے۔ مثلاً لارڈ ڈلہوزی نے جاتے ہی انھیں یورپین بنانا چاہا جس کا نتیجہ کانپور کا غدر تھا۔ پھر اس نے اُن پر سختی سے قابو پانے کی کوشش کی۔ پھر وہ لارڈ کیننگ تھے جو خود تو گورنر جنرل تھے اور ان کی اہلیہ عیسائیت کا پرچار کرتی تھیں۔

"لوگوں کو لارڈ کیننگ پر بھی اسی قسم کا شُبہ تھا۔ اُن کے عہدے کے لیے یہ بات نازیبا تھی۔ پھر وہ کس لیے ایسا کرنا چاہتے تھے۔ پڑھے لکھے اعلیٰ خاندانوں کے لوگ اپنا مذہب نہیں ترک کرتے۔ نتیجے میں بڑی سخت گڑبڑ ہوئی۔ انھیں عیسائی بنانے

سے کیا فائدہ۔ اس سے کچھ حکومت تو مضبوط نہیں ہوگی۔ آزادی کے مُطالبہ کرنے میں عیسائی اور غیر عیسائی سب مُتّحد ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تُم ایسا کوئی کام کرنے کا خیال نہ کرنا۔"

"میرا ایسا کوئی خیال نہیں۔"

"تُم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو جانی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں کام میں مشغول رہوں گا۔ تم بہت احتیاط سے کام لینا اور اُن میں گھُلنے ملنے کی کوشش کرنا۔ یہ فرسُودہ اور گھناؤنا خیال جس کی حامل تمھاری آنٹ ہیرئٹ اور ان کے ساتھی ہیں کہ ہندوستانی جنگلی اور غیر مہذّب ہیں، بھول جاؤ۔ نہ وہ جنگلی ہیں اور نہ غیر مُہذّب۔ اسی خیال کے تحت یہاں سے بے کار قسم کے لارڈز جنھیں کچھ کرنے کو نہ تھا یا جو تنگ دستی کا شکار ہونے والے تھے کیونکہ جاگیریں ختم ہو گئی تھیں، بھیجے گئے۔ اور وہ ان کو جنگلی سمجھ کر جانوروں کی طرح ہنکاتے رہے اور یہ بھُول گئے کہ وہاں دو قومیں ہیں جن میں سے ایک اس ملک کی حاکم رہی ہے اور اس نے وہاں آٹھ سو برس حکومت کی ہے۔ ہمارے اعلیٰ حکّام حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی شجاعت، علی وردی کی دُور اندیشی اور میسُور کی چار لڑائیاں قطعی نظر انداز کر بیٹھے اور جلد ہی عیش کوشی میں پڑ گئے، جس کا نتیجہ اب سامنے آ رہا ہے۔"

اس پر وہ کہنے لگیں۔ "مگر یہ تم میری آنٹ ہیرئٹ کو کیوں بیچ میں گھسیٹتے ہو۔ ان کا وقت اور تھا۔ سلطنت عُروج پہ تھی۔ اُن کا

وقت ختم ہُوا۔"

وہ کہنے لگے "بالکل نہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتیں۔ اُن کے دماغ کے لوگ قائم رہیں گے۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہُوں کہ اب بھی ہمیں وہاں جڑیں مضبُوط کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور ہم میں سے ہر شخص کو عیسائیت کا پرچار کرنے کے بجائے اُن سے اِنسانوں کی طرح پیش آنا چاہیے۔ یہ میں تمھارے بچّوں کے مُستقبل کے خیال سے کہتا ہوں۔ جس دن ہندوستان آزاد ہُوا، انگلستان اقتصادی موت مر جائے گا۔ حکومتِ برطانیہ —

"وہ اِتنا ہی کہنے پائے تھے کہ بیوی نے بات کاٹ دی اور کہنے لگیں "تمھارے بچّے اپنا مُستقبل خود بنائیں گے اور معاف کرنا حکومتِ برطانیہ کو اب لارڈز کی ضرورت نہیں ہے۔ اُن کا وقت ختم ہوگیا۔ اِس کے ساتھ اُس کی نمائش اور سجاوٹیں بھی گئیں۔ البرٹ، یہ رونق ختم ہُوئی۔ یہ بزم اُٹھ گئی۔ یہ چار دن کی باتیں ہیں۔ یہ سکوٹش برنز کے گھر۔ یہ جورجین عمارتوں کا طرز، یہ انگلیکن نفاستیں، اب سنبھلنا مُشکل ہیں۔ مُجھ سے پُوچھو، میرا دل جانتا ہے جس طرح میں یہ گھر سنبھال رہی ہُوں۔ تمھیں کسی بات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ گرانی بڑھ گئی ہے۔ جھالریں لگانا اور ایسے گھر سنبھالنا کُجا، لمبے لباس بنانا بعض لوگوں کے لیے مُشکل ہو گئے ہیں۔ جاگیرداری سماج سُکڑ گیا ہے۔ یہ اپنے ڈھیلے ڈھالے تول میں مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔

حکومت کو اب نودولتے، تندرست، بے فکرے لوگ چاہئیں، جو محنت کر سکیں اور فرسُودہ اقدار کو سنبھالنے میں وقت نہ گُزاریں اور رہا ہندوستان تو یہ دیر سویر ضرور آزاد ہوگا۔ یہ اِنسانی فطرت ہے۔ ہر شخص آزادی چاہتا ہے۔"

تب اُنھوں نے رنج سے کہا "مگر میرا ماضی؟"

وہ ایک دم چڑ کر کہنے لگیں "تمھیں تمھارے ماضی سے نہ کوئی الگ کر رہا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔"

اور وہ اپنے کمرے میں آ کے سوچنے لگیں کہ یہ نجانے کس چیز کو پکڑنا چاہ رہے ہیں۔ ہر چیز کی اتنی تمہید اُٹھائیں گے۔ اِتنی نصیحتیں کریں گے۔ یہ کہنا، یہ کرنا۔ ایسی ہی تمہیدوں کا طُومار افریقہ جانے سے پہلے باندھا تھا۔ آخر میں رُک گئیں۔ اب یہ ہندوستان جانے کی تمہیدیں ہیں۔ مگر ابکی میں جاؤں گی ضرور۔ اور اِدھر کی بات اُدھر کی بات تمھاری خالہ۔ اللہ جانے یہ میری خالہ کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ اگر البرٹ مجھے تم سے محبّت نہ ہوتی تو کب کی میں اپنی خالہ ہی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ ساری بات اچھّی ہے تم میں۔ مگر ایک خرابی ہے یعنی حد سے بڑھی ہُوئی اِحتیاط اور فضول میں حکومت کی فکر۔ حکومت کی بلا سے تم اِس کی فکر میں گھُلو اور اس کی جڑیں مضبُوط کر دیا اپنے مُستقبل کے لیے کچھ پیسہ بنا لو۔ ایسے ہی حُبُّ الوطنی کے خیالات لے کر افریقہ گئے تھے اور ایسے ہی آ گئے تھے۔ ایسے ہی ہندوستان

جو کچھ بھی نہیں تھے وہ ایسی جگھوں سے پتا نہیں
سے آجائیں گے -
کیا کیا ہو کر آگئے -
لارڈ ہمفری کی طبیعت اِس درجہ مُکدّر ہُوئی کہ وہ پھر خط نہ لکھ
سکے - وہ مانتے تھے کہ جاگیرداری سماج کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی ہیں -
اور یہ نئے لوگ پُر اعتماد اور مضبوط ہیں - مگر وہ اپنے ماضی سے الگ
نہیں ہوسکتے تھے اور یہ ماضی سلطنت برطانیہ سے مُنسلک تھا جس
میں شہنشاہیت تھی - وہ اُنّیس سو چودہ میں پیدا ہُوئے تھے مگر فدایانِ
وکٹوریہ اور سلطنت برطانیہ کے وفادار ادنیٰ خادم تھے اور ہر انڈیا
وکٹ پر وہ یہاں، انگلستان میں، دِل تھام کر بیٹھ جاتے -

وہ اپنے مُطالعے کے کمرے میں لکڑی کے فرش پر بچھے ہُوئے دبیز
قالین پہ ٹہل رہے تھے - آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور اُس کے
فریم پر چاروں طرف نفیس رکوکوین کام بنا ہُوا تھا - شعلے شاہ بلوط
کے اَستر اور اس سے اوپر وال پیپر پہ عجیب نمونے بنا رہے تھے،
جو اُن کی سمجھ میں نہیں آئے - یہ نمونے تجریدی تھے - یہ فضا اُنھوں
نے محسوس کیا، بے حد آرام دہ اور محفوظ ہے - مگر یہ فضا دیرپا
نہ تھی -

اور یہاں بمبئی میں آ کر وہ سمجھے کہ انھیں نوعمری میں کیوں نہ بھیجا
گیا تھا - یہ عجیب و غریب مُلک ہے - اِس کا حُسن اور اس کے وسائل
یہ تاج برطانیہ کا بیش بہا ہیرا ہے - اور ایڈورڈ کے اندر یہاں مسّرت
کے سوتے پھُوٹ پڑے -

"یہاں کتنی دُھوپ ہے۔" اُس نے پیٹر سے کہا -

اور پیٹر نے ناک سکوڑ کر کہا "ہاں، جب ہی تو یہ لوگ اِتنے
کالے ہیں۔"

چند دن وہ لوگ سر مورس کے یہاں لکھنؤ رہے - ایڈورڈ کی
سر مورس کے بیٹے براؤن سے دوستی ہوگئی - لارڈ ہمفری چیف کمشنر
کے عُہدے پر فائز ہو کر آگرہ جا رہے تھے -

ریل کی کھڑکی میں سے، دُور، ایڈورڈ نے کسی لڑکی کی پیٹھ
دیکھی - پھر وہ کہیں ہرے بھرے جھُنڈوں میں گُم ہوگئی - وہ دھانی
رنگ کی اوڑھنی اوڑھے تھی - ریل بہت تیز تھی - وہ جانے کون
تھی - شاید کوئی گاؤں والی ہو - وہ دیر تک کھڑکی سے باہر
دیکھتا رہا -

یہ بنگال اب بالکل ہی بھوکا مر رہا تھا۔عجب حال تھا اس کا۔
بھوک، بے کاری اور بیماری جس میں کوڑھ بہت عام تھا۔ اور یہ
سفید حاکم اُس کی اِس حالت سے مطمئن تھے۔بنگال اُن کی حکومت
پر ایک دھبا تھا۔ مگر جیسے وہ اسے اس حالت میں دیکھ کے
ذہنی طور پر آسودہ ہوتے اور لطف اُٹھاتے تھے۔ شاید اِتنی
مُدت بعد بھی نسل در نسل وہ سراج الدّولہ کی رُوح سے بدلہ لے
رہے تھے۔ اُس کا بنگال بھوکا مر رہا تھا۔

تب اُس نے دُرگا سے یُونہی کہا "بڑی دیر میں آئیں تم۔
کہاں چلی گئی تھیں"

اِس پر وہ کہنے لگی "جاتی کہاں۔محنت کروں، مزدوری کروں،
اپنا تمہارا پیٹ پالوں، اُوپر سے تُم یہ پُوچھتے ہو کہاں چلی گئی تھیں"

"تم تو خفا ہو گئیں۔میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔میں نے تو ایسے ہی
پُوچھا تھا۔آج دیر سے آئی ہو نا"

آج کی بات تھوڑی ہے تُم تو اب ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔میرے
پیچھے پڑ جاتے ہو"۔

"بھئی اب تو دُرگا تم مُجھ سے بہت لڑنے لگی ہو۔میں تو کہتا ہوں
مجھے چھوڑ دو۔ اللہ مالک ہے۔میرا دماغ ایسا ہی ہوتا جاتا ہے۔
کچھ کہہ دیتا ہُوں اور تم بُرا مان جاتی ہو"

"اُرے شمسُو، تمھیں کیسے چھوڑ دُوں۔ مجھے تم سے محبت جو ہے"

اِس بات پہ شمسُو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔"نہیں دُرگا تم چلی ہی
جاؤ۔ یہ بیماری چھُوت کی ہے۔میں جوان جہان بیٹھا ہُوں اور تم محنت
کرتی ہو"

"اچھا بس چُپ بھی ہو جاؤ۔ لو یہ بھات کھا لو۔ اِدھر مُنہ کرو
اِدھر ہے نوالہ"

"ہلکے سے۔یہ زخم دُکھتے ہیں"

اِس پر وہ ہنس کر کہنے لگی "باتیں کرنے سے نہیں دُکھتے؟ اور
جب خاص کر مجھ سے پُوچھ گچھ کرتے ہو؟ آنو پاس گئی تھی"

"مجھے پتا ہے۔مجھ سے کہتی کیوں ہو"

وہ ہنستی رہی اور کہنے لگی" اور جب ہی تم نے پُوچھا تھا" اِس پر
وہ کہنے لگا" دُرگا، قسم لے لو جو اِس خیال سے پُوچھا ہو۔ مُجھے
تمھاری فکر رہتی ہے"

وہ رونے لگا۔

"اب رو بھی رہے ہو۔ پہلے ہی آنکھیں خراب ہیں۔ان کے
بھی زخم دُکھیں گے۔ارے شمسُو، جب تک تم زندہ ہو میں کسی کے
پاس نہیں جاتی۔تمھیں جلاتی ہوں"

"یہ جلاتی کیوں ہو؟"

"جانے کیوں۔تُم جلتے نہ ہو"

"میرا کیا ہے۔میری آتما بھی جلتی ہے۔میرا جسم بھی جلتا ہے اور

میں بھی چلتا ہوں۔"

"اب لگے پڑھی لکھی باتیں کرنے۔ یہ ذرا سا تم نے پڑھ جو لیا تھا۔ جب ہی شک شبہ کرتے ہو۔ پڑھے لکھے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے لوگ بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب بانو کو دیکھو۔ کہنے کو سگا بھائی ہے۔ کبھی پوچھتا ہے مجھے؟ سنا ہے کلکتہ میں بڑی نوکری مل گئی ہے۔"

"مل گئی ہوگی۔ تم سے کیا مطلب۔"

"دُرگا، تم گئے سال سے پیچھے کلکتہ گئی تھیں۔ جب میری آنکھیں تھیں۔ سنا ہے وہاں بڑی شان بڑھ گئی ہے۔ تم نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ عبدل کہتا تھا، رات بھی نہیں ہوتی وہاں۔"

"اُونہہ۔ عبدل تو پاگل ہے۔ رات کیوں نہیں ہوتی۔ بڑے آدمیوں کا بڑا شہر ہے۔ بتائی کیا۔ میں تو اپنی نانی پاس رہی تھی۔ ماموں بیمار تھا۔ اسے بھی تو تمھاری جیسی بیماری ہو گئی تھی۔"

"اچھا، تم نے تو مجھے یہ بتایا نہیں تھا۔ پر وہاں تو، عبدل کہتا تھا، اِس بیماری کا بڑا ہسپتال کھل گیا ہے۔ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ اے دُرگا، تم مجھے بھی وہیں بھیج دو۔"

اِس پر دُرگا کہنے لگی: "تم تو پاگل ہو گئے ہو شمسو۔ ہسپتال بھی تو بڑے آدمیوں کا ہے۔ بڑی مشکل سے اُسے داخلہ ملا تھا۔ وہیں وہ مر گیا۔ وہاں کوئی کسی کو پوچھتا ہے۔ بڑی سختی کرتے ہیں غریب

مریضوں پر۔ ذرا سی بات تو تم سے میری برداشت ہوتی نہیں۔ ڈاکٹروں کے دھکّے اور نرسوں کی مار کھاؤ گے؟ پھر داخلہ تمھیں کون دے رہا ہے۔ اِس سے آدمی اپنے گھر اچھا۔"

"اِتنی سختی؟"

"اِس سے بھی زیادہ شمسو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں بتایا میں نے تمھیں۔ میں نے تو خود آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا ماما وہاں مرا تھا۔ ٹھوکروں سے مارتی ہیں نرسیں۔ ماما بڑا یاد کرتا تھا تمھیں۔ کہتا تھا دُرگا، شمسو کا بہت دھیان رکھنا۔ ہسپتال میں نہ ڈالنا۔"

"اچھا، میں تو سمجھا بھوشن مجھ سے خفا تھا۔ بے چارہ بھوشن، دِل کا اچھا تھا۔"

"ارے شمسو، وہ تو اُس وقت کی باتیں تھیں جب تم بھی اچھے تھے اور ماما بھی۔"

"اور نانی کیا کہتی تھی میرے بارے میں؟"

"تمھیں اسی کی فکر رہتی ہے، کون کیا کہتا تھا تمھارے بارے میں۔ ارے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کہنے دو۔ وہ اپنے بیٹے کے غم میں تھی۔"
یہ کہہ کر دُرگا ہنس پڑی۔

"ارے تم ہنستی ہو؟ تمھارا ماما مر گیا۔ تمھیں اپنی نانی کے غم کا ذرا دھیان نہیں۔"

"نہ۔ سب اپنے اپنے غم کا دھیان کرتے ہیں۔ مجھے تمھارا دھیان

ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ نانی نے تو میرا بڑا دھیان کیا تھا نا۔
میری ماں مرگئی تو خود کلکتہ ماما پاس رہنے لگی تھی۔ مجھے یہاں چاچا
کے یہاں رُلنے کو چھوڑ دیا تھا۔ ایسی ہے وہ۔ اور اب اِدھر
مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ جو آتا تھا وہ ہی بتاتا تھا۔"

"میری خاطر نا؟"

"ارے چُپ بھی کرو شمّو۔ ایک تو بیمار ہو اُوپر سے دِل پر بھی
غم لیتے ہو۔ اِتنا بوجھ نہ اُٹھایا کرو۔ اب اُس کا بیٹا مرگیا اِسی
بیماری میں تو چُپ ہُوئی۔ اب اُس کو معلوم ہُوا نا کہ دُکھ کیا ہوتا
ہے۔ کوئی اِتنے بیمار آدمی کو کیسے چھوڑ دے۔ پھر محبت بھی کوئی چیز
ہوئی نا۔ محبت نا بھی ہوتی تو بھی اِتنے دُکھ میں تو نہ چھوڑتی۔ اِتنے
دُکھ میں تو جانور کو بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"مگر دُرگا، میرے دیکھتے دیکھتے یہ بیماری بہت بڑھ گئی۔ یہاں
پُورے بنگال میں بھی کوئی ہسپتال کلکتہ جیسا کُھل جائے تو اچھا ہے۔"

"یہاں کہاں کُھلے گا۔ پھر اس میں بھی وہی ہوگا جو وہاں کے
ہسپتال میں ہوتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہاں نہیں کُھلے گا۔ یہ سراجُ الدّولہ کا بنگال
ہے۔ ساری زمینیں بھی اِنھوں نے لے لیں۔ کسان ننگا ہوگیا۔
انگریز یہاں سے خفا ہے۔"

"یہ سراجُ الدّولہ کون تھا؟"

"اب یہ بھی میں تمھیں بتاؤں؟"

"لکھے پڑھے جو ہو۔ اُوپر تھا؟"

"ہاں دُرگا، اُوپر تھا۔ مگر اِنسان تھا۔ اپنے آدمیوں اور اپنی
زمین سے محبت کرتا تھا۔ کہتے ہیں اُس کے مرنے کے بعد، مُدت
بعد ایک کوڑھی اُس کی دُہائی دیتا مرگیا۔ وہ کوڑھی کہتا تھا کہ سراج الدولہ
اس کے پاس آتا تھا۔ مگر وہ کہتا تھا، مجھ سے فریاد نہ کرو۔ میری رُوح
کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں بے بس ہُوں۔ لوگوں نے اُس کی کُٹیا پاس
ایک سایہ بھی اکثر دیکھا تھا۔"

دُرگا رونے لگی "شمّو، ایسی باتیں مت کیا کرو۔"

پھر وہ چُپ ہوگیا اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا: "دُرگا، یہ لڑکا کس
کی آتی ہے؟ کوئی بڑا ڈاکٹر ہے۔"

دُرگا پریشان ہوگئی اور اُسے لٹانے لگی "اے شمّو، تم لیٹ
جاؤ۔ ایسی باتیں نہ کرو۔"

پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی "نا کوئی لڑکا نا کوئی ڈاکٹر۔ پتا نہیں
اِسے کِس کا انتظار ہے!

پھر وہ کہنے لگی "میں ذرا چاول بین آؤں۔"

"جاؤ۔ جلدی آجانا۔"

"اور یہ بھی کہو آلو پاس نہ جانا۔"

"پھر تم لٹانے لگیں۔"

"میں عبدل کو بھیج دیتی ہوں تمھارے پاس۔"

کیلوں کے پودوں کے تلے تلے، گیلی زمین پر بڑی بڑی خودرو گھانس اور پھسلن سے بچتی وہ عبدل کے باشا پاس جاکر چلائی "اے عبدل، ذرا شمسو پاس بیٹھو۔"

عبدل چٹائی بُن رہا تھا۔ اُس نے کان سے بیڑی نکالی اور مُنہ میں دبا کے شمسو کی طرف چل دیا۔

دُرگا کی تیز سبز ساری میں گرہ لگی تھی اور وہ پنڈلیوں سے اُونچی تھی۔ اُس کے سر پہ بارش پڑنے لگی۔

"باپ رے باپ" ذرا کے ذرا وہ بے خیالی میں آنو کے باشا میں پیچھے سر کی پھر اسے شمسو کی بات کا دھیان آیا اور چونک کے برستی بارش میں آگے بڑھ گئی۔ اسے چاول بھی تو بننا تھے۔

یہ اکبر کا آگرہ تھا، جہاں اُس نے کہا تھا "یہ کھڑکیاں کھول دو۔ اِس طرف سے میرے باغات کی ہوا آتی ہے۔" اور شہنشاہ مر رہا تھا۔ یہ شاہجہاں کا آگرہ تھا جہاں مرمر کے محل میں اس کی محبت دفن تھی اور خود اس کا سنگِ سیاہ کا مقبرہ نامکمل تھا۔ یہ باغات اور تاج محل کا شہر تھا۔ اکبر کے لگوائے ہُوئے باغات اور شاہجہاں کے بنوائے ہُوئے تاج محل کا، جہاں گلاب ہی گلاب مہک رہے تھے خود شاہجہان نے خاص طور سے منگوا کر سیاہ گلاب تاج محل کے باغ میں لگوائے تھے اور اکبر نے دُور دُور سے بہترین آموں کی قلمیں لگوائی تھیں اور آم کے یہ باغات اُس وقت تیار ہُوئے جب شہنشاہ ختم ہو رہا تھا۔ مگر اُسے کوئی ملال نہ تھا۔ وہ اپنے باغات کی طرف سے آتی ہُوئی ہوا کھانا چاہتا تھا، جس میں تازگی اور مہک تھی۔

"تو یہ ہے تاج محل" ایڈورڈ نے اُسے دیکھ کر کہا۔ اُس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ یہ دُنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ وہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سنگِ مرمر کی دیوار کو چھُوا۔ اس نے اپنی ہتھیلی پہ اس کی ٹھنڈ اور نرمی کو محسُوس کیا۔ جُوتیاں اُتار کے وہ قبر

کے پاس گیا۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر اُسے بھی چُھوا۔

"احمد" اُس نے اپنے نوکر سے پُوچھا۔ "وہ مرگئی؟"

"ہاں بابا، مُدّت ہوئی۔"

"میرا مطلب ہے، دونوں میں سے پہلے کون مرا؟"

"وہ، جس کی قبر تُمھارے سامنے ہے۔ ملکہ۔"

"اور وہ زندہ رہا؟" اُس نے پھر تجسُّس کیا۔

"بہت مُدّت تک زندہ رہا۔" احمد نے بتایا۔

"کون کس سے زیادہ محبت کرتا تھا احمد؟"

"دونوں ہی ایک دُوسرے کو بہت چاہتے تھے۔" احمد نے کہا۔

ایڈورڈ سوچتا رہا، پھر کہنے لگا:

"نہیں۔ وہ جو پہلے مری۔ اِس لیے کہ اُس نے اپنے خُدا سے دُعا کی کہ پہلے مُجھے مرنے دے۔ یہ مرگیا تو مُجھے یاد آئے گا۔ اِس کے خُدا نے اُسے بُلا لیا اور اکیلے رہنے سے بچا لیا۔"

احمد اِس بات پر بہت ہنسا اور کہنے لگا: "موت اپنے بس میں تھوڑی ہے بابا۔"

مگر وہ تیرہ سال کا تھا اور اپنے کو بہت بڑا سمجھتا تھا۔ اُس نے حیرت سے اپنے نوکر کو دیکھا اور کہنے لگا: "اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

باہر اُس کا چھوٹا بھائی پیٹر جیبوں میں ہاتھ دیے کھڑا تھا۔ وہ بہت جلدی باہر نکل آیا تھا۔

"گُلاب ہی گُلاب" ایڈورڈ نے کہا اور روشوں پر آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پیٹر نے ناک سُکیڑ کے سوچا "یہ کتنا سُست ہے۔ شام ہو رہی ہے اور اسے گھر جانے کا کوئی خیال نہیں۔"

باہر فقیروں نے اُنھیں گھیر لیا۔ احمد انھیں ہٹا رہا تھا اور پیٹر اُن سے بچ رہا تھا۔ پر وہ آگے بڑھا اور اس نے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہُوئے ایک اپاہج کو آنہ دیا، ایک بار پلٹ کے دیکھا اور آگے بڑھ گیا —

"تُم سے وہی سلوک کیا جائے گا جو تُم دُوسروں سے کرو گے۔"

یہ اُس نے اپنے بھائی سے کہا۔ اُس نے مارنے کو ہاتھ اُٹھایا اور پھر کچھ سوچ کر نیچے کر لیا۔ اور اُس کا گریبان پکڑ کے جھنجھوڑا۔ پیٹر نے احمد کو سُور کہا تھا۔

پھر وہ پیٹر سے کہنے لگا: "آیندہ تم کسی سے بد کلامی نہیں کرو گے۔"

اُس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی جب سے یہاں آیا تھا مغرور اور ناشائستہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے سرزنش کی ضرورت تھی۔ چھوٹے بھائی نے بھوری بھوری آنکھیں کھول کر اُسے حیرت سے دیکھا جو اُس سے پہلے اتنی دُرشتی سے اُس سے پیش نہ آیا تھا۔ وہ چُپ کا رہا اور اُس کا بڑا بھائی دوبارہ گھوڑے پر چڑھ گیا۔

یہ غروبِ آفتاب کا منظر تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر بیٹھے تھے۔
ان کی پُشت پر آموں کے جُھنڈ تھے اور پھیلتا ہُوا نرم اندھیرا۔
[illegible] بھروں پر ڈُوبتے سُورج کی سُرخ روشنی تھی۔ دونوں گھوڑے برابر
کھڑے تھے اور یکے بعد دیگرے پچھلے پاؤں بُھربُھری زمین پر مارتے
تھے۔ وہ اپنی تھکن اُتار رہے تھے۔ وہ بہت دَوڑائے گئے تھے
اور اُن پر اب بھی بوجھ تھا۔ مگر ان کے سر نیچے نہ ہُوئے تھے کیونکہ
ان کے سوار ان کی پُشتوں پر تھے۔ اور شاید یہ گھڑسواری کے
آداب کے خلاف ہو کہ سوار کی پُشت پہ موجُودگی میں گھوڑا اپنی
گردن جُھکا لے۔ گھوڑے آداب سے واقف تھے۔

[illegible] ڈیوڈ اپنے بھائی سے نسبتاً لمبا اور دُبلا تھا۔ اُس نے
پلٹ کر اپنے نوکر سے کہا "تم میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ تُم تھک گئے
ہو گے" [illegible]
[illegible]
[illegible] احمد نے پگڑی ٹھیک کی اور اُس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اُس کا
[illegible] اپنے بھائی سے اُونچا تھا اور اس پہ ابھی دُھوپ تھی۔ سُورج
[illegible] جاتے جاتے [illegible] دیکھا [illegible] پھول اُس
[illegible] بکھیر دیئے۔ [illegible] بال شفق میں سُرخ لگ رہے تھے
[illegible] اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پیچھے اندھیرے
کو چھوڑ کر گھر کی طرف چل دیا۔

گھوڑوں پہ گرد تھی۔ احمد کے ماتھے پہ گرد اور خود اُن پہ

گرد تھی مگر گھوڑوں کی ایال کے بال گرد کے باوجود کہیں کہیں سے
چمک رہے تھے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی گردن پہ تھپکی دی اور
بولا "مجھے معلوم ہے تم تھک گئے ہو۔"

سُرخ کھپریل کا یہ گھر اندھیرے کے باوجود اُجالے میں تھا۔ اندر
باہر بتیاں جل رہی تھیں۔ نوکر مُؤدّب پھر رہے تھے۔ یہ گھر وکٹورین
طرز کے سامان سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر سدرلینڈ اور مورز
کے خاکے تھے۔ یہاں سکُون اور قدرے سادگی تھی۔ لارڈ ہمفری
دَدرے پر تھے۔ وہ گھوڑے پر سے اُترا اُس کی راسیں تھامیں اور
اصطبل کی طرف لے آیا۔ چھوٹے بھائی نے اپنا گھوڑا نوکر کے سپرد کیا
اور برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے پھُرتی سے اندر چلا گیا۔

قُدرت کی تلاطُم خیزی میں ایک لمحہ چین نہ تھا۔ بارشیں ذرا کی ذرا
تھمتی تھیں اور یہ بارشیں سُندربن، رام گڑھ اور کرنافلی کے جنگلات
کو خوفناک حد تک گھنا تر کرتی جاتی تھیں۔ یہ پھیلتی جاتی تھیں۔ اِن
کے پھیلاؤ کا کوئی حساب نہ تھا۔ ان جنگلوں میں مضبُوط اور بھاری
جسم کے ہاتھی پھرتے تھے۔ یہ ہاتھی بے حد تنومند تھے اور جب
چاہتے مضبُوط سے مضبُوط درخت جھر جھر اُکھاڑ پھینکتے۔ لیکن نیچے
انسان بہت بیمار تھا۔

یہاں اُدھر نیچے تمام منظر بہت خوبصُورت تھا۔ نیچے پانی اور

اور اُوپر سبزہ تھا اور بڑی فراوانی سے تھا۔ لیکن یہاں کسی کو اتنی فرصت نہ تھی جو اسے سراہتا اور محسوس کرتا۔ باہر لوگ بنگال بنگال چلاتے تھے اور اس کے مناظر، رنگوں اور الفاظ میں محفوظ کرتے تھے۔ لیکن یہاں اندر ہی اندر کوڑھ کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی تھیں۔ اس کے لیے رنگ اور الفاظ پھیکے اور بے کار تھے۔

بنگال باہر والوں کے لیے بانسری مدھر تان اور دھان کے لہلہاتے دھانی رنگ کے کھیتوں کا خطہ تھا۔ مگر یہ دھان بڑی مشقت سے اُگتے تھے۔ کسانوں کے پاؤں ان میں سڑتے تھے اور یہ مدھر تان زخم خوردہ دُکھتے ہوئے کلیجے سے نکلتی تھی اور اُوپر آکر ہُوک بن جاتی تھی۔

اس خوبصورت منظر میں گھرے ہوئے دُرگا نے چاول بینتے بینتے دو مُٹھی چاول اُٹھا لیے اور جب اُس سے اِستفسار کیا گیا تو اُس نے کہا: "وہ موٹے چاول نہیں کھا سکتا۔ وہ اپنی ماں کا لاڈلا تھا۔ اُس کی ماں اس کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتی تھی۔"

"کیوں وہ کہیں کا راجا ہے؟"

دُرگا نے رنج سے اُس کی طرف دیکھا اور توقّف کیا۔ خُون کا گھونٹ پی کر وہ کہنے لگی: "ہاں، میرے دِل کا۔ وہ بیمار ہے۔ اس کے جبڑے موٹے چاول کھانے سے دُکھتے ہیں اور اُن کی باس سے

اس کا جی بُرا ہوتا ہے۔"

"اچھا اور اپنے کوڑھ سے اور اس کے زخموں کی باس سے اُس کا جی بُرا نہیں ہوتا؟ اس کوڑھی کا دماغ راجاؤں کا سا ہے۔"

درگا نے کہا "ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔ وہ کوڑھ لے کر پیدا نہیں ہُوا تھا۔ چند سال پیچھے، تمھیں خوب پتا ہے، وہ تندرُست تھا اور اِنھی کھیتوں میں کام کرتا تھا جہاں اب میں کام کر رہی ہوں۔"

خُوب جھک جھک رہی۔ دُرگا نے اپنی بائیں اُنگلی کا چھلّا اُتار کے اس کی ساری کے پلّو میں ڈال دیا اور کچھ اَور چاول اپنے پلّے میں ڈال لیے۔ پر وہ مُطمئن نہ ہوئی، اور چاندی کے باریک مَیلے چھلّے کو دیر تک اُلٹتی پلٹتی رہی مگر دُرگا دُور جا چکی تھی۔

عبدل کی بیڑی خاتمے پر تھی اور وہ اپنی باشا کی طرف جانے کی سوچ رہا تھا۔ پر یہ شمسُو اکیلا تھا اور اکیلے میں جانے کیسی کیسی باتیں کرتا تھا۔ تب بھی وہ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ آئے گا، ایک دِن ضرور آئے گا۔ اِدھر بُوڑھی گنگا کے کنارے اس کا نوکا ٹھہرے گا۔ میری تو کوئی بات نہیں، پر یہ راجو بچارے کے بچّے کو بھی ہو گئی، ہا، یہ بُرا ہُوا۔ ڈاکٹری علاج کیا جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

عبدل نے ایسے ہی پُوچھا "کون آئے گا شمسُو؟"

"وہی ہمارے تمھارے زخموں کا چارہ گر۔ بڑا ڈاکٹر۔ یہ زخم دُکھتے ہیں نا۔"

عبدل نے ہنس کر پوچھا: "شمسو کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔ تم ہی کچھ کہہ رہے تھے۔"

تب وہ داخل ہوئی۔ "کیا یہ درگا آئی ہے؟"

"ہاں یہ میں ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ہوتا کیا؟"

عبدل اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تو چلوں شمسو۔ میری چٹائی کل کی یونہی پڑی ہے۔"

درگا نے بڑی احتیاط سے چاول دھوئے۔ ایک دانہ گرنے نہیں دیا۔ پھر ہانڈی اندر ہی چولھے پہ چڑھادی۔ اِس کے بعد باہر کٹھل توڑنے چلی گئی۔ کٹھل اُس نے اکیلے ہی باہر بیٹھ کے بنایا حالانکہ اتنا بڑا تھا۔

نرم پیلے پیلے کٹھل کی خوشبو اُس کی ناک میں گئی اور وہیں سے کہنے لگا: "بڑا پکا کٹھل توڑ لیا درگا۔"

وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ اندر آکے اس نے اُبلے ہوئے چاولوں کی ہانڈی اُتاری اور تھوڑے سے چاول ٹھنڈے ہونے کو تھالی میں نکال کر رکھ دیے۔

وہ کہنے لگا: "ان چاولوں کی باس کٹھل کی طرح میٹھی ہے۔ یہ اچھے چاول تمھیں کہاں سے مل گئے؟ یہ تو باہر بکتے ہیں۔"

وہ کہنے لگی: "یہ بھات۔ یہ مجھے آنو نے دیے ہیں۔ تمھارے لیے۔ لو یہ نوالہ اِدھر ہے۔"

"میں نہیں کھاؤں گا۔ تم کھاؤ۔ مجھے بھوک نہیں۔ مجھے کٹھل دے دو۔"

وہ ہنسنے لگی: "ارے شمسو! آنو تو کومیلا گیا ہے۔ وہ یہاں کہاں بس جل گئے؟ لو منہ کھولو۔"

لیکن عجیب بات تھی۔ یہاں چاروں طرف اتنی خوبصورتی تھی۔ اچھے اچھے بھات تھے۔ نرم میٹھا میٹھا کٹھل تھا۔ اور بقول کسے بانسری کی مدھر تانیں تھیں۔ پھر بھی اُسے تسکین نہیں ہوئی۔ اُس کا احساس ہی ختم ہوگیا تھا۔

درگا نے کہا "اے شمسو، میں ذرا پانی بھر لاؤں۔"

"ہاں جاؤ۔"

آج اُس نے یہ نہیں کہا کہ جلدی آنا۔ درگا باہر نکلی تو پاس کا پوکھر چھچھلا ہو رہا تھا۔ نہری کیچڑ پانی میں آتی۔ اس لیے وہ ذرا آگے بڑھ گئی۔ یہاں سکینہ بی بی پانی بھر رہی تھی۔

"کے سکینہ، سب خیریت؟" وہ باتیں کرنے لگی۔

شمسو کی زبان سُن تھی۔ آج مرنے کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا۔

اُس نے تمام قوت اکٹھا کی۔ "کوئی فائدہ نہیں ایسی زندگی کا۔

بس شمسُو اب ختم ہو۔" وہ اور کھسکا اور غڑاپ سے پانی میں کُود گیا۔
" اے سکینہ، بڑی دیر کروادی۔ وہ میری راہ دیکھتا ہوگا۔"
چلتے چلتے اُسے خیال آیا اور وہ ہنس پڑی۔ وہ سوچ رہا ہوگا، میں آنو پاس بیٹھی گپ شپ کر رہی ہوں۔ شاید وہ کو میلا سے لوٹ آیا ہو۔ اُس کے پیر بھاری تھے ورنہ وہ اُسے رستے میں ڈُبکی کھاتا مل جاتا۔ پھر پانی کا ایک ریلا آیا اور اُسے بہا لے گیا۔ وہ بہتا رہا۔ بہتے ہوئے بھی اسے انتظار تھا کہ کوئی اُسے بچا لے گا۔

وہ دونوں یہاں نینی تال کے بورڈنگ سکول میں تھے اور سر روڈرک سمتھ ان کے گارجین تھے۔ وہ ایک ہفتہ چھوڑ کے، ہفتہ اتوار، اُن کے یہاں گزارتے تھے۔ احمد اور گھوڑے بھی انھیں کے یہاں تھے۔ لارڈ ہمفری بچّوں کی خاطر ان کا خرچا بھیجا کرتے تھے۔
پیٹر یہاں بہت لیے دِیے رہتا تھا۔ اسے اپنے باپ کے عُہدے اور اپنے خاندان کا بہت خیال تھا۔ وہ عام انگریز لڑکوں سے بھی کم ہی ملتا جُلتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں اُس کی دوستی ریاست کے راجکماروں اور جاگیرداروں سے تھی۔
لیکن یہ ایڈورڈ تھا جس کی دوستی سر موریس کے بیٹے براؤن کے علاوہ علی سے بھی تھی۔ علی کا گھر بھی لکھنؤ میں تھا۔ وہ معمولی زمیندار تھے۔ اُس کے ایک چچا زمینوں پر رہتے، دُوسرے وہیں بیرسٹری کرتے تھے۔ علی کے ماں باپ نہ تھے۔ وہ اپنی دادی امّاں کے پاس رہتا تھا۔
آج اتوار تھی اور وہ دونوں سر روڈرک سمتھ کے یہاں تھے۔ ایڈورڈ اپنے ساتھ علی کو بھی لایا تھا۔ وہ سب گرجا گئے تھے۔

لیکن اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ "علی اکیلا رہ جائے گا"۔ پیٹر
نے اسے الگ لیجا کر بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ پیٹر ان کے سامنے
بہت شرمندہ ہُوا۔ اُوپر سے وہ علی کو لے کر گھوڑوں پر نکل گیا
اور اتنی دیر سے آیا کہ بورڈنگ کے وقت سے پُورے دس منٹ
دیر ہوگئی تھی۔ پیٹر خوفزدہ تھا۔ سر روڈرک سمتھ کو اتنا ہوش نہ تھا
کہ وہ اُسے ٹوکتے۔ انھیں شراب، سیر و شکار، کلب اور خوش گپیوں
سے فُرصت نہ تھی۔

اُن کی بیوی جوان تھیں۔ وہ اپنے آپ میں مصرُوف رہتیں۔ اس
لیے پیٹر کو اپنے بھائی کی شکایت برادر ایمرک سے کرنا پڑی اور یہ
کہ وہ آج گرجا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ اُسے سمجھائیں۔

نوعُمر فرانسیسی برادر ایمرک پیٹر کی اِس قدر سنجیدگی سے بھائی کی
شکایت کرنے پہ مُسکرایا۔ اور کہنے لگا "کیا تم کو معلوم ہے کہ
سینٹ گریگری بھی اوّلین ایام میں اپنے بھائی کا نقاد رہا تھا۔ کُچھ
نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بھی اگنیٹس کی طرح کسی سخت کوش سفر پہ
روانہ ہوجائے۔ یاد رکھنا، زندگی کی ہر منزل ایک سفر ہے اور
شاید وہ اِس کا ذکر بھی نہ کرے جیسے اگنیٹس نے اپنے سخت کوش
سفر کے مُتعلق رومن کرسچین کو لکھا تھا۔ بعض وقت بظاہر ایک بڑے
درویش کے اندر ایک ریاکار چھپا ہوتا ہے اور اکثر بظاہر ایک
بے پروا انسان میں، جو کچھ بھی نہیں ہوتا، ایک درویش بیٹھا ہوتا ہے۔

میں دیکھتا ہوں تم اُس کی طرف سے بہت مُتفکر رہتے ہو اور اُسے
غلط کار سمجھتے ہو۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو۔ تمھیں معلوم
ہے وہ سائنس اور حساب میں بہت اچھا ہے۔ تم اتنے اچھے نہیں
ہو۔ تم ان دونوں مضامین میں محنت کیا کرو۔ تمھیں اِس کی فکر کی ضرورت
نہیں۔ میں تمھیں اِس لیے بتا رہا ہوں کہ تم اِنسان کو آیندہ زندگی
میں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ورنہ ٹُکڑ کے رہ جاؤ گے۔ جاؤ اپنا کام
کرو اور آیندہ دیر نہ کرنا۔"

اسے بڑی کوفت ہوئی۔ فضول کی خفت اُٹھانی پڑی۔ وہ برادر
کی بات خاک بھی نہ سمجھا۔ برادر کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بھائی پادریوں
کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کی نقلیں کرتا ہے۔

پیٹر کے جانے کے بعد برادر ایمرک اپنی جائے رہائش کی طرف
بڑھا۔ راہ میں اُسے ایڈورڈ ملا۔ برادر نے اُس سے کہا۔ "آیندہ مجھے
امید ہے کہ تم بورڈنگ کے اوقات کا خاص خیال رکھو گے۔ ضبط
و نظم کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ضبط و نظم اُلجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے
اور زندگی میں ہر قدم پر اُلجھن اور دُشواری ہے۔"

ایڈورڈ نے سر جھکا لیا اور آیندہ احتیاط کا وعدہ کیا۔

پھر برادر نے کہا: "میری طرف دیکھو خُدا حافظ۔"

اپنے کمرے میں آکے برادر نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ
سے کہا۔ "اس ایڈورڈ کی آنکھوں کا یہ تھوڑا سا دُکھ، یہ ذرا سا گمتی

کا وعدہ، کاش مجھے مِل جاتا ::

خلا اور بے چینی کا احساس اُس میں بڑھ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کیں۔ وہ لیٹ گیا۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو چپکے چپکے اُس کی سانس میں شامل ہوتی رہی۔ پاس ہی آلٹر پر شمع خاموشی سے جلتی رہی اور وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔

اُنھوں نے کھڑکی کے پردے سرکائے اور باہر کا منظر دیکھ کے بشاش ہُوئے حالانکہ اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جذباتی ہو رہے تھے۔ انھیں اپنے بچّوں کا خیال آ رہا تھا۔ لندن سے آتے ہُوئے ہفتہ وار اخبار پر ایک نظر اُنھوں نے اور ڈالی۔ یہ سُرخی اُن کے ذہن میں جم کے رہ گئی "ہندوستان نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ کیونکہ اُنھیں آزادی نہیں مل رہی ہے۔ انگلستان میں بے کاری بڑھ گئی ہے۔"

اُنھوں نے رنج سے سوچا "اِس لیے کہ یہ اُنیس سو بتّیس کا ہندوستان ہے جو وکٹوریہ کے ہندوستان سے قطعی مُختلف ہے۔ اور اس پر ہماری گرفت ڈھیلی ہو چکی ہے۔ طرح طرح کے مُطالبے ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔ انگلستان میں بے کاری بڑھ گئی۔ میرا ماضی اور میرے بچّوں کا مُستقبل غیر محفوظ ہے۔"

پھر وہ ٹہلنے لگے اور کھڑکیوں کے پردے دوبارہ کھینچ دیے

گئے۔ وہ اپنے ماضی میں تھے۔

یہاں جنگلوں پر برف کے گالے گر رہے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے استوپا پر مُقدّس اور پُر اسرار خاموشی طاری تھی۔ یہاں اُداسی اور خوشی دونوں کا تاثّر تھا۔ یہ منظر اُسے انوکھا لگا۔ نیچے جاتے جاتے اُس نے ایک بار مُڑ کے آخری بار برف کے گالوں کو بِکھرتے دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے:

"اب وہ پیدا ہوگا جو کوڑھیوں کو شفا اور اندھوں کو بینائی عطا کرتا تھا۔ بیتُ اللّحم میں جس کی پیدائش کا ستارہ دیکھا گیا تھا۔ وہ پیدا ہوگا جو چارہ گر تھا۔"

اور اب وہ سمجھا کہ وہ چارہ گر تھا۔

دونوں وقت ملتے تھے اور گھروں میں بہو بیٹیوں نے سر ڈھک لیے تھے۔ اِس گھر کی بھی بیوی اور چھوٹی لڑکی نے اپنے سروں کو ڈھانپ لیا تھا۔ مگر اس لڑکی کو جو بڑی تھی، ایسا کچھ خیال نہ تھا۔ وہ اپنی جھمکتی ہوئی چوڑیاں اُتارنے کی کوشش میں تھی۔ اُس نے سوچا "یہ بہت جھمکتی اور جھنکتی ہیں" حالانکہ مُدّت سے وہ شوق سے انھیں پہنتی رہی تھی۔

"زہرہ" اسے کسی نے پکارا۔ مگر اس نے اس آواز پہ بالکل کوئی توجہ نہ دی کیونکہ وہ اب فاختہ کے اُس بچّے کو دانہ بھرا رہی تھی جو اُس نے حال ہی میں پالا تھا۔

اِس گھر کی بیوی بہت کفایت شعار، خاموش طبع اور باسلیقہ تھیں۔ اس کے بابا یعنی وکیل صاحب ابھی ابھی کہیں برج کھیلنے گئے تھے اور اب تک نہ پلٹے تھے۔ چھوٹی لڑکی نے نماز کی نیّت باندھ لی تھی۔ گھر کی بیوی سجدے میں تھیں۔ مگر اُن کا جی اُچاٹ تھا۔ اُن کا دھیان اس وقت اُن دو خطوں کی طرف تھا جن میں سے ایک وکیل صاحب کو اُن کی چھوٹی بیوہ بھاوج نے بھیجا تھا۔

دُوسرا ان کے بڑے بھائی کا انبالے سے آیا تھا۔ اُن کا دلّی سے تبادلہ ہوگیا تھا اور اب وہ انبالہ چھاؤنی میں آگئے تھے۔ اُن کے کپتان سے میجر ہونے کے امکانات بہت تاریک تھے۔ پانچ بچّوں کے باپ تھے اس لیے اُنھوں نے جائداد کا کچھ مُطالبہ کیا تھا۔ بیوی بیگم جز بز تھیں اور برآمدے کے تخت پر حیران بیٹھی تھیں۔

ایک ٹک اس نے اپنے کمرے سے نکل کر ماں کی طرف جھانکا اور اُس کے راجپوتی خُون نے کچھ دُھوم دھام مچانی چاہی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنی ماں سے کہے کہ "لعنت بھیجو اِس جائداد پہ" پھر وہ غم کھا گئی اور اپنے سوتیلے ماموں زاد بھائی کے کمرے کی طرف چل دی جو ان کے یہاں پڑھائی کے سلسلے میں رہتا تھا۔ اُس نے آواز دی "علی اکبر بھائی"

"یہاں آجاؤ" علی اکبر بھائی کا بستر ملگجا تھا اور ان کا گریبان چاک تھا۔ وہ بیڑی پی رہے تھے۔

"یہ نوبت آگئی" لڑکی نے پُوچھا۔

"کیا کریں۔ پیسے ختم ہوگئے"

اِس پہ وہ کہنے لگی: "تو ہمیں بھی ایک کش لگواؤ"

"یہ لو" علی اکبر بھائی نے بڑی سخاوت سے بیڑی پیش کر دی۔

وہ کہنے لگی "پیسے لاؤں؟"

"لاؤ"

اُس کی ماں اِس وقت گودام میں تھیں۔ وہ بڑی پھُرتی سے گئی، پاندان کھول کر چھالیا کی ڈبیا اُٹھائی ایک روپیہ نکال لے گئی۔

"یہ لو" اُس نے لڑکے سے کہا۔

لڑکے نے نظریں میر کے دیوان سے اُٹھائے بغیر بیڑی کا ایک گہرا کش لیا اور روپیہ مُٹھی میں دبالیا۔ پھر وہ کہنے لگا:

"آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ شعر سُناؤں؟"

"نہ۔ اس وقت مُوڈ نہیں ہے۔" اُس نے کہا۔

لڑکے نے ایک ٹک اسے دیکھا اور کہا "اچھا" کتاب اُس نے پرے رکھ دی۔ دُھواں اُس کے مُنہ پر چھوڑا اور دُھویں کے بادل میں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کھڑکی کے باہر چھوٹے سے باغیچے میں مالی کو کام کرتے دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ کہنے لگا "آج کل تم میری کچھ خدمت نہیں کر رہی ہو۔"

"اور یہ کیا ابھی کیا تھا؟" وہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر کچھ سر دباؤ۔ کچھ میرا کمرہ ٹھیک کرو" لڑکے نے ٹھہر ٹھہر کے کہا اور مزید غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کے ایک لحظہ کو اُس کی طرف دیکھا اور جلدی سے اس کے پلنگ کے پاس رکھی الماری کو دیکھنے لگی۔

"تم بھی کمال کرتے ہو علی اکبر بھائی۔ نواب واجد علی شاہ کے تُمھیں تو جانشین ہو۔ بابر بہ عیش کوش" اُس کے اِس طرح دیکھنے پہ

وہ بہت مسرور ہوئی۔ وہ پندرہ سال کی تھی اور بڑی ہُشیار تھی۔

"وہ بہت خوش ہُوا اور کہنے لگا: "اس میں کیا شک ہے۔ جو مزہ بیٹھیا چین اور آرام میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ اور یہ تم چلیں کہاں؟"

"تو چھٹی کا دِن تمھارے کمرے میں بیٹھ کے بتا دُوں؟ مجھے بڑا کام ہے۔"

اُس کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگا، عجب بے چین رُوح ہے۔

یہ مہاتما بُدھ کے پیروؤں کی خانقاہ تھی۔ بڑے بڑے درختوں سے گھری ہُوئی۔ اس کے نیچے کرنافلی کا دریا بہتا تھا اور یہ اس سے کافی اُونچے پر تھی۔

اُن کے سر مُنڈے ہُوئے تھے اور وہ نارنجی رنگ کی ایک بے سِلی دھوتی پہنے اور اوڑھے تھے۔ وہ دُبلا پتلا اور صاف رنگت کا تھا۔ اُس کا منہ لمبا تھا اور آنکھیں سیاہ۔ اُس نے کھونٹی دار کھڑاویں ایک طرف رکھیں اور کھانے بیٹھ گیا۔ پر اُس کا جی کھانے میں نہ لگا۔ وہ کسی راجا کا بیٹا نہ تھا جو گھر بار اُسے یاد آتا۔ وہ اپنی خوشی سے یہاں آیا تھا۔ اُس کا گھر نزدیک ہی تھا بلکہ خانقاہ کے سِرے پر سے دکھلائی پڑتا تھا۔

اُس کی ماں کھڈی پر کپڑا بُن رہی تھی۔ اس کا باپ سُست تھا۔ عام چکمہ قبیلوں کے مردوں کی طرح۔ وہ کہیں بیٹھا بانس کے ٹونگنے

میں ذرا سی چلم لگائے پی رہا ہوگا۔ وہ کبھی کبھی اپنے گھر بھی ہو آتا تھا۔

اِس خانقاہ میں بڑا سکوُن تھا اور اس کے طالب علم بڑے قانع تھے۔ وہ خود بھی قانع ہی تھا۔ اُسے کسی سے محبت نہیں تھی۔ کوئی فکر نہیں تھی۔ مگر اُسے اور طالب علموں کی نسبت قناعت کا اِحساس کم تھا۔ آج کا درس بھی اس نے یُونہی سا سُنا اور سمجھا۔"

پتا نہیں مہاتما بُدھ نے نروان کیسے لے لیا! جب تک اِنسان کے ساتھ فکر ہے، اس کا مِلنا مشکل ہے اور جب یہ ملتا ہی نہیں تو بُدھ کے درس و تدریس کا کیا فائدہ؟" اُس نے سوچا اور تھالی میں پڑے ہُوئے کھانے سے کھیلنے لگا۔

فضا میں گندہ راج (میگنولیا) کی مہک تھی۔ نیچے پہاڑی پر سے اُودے پھُولوں کی بیلیں پانی پر لٹک رہی تھیں۔

"معلوم نہیں وہ بھکارن کہاں گئی جو روز آتی تھی اور میں اُسے اپنے کھانے میں سے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا تھا۔"

ایک بار اس نے کھانے کی طرف اور دیکھا اور تھالی آگے سرکا دی۔

"پتا نہیں کتنے جی بھُوکے ہیں۔ کہتے ہیں نیچے سارا چاول باہر چلا گیا۔ ایسے میں کھانا اچھّا نہیں لگتا۔ ایسے میں نروان بھی نہیں مِلتا۔" اُس نے باہر نظر دوڑائی۔ اسے بھُوک نہیں تھی۔ اگر وہ

آجائے تو وہ یہ سارا کھانا اُسی کو دے دے۔

"معلوم نہیں مُسلمان تھی کہ ہندُو۔ کہیں امن نہیں۔" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کھانا ویسے ہی دھرا رہا اور وہ کھڑاویں پہنے پہنے ڈاب کاٹنے ناریل کے جھُنڈوں کی طرف چل دیا۔

وہ بھکارن نیچے اُترتی چلی گئی۔ خالی اُس کا پیٹ ہوتا تو وہ اس بُڈھی کے دِیے پر قناعت کرتی۔ اُس کے اندر ایک اور جی تھا جو مُنہ کھولنے ہی والا تھا۔ پھر نیچے اُس کی ماں بیمار تھی۔ اُس کی ماں سے کبھی ڈھنگ سے بھیک نہیں مانگی گئی۔ اس چکّر سے نکلنے کے لیے اُس نے کئی شادیاں کیں مگر اس سے بھی کام نہ چلا۔

سلمہ کا باپ اینٹ سر پر گرنے سے مرا تھا۔ دو خاوند اس کی ماں سے عمُر میں بہت چھوٹے تھے۔ وہ اسے چھوڑ کے آگے کھانے کمانے چلے گئے تھے اور یہ آخری اُسے کوڑھ دے کر چل دیا تھا۔

سلمہ کا میاں خُود اُسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ یہاں ماں مُعطّل سی بیٹھی تھی۔ چنانچہ سلمہ اپنا اپنی ماں اور اندر کے جی کا پیٹ پال رہی تھی اور ماں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اُس کی ماں اب چلنے پھرنے سے مجبُور تھی۔ یہ جی اب آنے والا ہُوا تو خود سلمہ بیمار ہو گئی۔ پھر بھی وہ ماں سے بہتر تھی۔

برجُو نے اسے لال اُبلے ہُوئے بھات لا کر دِیے تو سوچنے لگا:

"یہ کوڑھ بھی عجب بیماری ہے۔ ایک وقت پر آکے یہ سب یُونہی مُنہ

اُٹھا کے اِنتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت جب اس کا کوئی علاج ہی نہیں ہوتا۔ آنکھیں جاتے اور ہونٹوں پر زخم آنے کے بعد انھیں انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے سیڑھی لگا کے کوئی آسمان سے اُترے گا انھیں اچھا کرنے۔"

برجو ڈھاکہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا کہ آنکھیں جانے اور ہونٹوں پر زخم ہونے کے بعد کوئی نہیں بچتا۔ "پیچھے کے گاؤں میں۔ عبدل کہتا تھا کہ ایسے ہی شمشو کو انتظار رہنے لگا تھا۔ میرے خیال میں اِن کا دماغ بھی خراب ہونے لگتا ہے۔"

برجو نے بڑھیا کی بے نُور آنکھوں کو دیکھا اور کہنے لگا: "ماں گو، بھات کھاؤ۔ کیا سوچتی ہو۔ بولو نا؟"

دراصل ماں گو کے دماغ پر کوڑھ کی اذیت سے زیادہ سلمہ کے کوڑھی ہونے اور اس کے بچے کی اذیت تھی۔ وہ یونہی مُنہ اُونچا کیے کہنے لگی: "سلمہ کا کیا بنے گا۔ سلمہ بھالو نا۔ تُمی بولو۔"

برجو کیا بولتا۔ وہ اُسے بھات ہی دے دیتا تھا۔ یہی بہت کرتا تھا۔ اس نے بیڑی کا کش لیا، اپنے کالے کالے چکنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا "کیا بولے گا ماں گو"

اور ماں گو سوچتی رہی کہ اسے نہیں تو سلمہ کو کوئی آ کر شاید بچا لے وہ اِسی انتظار میں ندی کی طرف مُنہ اُٹھائے بیٹھی رہی۔ وہ سلمہ سے بھی یہی کہتی رہتی۔ حتیٰ کہ سلمہ کو بھی یہی خبط ہو گیا۔

رات بُخار میں سلمہ کے درد ہُوئے۔ پھر رُک گئے۔ صبح ہوتے مُلّا نے آم کے جُھنڈوں میں گھری، اُونچے ٹیلے پر بنی ہُوئی ایک منار کی کچّی مسجد میں بڑے کڑک کے اذان دی جو جُھنڈوں اور بادلوں میں گُم ہو گئی۔

سلمہ کی ماں کو نماز آتی تھی مگر جب سے اُسے کوڑھ لگا تھا اُسے یہ خیال رہنے لگا تھا کہ یہ گندی بیماری ہے اِس میں نماز نہیں پڑھنا چاہیے۔ پر اِس وقت وہ سجدے میں گر گئی اور سلمہ کی صحت کی دُعا کرنے لگی۔ "او خُدا، ہمارا لڑکی بچا لے۔ سلمہ کو اچھا کر دے۔ یہ کوڑھ اِسے ہم نے دیا۔"

سلمہ کو نماز نہیں آتی تھی۔ وہ یُونہی گٹھڑی مارے پڑے رہی۔ وہ دُعا نہیں مانگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کوئی آ کے اس کو نہیں اُس کے بچے کو لے جائے۔ اُسے اِس کے پاس سے ہٹا لے اور اُسے اِس کی بیماری نہ لگے۔ برجُو ہی لے جائے پر برجُو ایسے چکروں میں پڑنے والا نہ تھا۔ وہ بے شادی شُدہ تھا اور ایسے جھمیلوں سے بہت گھبراتا تھا۔ اگر برجُو سے کوئی مذاق میں بھی کہہ دیتا تو وہ کہتا "ارے باپ رے باپ۔"

"اور اگر بچے کو بھی کوڑھ ہُوا۔ بھلا بیمار ماں تندرست بچہ پیدا کر سکتی ہے!" سلمہ نے سوچا۔ تب تو اسے کسی ڈاکٹر کو لے جانا چاہیے۔ ڈاکٹر کے تصوّر پہ اُسے بنگاؤں کا وہ کوٹ پتلون پہنے ڈاکٹر یاد آیا،

جس سے اُس نے کرنافلی جاتے ہوئے ملیریا بخار کی دوا لی تھی - وہ خیالوں میں کھوئی رہی اور بچہ پیدا ہوتا رہا - کوئی آرہا ہے، آہستہ آہستہ پگاؤں کا ڈاکٹر اُس کی طرف بڑھ رہا ہے - بچہ اُس کے پہلو میں پڑا تھا - برجو کی ماسی جا چکی تھی -

سارا دن بیت گیا " سلمہ نے گردن ہلا کے کہا - آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھ رہا تھا - اُس کے ساتھ ہی سلمہ کا بخار بھی بڑھ رہا تھا - چٹگاؤں کا ڈاکٹر اندر آرہا تھا - وہ آگیا تھا - پھر وہ جُھکا کوٹ پتلون پہنے یہ ڈاکٹر ہی تو تھا مگر جب وہ جُھکا تھا تو وہ کسی اور چیز میں بدل گیا تھا - یہ کوئی اجنبی تھا مگر وہ خوفزدہ نہیں ہوئی - کالی پتلون، کالے چھوٹے چوخانے کا کوٹ - گورا بہت گورا - نیلی آنکھیں - اُس نے آہستہ سے بچے کو اُٹھا لیا - سلمہ بچے کی اذیت میں مرگئی - ماں گو پھر سجدے سے نہیں اُٹھی - مگر بچہ زندہ اور تندرست تھا -

" وہ لے گیا " آخری سسکی میں سلمہ نے کہا تھا -

جاڑے کی لمبی تعطیلات ختم ہو چکی تھیں - یہاں پہاڑوں پر پھر بہار تھی - جھرنے پھوٹ پڑے تھے - نیچے کھڈوں میں دیودار کے خشک تنکے بھرے پڑے تھے - ان پہ بآسانی پھسلا جا سکتا تھا - اس کے علاوہ وادیاں رنگ برنگی چڑیوں سے بھری ہوئی تھیں اور طرح طرح کے پرتبع ہو سکتے تھے - مگر ابھی وہ پچھلے ہفتے ہی گئے تھے - اِس

ہفتے وہ جا نہیں سکتے تھے - اور اِس سے اگلے ہفتے میں کئی دن تھے - باہر کا منظر دل آویز تھا مگر وہ یہاں مُطالعہ کے کمرے میں بند تھا اور یہ خاص مُطالعے کا گھنٹا کہلاتا تھا - اِس سکول کے قاعدے قانون سخت تھے' اس نے محسوس کیا - اسے بہت کوفت ہو رہی تھی - شیشوں میں سے ایک بار باہر اس نے اور نظر دوڑائی اور بے چین ہو گیا - پھر اس نے اپنی توجہ سائنس کی کتاب کی طرف مبذول کی -

" آکسیجن بنانے کا طریقہ :- پوٹاشیم کلوریٹ اور مینگنیز ڈائی آکسائڈ کے آمیزہ کو گرم کر کے بنائی جاتی ہے "

اس نے کاپی پر فارمولا لکھا اور گہری سی سانس لے کر محسوس کیا کہ اس کمرے میں اِس وقت آکسیجن کی بہت کمی ہے - تجربے کے بعد وہ آکسیجن کی دریافت پر آیا - کارل شیلے نے سترہ سو بہتر میں آکسیجن دریافت کی - اُس کے دو سال بعد سترہ سو چوہتر میں ایک انگریز پادری جوزف پریسٹلے نے آتشی شیشے کی مدد سے مرکری آکسائڈ کو سُورج کی شعاعوں سے گرم کر کے آکسیجن حاصل کی - وہ جھلا اُٹھا - اُس نے کہا " کیا بیہودگی ہے - یہاں بھی پادری گھس گئے - اِن پادریوں سے کبھی نجات بھی ملے گی ! "

یہ وقت بھی بیتا' رات آئی' گزر گئی - صبح باقاعدہ پھر سکول شروع ہُوا - یہ دینیات کا گھنٹا تھا اور پڑھانے والا یقیناً جید عالم

تھا جو کہہ رہا تھا:

"نجاتی یا نجات عیسیٰؑ پر یقین کامل رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔"

یہ اس نے کاپی پر لکھا اور عیسیٰؑ کے نیچے لکیر کھینچ کر "اپنے آپ پر" لکھ دیا۔

پادری آگے بڑھا "ستائیس بعد از مسیح، نزارتھ کا عیسیٰ گلیلی تشریف لایا اور اُس نے پیروؤں کو خدائی سلطنت کے متعلق بتاتے ہوئے فرمایا "وہ وقت آگیا جب تم خدائی سلطنت کو سمجھو اور حاصل کرو اور یہ محض پچھتاوے اور یقین کامل سے حاصل ہوتی ہے۔"

اُس نے کاپی میں صرف "یقینِ کامل" لکھا اور مطمئن ہو گیا۔ پھر طرح طرح کی اِزم تھیں۔ انگلیکن اِزم۔ لیوتھرینین اِزم۔ وہ اس عرصے میں عیسائیت کے کمزور نقطے چُنتا رہا۔ اُس نے لکھا:۔

"کیتھولک مذہب کی سختی۔ پھر تثلیث کا چکر —— خدا تین میں اور تین ایک میں"

یہ اُس کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا۔ اُٹھتے ہوئے اس نے سوچا "خدا ایک ہے اور عیسیٰؑ پیغمبر اور مسیحا تھا، جو بیماروں کو شفاء دیتا تھا۔"

سن اُنّیس سو پینتیس، سات مئی کی رات کو شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی۔ پہاڑوں پر خوشگوار خنکی تھی اور نیچے

میدانوں میں گھمس بڑھ گئی تھی۔

یہ رات ہنگامہ آرا تھی اور بزمِ طرب سجی ہوئی تھی۔

لیکن لارڈ ہمفری کے ہاتھوں میں جام لرزاں تھا۔ اس عیش و نشاط میں بھی اُن کے دل میں وسوسے تھے۔ وہ سر مورس سے کہہ رہے تھے، "کچھ تم نے سُنا؟ انگلستان میں بے کاری بڑھ گئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا۔ اس کی رُو سے ہندوستانیوں کو اور اصلاحات دے دی گئی ہیں۔ آخر یہ کہاں تک اور وسعت دیں گے۔ صوبوں کو خود مختاری دے دی گئی ہے۔ فوج کے سوا اب تمام محکموں میں ہندوستانی بھر گئے ہیں۔ پھر بھی مطمئن نہیں بلکہ اور مطالبے کر رہے ہیں۔"

جام اُن کے قدموں میں گر کر چکنا چُور ہو گیا۔ شراب بہہ رہی تھی اور جاگیرداری سماج آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ انھیں اپنا گھر شکستہ نظر آیا۔ اُس کا پلستر جھڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر ویلیس کی کتابیں گرد آلود تھیں۔ مگر سر مورس اِس وقت کسی اور جھک میں تھے اور بے تحاشا پی رہے تھے۔

یہاں گھر میں بڑی اُلجھن تھی۔ گھر کی بڑی جائداد وکیل صاحب سے اپنے نام کروانا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کو بٹھایا اور اُونچ نیچ سمجھانی چاہی۔

اُنھوں نے بتایا: "جب تمھارے دادا مرحوم بیمار تھے تو ہمارے ہی پاس تھے اور جس طرح میں نے اُن کی خدمت کی، میرا خُدا جانتا ہے۔ تمھیں تو کیا یاد ہوگا مگر زُہرہ سے پُوچھو۔ تو اس کے صلے میں اگر اُنھوں نے یہ جائداد تمھارے باپ کے نام لکھ دی تو کون سا قہر ہوگیا۔ اِس کے علاوہ تھوڑا بہت جو اُن کا روپیہ تھا وہ اُن کے دوا دارُو میں کام آیا۔ ہمارے پاس کہاں تھا کرنے کو۔ بیمار بھی تو مہینا بھر رہے۔

چھوٹی لڑکی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ اپنی ماں کی طرح خوش شکل اور باپ کی طرح قدآور تھی۔ بڑی زرد رُو، درمیانے قد کی سوتی سوتی سی شکل کی تھی۔ چھوٹی لڑکی اس وقت واقعی ذرا سی تھی۔ جو کچھ اُس کی ماں کہتی تھی سچ ہی کہتی تھی۔

مگر بڑی لڑکی نے ایک ذرا حیرت سے ماں کی طرف دیکھا، مُنہ کھولا

اور چُپ ہوگئی۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی نظروں میں ایک وقت گھوم گیا۔ اُس کے دادا بیمار تھے۔ اُس کی ماں گھڑی دو گھڑی کو اُن کے پاس بہت سر ڈھک کے جاتی تھیں اور بڑی نرم آواز میں خیر خیریت پُوچھ کے اُٹھ آتی تھیں۔ باقی ان کا ایک پُرانا نوکر اُن کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ مگر جب اُن کو دیکھنے کے لیے رشتے دار آتے تو ماں فوراً جا کے اُن کے پاس بیٹھ جاتیں۔ بے وجہ اُن کو کوئی چیز کھلانے پلانے لگتیں۔ کچھ نہیں تو بستر ہی ٹھیک کرنے لگتیں اور رشتے داروں سے رِقّت سے کہتیں: "اب تو میرے ہاتھ شل ہوئے جاتے ہیں۔ بس خُدا انھیں قائم رکھے"

یہ بھی اُسے یاد تھا کہ وہ دوا دارُو کے لیے ہمیشہ دادا جان کی الماری میں سے پیسے نکالتی تھیں۔ ہو سکتا ہے اِس میں خود اُن کے پیسے بھی ہوں۔ مگر وہ سودے سلف کے لیے اپنے آہنی سیاہ صندوقچے سے پیسے نکالا کرتی تھی۔ پھر اُسے یہ بھی یاد تھا کہ بابا نے دادا جان کا لرزتا ہاتھ پکڑ کے چند کاغذات پر دستخط کروائے تھے۔ مُدت بعد اُسے پتا چلا کہ یہ دُہی جائداد کے کاغذات تھے۔

اس کی طبیعت بہت مُکدّر ہوئی اور اب وہ چھوٹی لڑکی سے کہہ رہی تھیں "اور پھر یہ جائداد انھوں نے خود تو بنائی نہیں تھی۔ یہ تو موروثی ہے۔ مُغلوں نے اُن کے خاندان کو بہادری کے عوض دی تھی"

یک لخت وہ بولا گئی اور علی اکبر کا سر کھانے چل دی۔ وہ اطمینان سے بغیچے میں کرسی بچھائے بیٹھا پڑھ رہا تھا۔

"علی اکبر بھائی" اُس نے پکارا۔

"کیا بات ہے؟ آؤ۔ میں تمھارے لیے کرسی لاؤں؟" اس نے کہا۔ حالانکہ اُس کا اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"نہیں۔ میں خود ہی لے آؤں گی۔"

"تو لے آؤ اور تسلی سے بیٹھو۔" علی اکبر نے کہا۔ اسے وحشت ہو رہی تھی کہ کہیں اُسے اُٹھنا نہ پڑ جائے۔ وہ بہت کاہل تھا۔

وہ کہنے لگی: "یہ جائداد، روپیہ پیسہ، بڑی بُری چیزیں ہیں۔ ہماری مائیں ہمیں سچ بولنا اور ایمان داری سے چلنا سکھاتی ہیں۔ اور خود ہی یہ تمام قاعدے قانون توڑ دیتی ہیں۔ جب اِنھیں ہم خدا کا درجہ دینے لگتے ہیں تو وہ اِس درجہ نیچے اُتر آتی ہیں کہ ہم سے بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں۔"

علی اکبر نے زہرہ کے سر سے پن نکال کے کتاب کے ورقے میں لگائی اور کہنے لگا: "بھائی، میں تو اسی لیے بے مُلک کا نواب ہُوں اور پھر بھی عیش کرتا ہوں اور بات یہ ہے کہ ہماری اماں تو ایسی نہیں ہیں۔ اِس معاملے میں میں بہت شکر گزار ہوں اپنے ماں باپ کا کہ نہ میرے سوا کوئی اولاد پیدا کی اور نہ جائداد بنانے کا خیال آیا۔"

علی اکبر سمجھ گیا تھا۔ وہ بیوی بیگم کے سوتیلے بھائی کا بیٹا تھا۔

علی اکبر کے والد نہر کے انجینیئر تھے اور اضلاع میں رہتے تھے۔ وہ چاہتے تو یہی تھے کہ وہ بھی انجینیئر بنے مگر وہ کچھ لااُبالی تھا۔ اسے بہت کچھ کرنے کا ارمان نہ تھا۔ فی الحال وہ بی ایس سی کے پہلے سال میں تھا اور اچھا پڑھ رہا تھا۔

وہ کہنے لگی "علی اکبر بھائی، تم تو ہمیشہ مذاق کرتے ہو۔"

اِس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ تمھیں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم پڑھتی کیوں نہیں ہو۔ یہ کالج ہے جناب، دسویں کی پڑھائی نہیں ہے۔ محنت کیجیے۔" علی اکبر نے کہا۔

وہ کہنے لگی "مگر بیوی بیگم ـــ"

وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ علی اکبر نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "یہ جہان کا غم تم کیوں لیے پھر رہی ہو۔ بُری بات ہے، اپنے ماں باپ کے خلاف کبھی کچھ نہیں کہا کرتے۔ تم نے قرآن شریف میں یہ بھی تو پڑھا ہوگا کہ والدین کی محض عزت اور خدمت کرو۔"

"علی اکبر بھائی، ہمیں حساب پڑھا دو گے؟" وہ بڑی لجاجت سے کہنے لگی۔

"یہ تم حساب لے کر کیوں بیٹھ گئی تھیں؟ فیل ہو گی۔ یہ مضمون تمھارے بس کا نہیں۔ لاؤ پڑھاتا ہوں۔" علی اکبر نے کہا اور اُسے دیکھنے لگا۔

اور جب وہ کتاب لے کر آئی تو وہ بظاہر بیزاری مگر بڑی محبت سے

کہنے لگا "تم تو علی اکبر کی جان کو مصیبت ہو۔ رہ رہ کر بڈی کا دکھتا ہوا مہرہ"۔

دکھتے ہوئے مہرے نے اِس بات پہ دھیان نہ دیا اور پڑھنے لگی۔ اُس کے بابا نجانے کِس بات پہ اپنی بیوی کی بے حد منت سماجت کر رہے تھے۔ وہ اُسے ایسا کرتے اچھے نہ لگے جیسے وہ اُس کے باپ ہی نہ ہوں۔

اودھ کی یہ شام بہت خوشگوار تھی۔ گھمس میں کسی قدر کمی تھی۔ باہر چبوترے پہ ایک طرف تختوں پہ چاندنی بچھی تھی۔ اُس پہ سفید گاؤ تکیہ لگا تھا۔ کنارے پر جانماز تہ کی ہوئی رکھی تھی۔ تسبیح کے پاس موتیے کی چند مُنہ بند کلیاں پڑی تھیں۔ تخت سے ذرا دُور پلنگ لگے تھے اور اُن کے اُوپر مچھر دانیاں تھیں۔

تخت کے پاس آرام کرسی پہ وکیل صاحب بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ بیوی بیگم تخت پہ اُجلی ساری باندھے اُن سے مزے مزے باتیں کر رہی تھیں۔ جائداد اُن کے نام ہو چکی تھی اور ایسے کام ہوتے ہی وہ کھل جاتیں۔

وہ کہنے لگے "تم ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو جاتی ہو اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگتی ہو۔ وقت تو لگتا ہے ہر کام میں"۔

"ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ بھی تو خیال کیجیے میں نے

زندگی کیسی کاٹی۔ کسی چیز پہ اعتبار ہی نہیں رہا۔ اماں سوتیلی تھیں۔ ظلم و ستم اُٹھائے۔ سگے بھائی کو پروا نہ تھی۔ خیر اب تو وہ ختم ہی ہوئے۔ بہن ماں کی خوشنودی میں لگی رہتی تھیں۔ اُن کی اور اُن کی اولاد کی خوشامدیں کرتی تھیں۔ ہمیں مُنہ نہ لگاتی تھیں۔ ہر بات میں یہ تھا کہ تم نہ بولا کرو"۔ اُنھوں نے پرانی داستان ایک بار وکیل صاحب کو پھر سنائی۔

اِس میں شک نہیں کہ اُن کی زندگی میں ہمیشہ تلخی رہتی تھی۔ پھر بھی اُنھوں نے سوتیلے بھائی سے محبت کی اور اُن کے لڑکے کو دلداری سے رکھتی تھیں۔ اور یہ سوتیلا بھائی اُن کے سگے بھائی سے اچھا تھا۔ لیکن مطلب وہ بھی برائے نام رکھتا تھا۔

شادی کے بعد اُنھیں سانس آئی اور اُنھوں نے شوہر میں باپ، بھائی، محبوب، میاں سب ہی ڈھونڈنا اور اُس کا ازالہ کرنا چاہا مگر وہ کسی میں پورے نہ اُترے۔ وہ دُوسری طبیعت کے تھے۔ ذرا شوقین مزاج۔ کسی غیر عورت سے ملنے جلنے کی ہمت نہ تھی۔ جھانک تاک کے رہ جاتے۔ اِس لیے بیوی پر قناعت کرتے تھے۔ بیوی روٹھ جاتیں تو چاپلوسی کرتے، پاؤں پکڑتے۔ بیوی کو ان سے چڑ ہوئی پھر نفرت۔ وہ خوشامد کرتے بہانے بناتے اُنہیں ذرا نہ اچھے لگتے۔ شروع میں وہ لڑیں جھگڑیں سمجھایا بجھایا اور سدھارنے کی کوشش کی کہ خوشامد کرنا اور جھوٹ بولنا چھوڑ دیں

مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھے اور ڈرتے تھے کہ بیوی کہیں پلنگ کسی اور کمرے میں نہ لگوا لیں۔ وہ ان کی عزت نہ کر سکیں "مرد" انھوں نے سوچا تھا "با اُصول اور ویسے ویسے اچھا لگتا ہے۔ یہ اِتنے لمبے چوڑے اور نگوڑے مٹی کے مادھو"۔

بہت سی باتوں میں وہ اُن سے برتر تھیں۔ اور اب اُن کی تان پیسے پر ٹوٹتی تھی۔ اُن کی اِسی طبیعت سے جس سے وہ اُلجھا کرتی تھیں وہ اب بڑے فائدے اُٹھاتی تھیں۔

اُن کا موڈ اچھا دیکھ کے وہ کہنے لگی "اماں، ہم علی اکبر بھائی کے ساتھ حضرت گنج تک ہو آئیں؟"

"ہاں جاؤ۔ نگین کو بھی لے جاؤ۔ بے ڈھنا دوپٹا اوڑھ کے سر ڈھک کے بیٹھنا۔"

پھر اُس نے چھوٹی بہن سے پُوچھا "نگین چلتی ہو؟"

وہ کہنے لگی "نہیں۔ ہمارا کل ٹیسٹ ہے۔ آپ جائیے۔" وہ چبوترے کے ساتھ والے برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ وہ ذرا پڑھنے میں پیچھے تھی۔ اِسی عُمر میں زُہرہ نے میٹرک کر لیا تھا۔ وہ ابھی نویں میں تھی۔

علی اکبر نے کہا "پہلے ایک پیالی چائے پلواؤ۔ پھر چلیں گے۔"

وہ جلدی جلدی باورچی خانے میں چائے بنانے لگی تو بُندو نے دل میں کہا "آج تو بڑی بٹیا بڑی اچھی ہو رہی ہے۔ یہی تو ہے۔

جب اپنا جی چاہے گا خُوب کام کرے گی۔"

مگر پھر بُندو اُس سے لڑنے لگا۔ اُس کے ہاتھ سے چمچہ نیچے گر پڑا تھا۔

"اِسی لیے میں تُمھارا ہاتھ نہیں بٹاتی ہُوں۔ اِتنا ذلیل کرتے ہو۔" اُس نے کہا۔

"کیوں ہم نے پالا جو ہے۔ ہم نہیں سکھائیں گے تو کون سکھائے گا؟"

"بس رہنے دو بُندو۔ نگین کو کچھ نہیں کہتے ہو۔"

"اُس کی بات اور ہے۔ وہ سمجھ دار ہے۔ تُم تو اُونٹ کی اُونٹ ہو گئی ہو۔ پر نام کو عقل نہیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہُوئی چائے اندر لے گئی۔ وہ بڑبڑ کرتی اور چائے لاتی ہُوئی علی اکبر کو ہمیشہ سے زیادہ دِل چسپ اور اپنی لگی۔ وہ اُسے شوق سے دیکھنے لگا۔

زُہرہ نے پیالی تھماتے ہُوئے کہا "اب پکڑ بھی چکو۔ سو گھنٹے ہر بات میں لگاتے ہو۔ رات ہو جائے گی۔ پھر اماں جانے نہیں دیں گی۔ جلدی کرو۔" یہ سب اُس نے ذرا سا مُنہ پھیر کے کہا۔

علی اکبر چائے پینے لگا اور ٹھنڈی سی سانس بھر کے سوچنے لگا۔ "یہ بھی خُوب ہے۔ آخر ہم تُمھیں چاہیں کیسے؟ جو بات تُمھیں معلوم ہے وہ آنکھیں بچا کے تُم منوانا چاہتی ہو کہ تُم کو نہیں معلوم۔ چلو یُونہی سہی۔"

علی اکبر ذرا لڑکیوں کے ساتھ جاتے سے گھبراتا تھا۔ اُسے کوفت

ہوتی تھی۔ مگر خیر، یہ تو زُہرہ تھی اور پھر وہ خرید بھی چھوٹی چھوٹی ٹُھنگنا چیزیں رہی تھی۔ اُس نے کتاب کی دُکان سے ایک انگریزی ناول خریدا، گھڑی فیتہ لیا۔

علی اکبر نے کہا "اے سوئیٹر ہمیں بُن دو۔ ہم اُون تمھیں لیے دیتے ہیں۔"

"بُن دیں گے۔ مگر پُوری آستین کا نہیں۔ تمھارا منی آرڈر آگیا؟"

"ہاں آگیا۔ چاٹ کھاؤ گی؟" علی اکبر نے پُوچھا۔

"نہ۔ ہمیں چاٹ واٹ نہیں پسند۔ کافی پی سکتے ہیں۔"

"تُم بڑی میم ہو۔ لڑکیوں کو تو چاٹ پسند ہوتی ہے۔" علی اکبر نے ہنس کے کہا۔

"ہوتی ہوگی ہم اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہیں۔"

کافی ہاؤس کی فضا میں وہ بہت خُوش ہُوئی۔ اِس سے پرے کُچھ کُچھ میمیں اور کچھ انگریز تھے۔

علی اکبر نے کہا "یہ تُمھارے خاندان کے لوگ بیٹھے ہیں۔" اس نے اُنھیں غور سے دیکھا اور ہنس کر کہنے لگی: "ہاں، یہ تُم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میرے ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ میرا اِن سے کُچھ رِشتہ ہے۔"

جب وہ نکل رہے تھے تو اُن سے پہلے ایک نوعُمر انگریز لڑکا کُچھ

لوگوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اُس کی پیٹھ تھی علی اکبر اور زُہرہ کی طرف۔ لحظہ بھر کو وہ ٹھٹکی اور اُس کی پیٹھ کو دیکھتی چلی گئی۔ پھر وہ جلدی سے مُڑ گئی۔ علی اکبر کو اُس کی یہ بات بُری لگی۔

وہ کہنے لگا، "اِس طرح نہیں دیکھا کرتے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ میرا مطلب ہے یہ بدتمیزی ہے؟"

وہ بولی: "پھر کس طرح دیکھا کرتے ہیں؟ وہ تھوڑی اِدھر دیکھ رہے تھے۔ جو بدتمیز کہتے۔"

علی اکبر کہنے لگا: "تمھارے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے وہ تو دیکھ رہے تھے۔ اور تُم ان کا رستا بھی روکے کھڑی تھیں۔"

"اچھا، مُعاف کر دو۔ واقعی دھیان نہیں رہا۔" اُس نے کہا اور پُوچھنے لگی "کیا نمونہ ڈالوں تمھارے سوئیٹر میں؟"

اِس پر وہ ذرا دِل گرفتگی سے کہنے لگا۔ "بس سادہ سا بُن دو۔"

اب کی وہ چھٹیوں میں لکھنؤ آیا اور سر مورس کے یہاں ٹھیرا۔ وہ
اور براؤن اکثر علی کے یہاں جاتے۔ پھر وہ اکیلا بھی ہو آیا کرتا۔ علی
کی دادی اماں علی کے دوستوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ خاص کر
اِس سے تو بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ حالانکہ اُن کے مُنہ سے اُس کا
نام نہ نکلتا تھا۔ اور ہیر علی کے چچا بھی بڑے اچھے تھے۔ اُنھوں نے اِسے
سیاہ شیروانی بنوا کر دی تھی اور وہ آڑے پاجامے پر پہن کر بڑا اچھا
لگتا تھا۔ وہ اب بڑی صاف اُردو بولنے لگا تھا۔ براؤن اِس مُعاملے
میں کورا تھا۔ اور ہیرٹ جان کے غلط بولتا تھا۔
اور دادی اماں نے شبتو سے منگوا کر اُسے بڑے، اچھے قلمی آم کھلوائے
تھے۔ اُس نے پُوچھا تھا "دادی اماں، جاڑے میں آم آپ کے پاس
کہاں سے آئے؟"
"اِس پر وہ کہنے لگیں "اے، یہ میں نے علی کے خیال سے موم
چڑھوا کے رکھ لیے تھے۔ ایک پارسل بھی تو بھیجا تھا آموں کا۔ تم نے
بھی کھائے وہ آم؟"
"جی شکریہ۔ مجھے بھی علی نے کھلائے تھے۔ مگر یہ تو آپ نے

خاص علی کے لیے رکھے تھے۔ مجھے کھلائے دے رہی ہیں آپ" وہ
کہنے لگا۔
"اے، تو تم میں اور علی میں کوئی فرق ہے۔" اُس نے دل میں
سوچا "یہ ممی کی آنٹ ہیریٹ سے قطعی مختلف ہیں۔"

لارڈ ہمفری بہت رنجیدہ تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ افسوس
آج شہنشاہیت ختم ہو گئی۔ برطانیہ کا یہ وکٹوریہ کے بعد سب سے
معقول بادشاہ تھا۔ صد افسوس"
"شہنشاہ جارج پنجم ۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو انتقال فرما گئے۔"
اُنھوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا۔ اِس کے نیچے اُنھوں نے لکھا:
"ایڈورڈ اور پیٹر اگلے ہفتے تعلیم کے لیے ولایت جانے والے ہیں۔"
وہ دبے قدموں سے اُن کے پاس آیا اور دھیمی آواز میں بادشاہ
کے مرنے کا افسوس کرنے لگا۔ مجھے افسوس ہے کہ جارج پنجم کا اِنتقال
ہو گیا۔"
"اُنھوں نے سر اُٹھایا اور رنج سے کہنے لگے: "کیا تم شہنشاہ جارج
پنجم نہ کہہ سکتے تھے؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔"
"مگر اب شہنشاہیت تو دُنیا سے ختم ہو رہی ہے۔ ایک انسان
جسے اُس جیسے انسان چُن کر بٹھاتے ہیں، وہ اُن کے حقوق کی حفاظت
کرتا ہے اور اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔ بہرحال وہ ان سب سے بہتر

تھا۔ مگر اپنے کو اِس مُلک سے دُور رکھتا تھا۔ اور ڈیڈی! عام دِل کو محکوم کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا یہ لوگ بڑے با محبت ہیں۔ اِس کا مُظاہرہ میں نے علی کے گھر میں دیکھا ہے۔ وہ لوگ دُوسروں کے بچّوں سے بھی اپنے بچّوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔"

اُنھوں نے غور سے اُسے دیکھا اور کہنے لگے۔ اُن کی آواز گہری تھی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر پھر بھی وہ بادشاہ تھا۔ کوئی حرج نہیں۔ اگر تم شہنشاہ کا لفظ بھی اِستعمال کرلو۔ یہ عزّت اُس کو مُدّتوں سے ملی ہُوئی ہے تُم یہ لفظ ہٹالوگے تو بھی رہے گی۔ تم علی کے یہاں گئے تھے؟"

"میں نے آپ سے ذِکر کیا تھا۔ شاید آپ کو دھیان نہیں رہا۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ بڑا اچھا اور شائستہ لڑکا ہے۔" پھر وہ پُوچھنے لگے: "تُمھارا آیندہ زندگی کے مُتعلق کیا خیال ہے؟"

"میں واپس آؤں گا۔" اُس نے اُن کی طرف یقین سے دیکھ کر کہا۔

اُنھوں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور کہنے لگے: "تُمھارے آنے کے چند سال بعد تو ہم شاید واپس چلے جائیں۔ دیر یا سویر ہندُستان آزاد ہوگا۔"

اُنھوں نے اُسے سمجھانا چاہا۔ مگر وہ نہ سمجھا اور نہ وہ سمجھا سکے۔ وہ اِسی یقین سے کہنے لگا: "اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ڈیڈی۔ جب آپ افریقہ گئے ہوں گے تو اُس وقت آپ کے والد زندہ تھے۔"

"جب کی بات اَور تھی۔" اُنھوں نے کسک سے کہا اور مُسکرائے۔

وہ کہنے لگا "یہ صِرف سوچنے کا فرق ہے۔ وقت فضُول چیز ہے۔ اصل چیز کام اور مقصد ہے۔ ویسے تُمھارا یہاں کتنی مُدّت تک رہنے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

اُنھوں نے سر اُٹھا کے اُسے اچنبھے سے دیکھا اور بظاہر خُوشدلی سے ہنس پڑے۔ مگر اُن کے دل میں رنج تھا، شہنشاہ کے مرنے کا اُس کی اور پیٹر کی جُدائی اور سب سے بڑھ کے اُس کے فیصلے کا۔ اُنھیں یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا جیسا کہہ رہا ہے۔

پھر اُنھوں نے کہا۔ "بادشاہ کے مرنے کی گرجے میں نماز ہے۔ تیار ہوجاؤ۔"

وہ جانا نہ چاہتا تھا۔ پھر وہ یہ سوچ کے کپڑے بدلنے لگا کہ اُس کے باپ کو رنج ہوگا۔ وہ دِل گرفتہ تھے۔

گرجے میں وہ خاموشی سے سر جُھکا کے بیٹھ گیا۔ مگر اُسے سخت کوفت اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ اِزدحام سے گھبراتا تھا اور مجمع میں اکیلا تھا۔ اور یہ پہلا تنہائی کا اِحساس تھا جو اُسے ہُوا تھا۔ وہ بڑا ہوگیا تھا۔

چلتے وقت اُس کے باپ نے کہا تھا "مُجھے تُم سے بڑی اُمیدیں ہیں۔"

وہ کون سی اُمیدیں تھیں وہ سمجھ نہ سکا اور سوچنے لگا: "میرے بدلے یہ پیڑ سے کہتے تو بہتر ہوتا۔ انھیں مجھ سے کس قسم کی اُمیدیں ہیں۔ میں ڈی ڈیلرا تو نہیں ہوں۔ میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں، جسے بہت کی تمنا نہیں۔"

جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ وہ ہرا بھرا دیس چھوڑ تا تھا اور کہر کے ملک کو جاتا تھا۔ اُس کا دِل ڈوب گیا۔ مگر پھر اُس نے یقین سے اپنے آپ سے اور احمد سے کہا: "میں آؤں گا۔ تم میرا اِنتظار کرنا۔"

اُس نے بمبئی کے ساحل پر نظر دوڑائی۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ کون تھا؟ اسے معلوم نہ تھا۔ ساحل پر اُس نے مختلف عورتوں کو دیکھا اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تلاش جاری رہی۔

"میں آؤں گا۔ یہ الفاظ اِس سرزمین پر سفر طے کرتے رہے، میلوں اور سالوں کا۔ اُسے لگا جیسے ہندوستان اُسے پکار رہا ہو۔ وہ اُس کا مُنتظر رہے گا۔ احمد مُنتظر رہے گا۔

"کس قدر وقت گزر گیا۔ ابھی کل کی بات ہے، یہ بچے ذرا ذرا سے تھے۔ علی ماشاءاللہ ڈپٹی کلکٹر ہوگیا۔" دادی اماں نے سوچا، اب انھیں اُس کی شادی کی فکر تھی۔

وہ شبّو سے کہنے لگیں۔ "لے، یہ پیسے اپنے باپ کو ڈیوڑھی پہ دے آ۔ میں نے مانے تھے۔ علی کے خیریت سے اپنی نوکری پر پہنچنے کے۔"

وہ کہنے لگی: "بڑی بیگم، یہ مجھے دے دیجیے۔ وہ تو اِس کی افیم کھالیں گے۔"

"اری چُپ کر۔ بڑی آئی باپ پر اعتراض کرنے والی۔ کھالے گا تو کھالے۔ تجھے کسی بات کی کمی ہے۔ ارے تجھے کیا معلوم، علی کے دادا اس کا بڑا خیال کرتے تھے۔ علی کے ابا مہدی مرحوم اس کے کندھوں پہ گھوما کرتے تھے۔"

وہ آبدیدہ ہوگئیں۔ اُن کے دِل میں زخم تھا، جو موقع بے موقع دُکھتا تھا۔ اپنے بڑے بیٹے علی کے ابا کے مرنے کے بعد سے دادی اماں کبھی ہنسی نہ تھیں۔ شبّو کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اُس کا باپ بہت

بوڑھا ہوگیا تھا - ہر وقت افیم کی پینک میں رہتا - اُس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہ رہی تھی - جب آواز دیتا، علی کے باپ ہی کا نام لے کر پکارتا " مہدی میاں " پچھلی باتیں کرتا تھا - اور اپنے آپ بولا کرتا - اور اپنے خیال میں بڑے اہم کام پر تھا - اُس کے لیے ڈیوڑھی اب بھی آباد تھی - حالانکہ یہ ڈیوڑھی شبیر صاحب نے کب کی بند کروا دی تھی - اب لوگ آگے کے برآمدے سے نشست کے کمرے میں جاتے تھے - اُسے تو شبو کا بھی ہوش نہ تھا - شبو کو دادی اماں نے پالا تھا - اور خیال کرتی تھیں - اُنھوں نے اُس کی شادی کر دی تھی - فرزند بڑا اچھا لڑکا تھا - حال ہی میں باقر صاحب نے اُسے چھوٹی سی دکان کرا دی تھی - پہلے وہ اُن کی زمینوں پر تھا -

شبو پیسے دے کر آئی تو کہنے لگی "بڑی بیگم، اب علی میاں کی شادی کر دیجیے "

اس پر وہ کہنے لگیں: "ہاں، میں بھی اسی فکر میں ہوں " تو سوچ کیا رہی ہیں؟ بسم اللہ کیجیے "

" تو نہیں سمجھتی - اِس وقت میں بڑی اُلجھن میں ہوں " اُنھوں نے متفکر ہو کے کہا -

وہ کہنے لگی: "اِس گھر کی کون سی بات ہے جو میں نہیں سمجھتی "

" پھر تو ہی بتا، میں کیا کروں - باقر اور شبیر کی بڑی لڑکیاں بیاہ گئیں - یہ چھوٹیاں رہ گئی ہیں - مجھے خوب معلوم ہے کہ شبیر اور

ان کی دُلہن آزاد خیال ہیں - اور یہ اُن کی لڑکی بہت تیز ہے - بال کٹائے گھومتی ہے - اپنی بچّی ہے تو کیا - مجھے تعلیم دلوانا پسند ہے - میں نے اپنی قیصری کو دسویں تک پڑھوایا مگر لڑکیوں کی چیل بل اور زبان نہیں پسند - پھر شبیر کی بیوی جس خیال سے اپنی چھوٹی کی علی سے کرنا چاہتی ہیں وہ خیال بھی مجھے بالکل نہیں پسند - ماشاء اللہ علی کو اُس کے باپ کا پورا حصّہ ملا ہے - اُس کے کوئی بھائی بہن تو ہے نہیں - یہ اُنھیں کھٹکتا ہے - وہ کئی بار اِس بات کا ذکر کر چکی ہیں - تو دیکھنے والی ہے کہ میں نے حساب کتاب سے اپنی زندگی ہی میں سب کا حصّہ بانٹ دیا ہے - میں نہیں چاہتی میرے بعد اِن میں آپس میں اِس موئی جائداد پر کوئی بات ہو - نہ میرے یہاں کبھی جھگڑے قصّے - یہ گھر میرے نام تھا - پچھلے سال اِسے میں نے اولاد کے نام وقف کر دیا - اپنے سے تو میں نے سب اِنتظام کر دیا ہے - پھر بھی کوئی اُلجھن ڈالنا چاہے تو یہ اُن کی بدنصیبی ہے - جہاں محبّت نہیں، وہاں رحمت و برکت نہیں - مگر باقر کی بیوی کے خیالات اَور قسم کے ہیں - اُس کی لڑکیاں بھی ویسی ہی ہیں - وہ بڑی نیک لڑکی ہے - بہو کے مُعاملے میں انسان کو احتیاط لازم ہے - یہ گھر کی بُنیاد ہوتی ہے - لیکن باقر کی بیوی نے اپنی زبان سے اِس قسم کی بات کا کبھی ذکر نہیں کیا - میں اُس کی چھوٹی سے علی کی کرنا چاہتی ہوں "

اُن کی اِس گفتگو پر شبو ہنسی اور کہنے لگی: " بڑی بیگم، آپ فضول

فکر کر رہی ہیں۔ وہ اِن دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں کریں گے۔"
"تیرے مُنہ میں خاک۔ وہ کیوں؟" اُنھوں نے پُوچھا۔
شبّو ہنس کے کہنے لگی۔ "وہ یُوں کہ میں کہہ جو رہی ہوں۔ میرے
مُنہ میں خاک نہیں گھی شکّر۔ اُن کی نظر میں کوئی اَور لڑکی ہے۔"
"اچھا! وہ کون ہے؟" دادی امّاں نے فکر اور حیرت سے پُوچھا۔
"اب مُنہ کھولُوں گی تو آپ خفا ہوں گی۔"
"نہیں، تو بتا۔ میں خفا نہ ہوں گی۔"
"چھوٹے صاحب سے جو وکیل صاحب سے تاش کھیلنے آتے
ہیں، اُن کی چھوٹی لڑکی سے۔" شبّو نے اُنھیں بتایا۔
وہ سناٹے میں آگئیں اور کہنے لگیں، "ہائیں! ہمارا اُن کا کیا جوڑ!
ہم سیّد حکیموں کا خاندان۔ وہ راجپُوت۔ تُو تو پاگل ہے۔"
"میں پاگل نہیں ہُوں بڑی بیگم۔ یہی ہوگا۔ راجپُوتوں کی اکڑ ہوگی
اور سیّدوں کی نرمی اور یہ شادی ہو جائے گی۔"
"مگر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟" اُنھوں نے فکرمندی سے
پُوچھا۔
"یہ بیل خُوب منڈھے چڑھے گی اور آپ ہی کے ہاتھوں۔ یہ وقت
اَور ہے بڑی بیگم۔" اُس نے شوخی سے کہا۔
اِس پر اُنھوں نے دھیرے سے کہا: "ہاں، تو ٹھیک کہتی ہے۔
اچھا اُس کی مرضی۔" اور سر جھکا کے پان بنانے لگیں۔

مگر پھر یکایک کہنے لگیں "مگر علی اِسے کیا جانے۔ عورتوں کا مِلنا جُلنا
تو آپس میں کبھی ہُوا نہیں۔"
اِس پر وہ رازداری سے کہنے لگی: "علی میاں جاتے رہے ہیں۔ وکیل
صاحب کی بیوی کے بھانجے سے اکثر ملنے جایا کرتے ہیں۔ شاید اسی
بہانے جاتے ہوں۔"
"ہُوں۔" اُنھوں نے فکر سے کہا۔

اور اِس گھر میں مزید اُلجھن تھی۔ اِس گھر کی بیوی سخت تذبذب
میں تھیں۔ علی کا پیغام آیا رکھا تھا۔ ڈپٹی کلکٹر سیّد زادہ علی مہدی کو
سیّدوں کا جلال آگیا تھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا اور وہ بڑا
خوبصُورت لگ رہا تھا۔ یُوں ضد کرتے اُس نے دادی امّاں سے کہا
تھا۔ "پھر آپ میری شادی کا ارمان چھوڑ دیجیے۔ ارمان بھی ہے اور
جہاں میں چاہتا ہوں وہاں کرنے پر راضی بھی نہیں۔"
اِس پر شبّیر صاحب کی بیوی نے کہا تھا "یہ بے جا لاڈوں نے
اِسے بگاڑا ہے۔ اب خود ہی بھگتیں گی۔"
اور دُوسرا پیغام اُن کی دیورانی نے بڑے سوچ بچار کے بعد پُرانی
رنجشیں ایک طرف رکھ کے، اِس جائداد کا حصّہ حاصل کرنے کے لیے
اپنے بڑے بیٹے کا بھیجا تھا۔ وکیل صاحب خاندانی رشتوں اور اُلجھنوں
سے گھبراتے تھے۔ پھر علی کے چچاؤں سے اُن کے پُرانے مراسم تھے۔

اِس کے علاوہ شبیر صاحب بیرسٹر تھے۔ اُن کی وساطت سے انھیں مُقدمے ملتے تھے اور اونچے حلقوں میں پہنچ تھی۔ انھیں کوئی اِعتراض نہ تھا۔ اِعتراض بیوی بیگم کو بھی کوئی نہ تھا۔ لڑکا صاحب جائداد تھا۔ شاندار اور خوش شکل تھا۔ مگر وہاں انبالہ چھاؤنی میں اُن کے جیٹھ بیٹھے اُن کے فضیحتے بکھیر رہے تھے اور اُڑتی اُڑتی اُنھوں نے سُنی تھی کہ اُن کا بڑا بیٹا ارشد مُقدمے کی سوچ رہا ہے۔ اِس طرح وہ جیٹھ کا مُنہ بند کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کی بیوہ اور اُن کے بچّوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ سچّی بات ہے، وہی اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ویسے وہ روپیہ چھوڑ کے مرے تھے۔ اُن کی بھاوج خوش حال تھیں اور اِدھر سے سدا بیوی بیگم کی طرف سے دیورانی کے لیے ناک بھوں چڑھی رہی اور یہ کہ "اے اُنھیں ماشاء اللہ کس چیز کی کمی۔ وہ تو ہمیں بھی پال دیں۔" وہ وکیل صاحب کے دل سے بھائی کے مرنے کا ملال اور سلوک کرنے کا خیال ایسے ہی نہ جانے کتنے الفاظ سے مِٹا دیتیں۔ اَور نہیں تو رُوٹھ جاتیں الگ سونے لگتیں۔۔۔

اور یہاں نگین بیٹھی بھل بھل اپنی آپا کے سامنے رو رہی تھی۔ اُس کی آپا ایک ذرا ہنسی اور کہنے لگی: "میں تمھارا ابھی کام کروائے دیتی ہُوں۔ امّاں کا دِل یُوں صاف ہو جائے گا اور علی کے حق میں فیصلہ کریں گی۔ مگر تم میرا ایک کام کرو۔ مجھے پچاس روپے لا دو، جلدی کرو۔"

علی اکبر نے کھڑکی میں سے یہ منظر دیکھا اور سوچنے لگا: "یہ بڑی کمبخت ہے۔ مجھ سے مانگتی تو میں دے دیتا۔ مگر اسے دُوسرے کو جلانے، اپنی ماں کو ٹھگنے اور ایسے سودے کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"۔۔۔ وہ اُٹھ کے چلا گیا۔

نگین کہنے لگی "مگر جب تک تُمھاری شادی نہیں ہوتی"۔۔۔

وہ اِتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اُس کی آپا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "تُم اس کی فکر نہ کرو۔ بیوی بیگم جہاں کہیں گی اور جب کہیں گی میں شادی کر لُوں گی۔ مگر مَیں تُمھاری پہلے کراؤں گی۔ تم دیکھو، میں انھیں کیا پٹّی پڑھاتی ہوں۔ بس پچاس روپے لا دو۔"

پچاس روپے اُس نے اِحتیاط سے الماری میں رکھے اور اپنی ماں کو پٹّی پڑھانے بیٹھ گئی۔ اُس نے اُنھیں بڑی اُونچ نیچ سمجھائی اور کہنے لگی: "بڑے ابّا مُقدّمہ کریں گے کیسے۔ آپ یہ بھی تو غور کیجیے کہ جائداد تو آپ کے نام ہے۔ کچہری میں یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کو بابا نے یا دادا جان نے مہر میں دی تھی۔ بابا خود وکیل ہیں۔ اِس کے علاوہ شبیر صاحب بیرسٹر ہیں۔ اِس صُورت میں اِس گھر میں جِتنی جلدی آپ رشتہ کریں بہتر ہے۔"

وہ بڑی بیٹی تھی۔ پہلی بار اُس نے کسی اہم مسئلے پر سنجیدگی اور دلچسپی سے بات کی تھی۔ اُن کی سمجھ میں آگئی اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ میں لگ گئیں۔ "لڑکی کے باپ نے زبان دے دی تھی" یہ بات

اُنھوں نے رشتہ داروں کے لیے سوچ لی تھی۔

نگین نے آنسو پونچھے، عصر کی نماز پڑھی، خدا کے حضور بڑی آسُودگی سے شکرانے کے سجدے کیے۔ پھر بڑے اطمینان سے سلام پھیرا، جانماز تہ کی اور اچھی بیٹی کی طرح باورچی خانے کا رُخ کیا۔

علی اکبر نے سوچا۔ اسے ایسی کیا ضرورت پڑ گئی اتنے سارے روپیوں کی مگر اُسے بڑی سخت ضرورت تھی۔ بیس روپے اُسے کالج میں بنگال فنڈ میں دینا تھے جہاں قحط پڑ رہا تھا۔ بیس روپے وہ ایک دوست سے شرط میں ہاری تھی۔ اِس کے علاوہ کالج میں ایک اینگلو انڈین لڑکی کیتھرائن کی ماں ایک پُرانا انگریزی چاندی کا پیالہ نُما گُلدان فروخت کر رہی تھی، وہ اُسے بہت پسند تھا۔ وہ کہتی تھی سَو برس پُرانا ہے۔ اُس کی ماں کبھی ولایت سے اپنے ساتھ لائی تھی اور بیس روپے سے ایک پیسہ کم نہ کرتی تھی حالانکہ کیتھرائن نے بہت سفارش کی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اُسے دُھن آ گئی تھی ایسا کرنے کی۔

"یہ تھوڑی سی سنکی ہے"۔ علی اکبر نے یقین سے سوچا۔

اور یہاں یہ ایڈورڈ جو نیا نیا جوان ہُوا تھا، بڑا شاندار نکلا تھا۔ اُس پر چھوٹی چھوٹی مُونچھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اُس کے جسم کا ڈھانچا پُرانے یُونانی ستونوں کی طرح سیدھا اور نازک تھا۔ اور وہ آرام سے رائل انفرمری سکاٹ لینڈ میں کوڑھ پر سرجری پڑھ رہا تھا۔

وُہ بڑے اطمینان سے اِس کالج کی قدیم شاندار عمارت میں دبیز قالینوں پر ایک تھیٹر سے دُوسرے تھیٹر میں گزرا کرتا۔ اسے لڑکیاں ٹھٹک کے دیکھتی تھیں اور سوچا کرتی تھیں "کیا یہ بھگت ہے؟ یہ ہندوستان سے آئے ہُوئے انگریز اپنے پہ ایک عجیب سا فلسفہ طاری رکھتے ہیں۔ اِس طرح وہ شاید برتر ہونا چاہتے ہیں۔ ہر شخص نئے رنگ میں آتا ہے۔ یہ بھی شاید بُدھ یا کرشن کے خیالات کا حامی ہوگا اور گیان کے فلسفے پر روشنی ڈالنے کا شائق"۔

مگر یہ بات نہ تھی۔ اُسے اِن لڑکیوں کا بناؤ سنگار، اِن کا تصنّع اور ان کی کھلے عام محبت کی دعوتیں پسند نہ تھیں۔ اُسے اِن کے قُرب سے کراہت کا احساس ہوتا جس کا وہ اظہار نہ کرتا تھا اور سوچتا "اِن میں کوئی خاص بات نہیں"۔

ہے جو پورے ملک پر طاری ہے۔ اس کے علاوہ خصوصاً ہمارے
طبقے میں تصنع اور ریاکاری ہے۔ یہ لوگ طرح طرح کے لبادے اوڑھے
رہتے ہیں۔ میں تو مدت بعد یہاں آیا ہوں۔ بچپن میں یہ ملک کیسا تھا،
مجھے خیال نہیں۔ کوئی کھل کے، بے تکلفی سے بات نہیں کرتا۔ لڑکیاں
لڑکے پھانسنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ چلو اچھا ہے، جب تم
آؤ گے تو تمھارے ساتھ تمھاری بیوی ہوگی۔ اپنی اور اپنی بیوی
کی ایک تصویر تو بھیج دو۔ اُسے سلام کہنا۔ میں شکرگزار ہوں کہ تم
ڈیڈی کے پاس گئے تھے۔ ایڈنبرا پہنچ کر پھر تمھیں خط لکھوں گا۔"

اور دوسرا آخری خط، کیوں کہ اب وہ پڑھائی میں مصروف ہونے
والا تھا، اُس نے رائل انفرمری سے لکھا تھا۔ اُس نے لکھا۔ "یہ
وہ ملک ہے جہاں میری آف سکاٹس کا محبوب اُس کے بازوؤں
میں قتل ہوا تھا اور جو بعد میں خونی میری کے نام سے منسوب ہوئی۔
تم نے تاریخ میں سب کچھ پڑھا ہے۔ مگر اس نقطے پر غور نہ کیا
ہوگا کہ اِس واقعے کے بعد سے اس کی خو بگڑی ہوگی اور اُس پر
خون بہانے کا جنون طاری ہوا ہوگا۔ یہاں لندن کی نسبت تکلفات
اور تصنع بہت کم ہے۔ یہ بہت خوش باش لوگ ہیں مگر شراب بہت
پیتے ہیں۔ تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ ہفتے کا یہ بڑا احترام کرتے
ہیں۔ اِس دن جنت کا احترام کیا جاتا ہے۔ مگر گرجے کا نقشہ جہنم
سے کم نہیں ہوتا۔ آدمی پر آدمی ٹوٹتا ہے۔ میں ایک بار ایک لڑکی کو

مگر اس کے بھائی نے محسوس کیا تھا کہ وہ یہاں آکے سنکی ہو گیا ہے
وہ یہاں آنے سے پہلے خالہ ہیریٹ سے اُلجھتا رہا تھا۔ ویسے ذرا سی
بات تھی۔ ہندوستان سے علی کے بھیجے ہوئے آم جس کی فرمائش اُس
نے علی کے اس پوچھنے پر لکھی تھی کہ میں تمھیں یہاں سے کیا بھیجوں،
وہ بڑے چٹخارے اور مزے سے کھا رہا تھا۔ مگر خالہ ہیریٹ اس پر
بھی معترض تھیں۔ اُنھیں گھن آ رہی تھی۔ پیٹر کے سمجھانے پر
اُس نے بڑی رکھائی سے کہا "کیوں؟ میرا گھر ہے۔ میں جس طرح
چاہوں رہوں۔"

اور جب وہ ایڈنبرا جانے لگا تو بٹلر نے کہا تھا: "ماسٹر ایڈورڈ
کے جانے سے سناٹا ہو جائے گا۔" کیونکہ پیٹر زیادہ وقت باہر رہتا
تھا۔ گھر پر تو وہی بیٹھتا تھا۔ خالہ ہیریٹ نے بٹلر سے کہا تھا۔
"کیوں، پیٹر تو ہے یہاں۔ وہ زیادہ شائستہ ہے اور میرا خیال کرتا
ہے۔ معاف کرنا، میرے اور ایڈورڈ کے درمیان کوئی محبت نہیں
کھوئی۔"

بٹلر خاموش ہو گیا مگر وہ پرانا خادم تھا۔ وہ اُس کے جانے کے
بعد سناٹا محسوس کرتا۔

ایڈورڈ نے فوراً علی اور احمد کو خط لکھا تھا اور احمد کو اپنے
واپس آنے کا یقین دلایا تھا۔ علی کو اُس نے لکھا تھا۔" تم کیا کیا
جاننا چاہتے ہو؟ میں تمھیں کہاں تک لکھوں؟ یہاں تناؤ ہی تناؤ

چھوڑنے گیا تھا (ویسے میری اُس کی دوستی نہیں ہے۔ تُم اسے دُوسرے رنگ میں سوچ کر محظوظ نہ ہونا۔) یہاں ریاکاری اور جُرم کم ہے۔ میرے کالج کی عمارت بڑی شاندار ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے یہاں پڑھنے میں۔ مُبارک ہو کر تم خوش ہو۔ شاید میں اب تُمھیں خط نہ لکھ سکوں، کیونکہ مجھے بہت پڑھنا ہے۔"

نواب زادہ ہیری ہمفری صُورت شکل اور قد و قامت سے جرمن لگتا تھا، لیکن طبعاً انگریز تھا۔ وہ یہاں مُستقل رہنے کو آ گیا تھا اور اپنے مُلک میں مگن تھا۔ اُس کے دسیوں مشغلے تھے۔ لڑکیاں، ناچ، گُھڑ دوڑ، شکار، دریائے ٹیمز میں کشتی رانی۔ پھر وہ اُن انگریزوں میں سے تھا جو کرکٹ اور ڈربی دیکھنا ضروریاتِ زندگی میں سے سمجھتے تھے اور جن کو اپنے ملک کے قحبہ خانوں تک سے محبت تھی۔ اُس کے لیے ووز کے جنگلوں میں حُسن تھا اور قدیم عمارتوں میں اُسے شان و شوکت کی جھلک دِکھائی دیتی اور وہ مسرُور ہوتا۔

وہ باقاعدگی سے گرجے جاتا تھا اور کم از کم گرجا جاتے وقت وہ بولر ہیٹ اور چھتری ضرور یاد رکھتا۔ اِس کے علاوہ بغل میں اُس دن کا اخبار بھی ضرور تھامتا۔ نہ صرف یہ بلکہ سینما کے اِختتام پر شہزادہ ولی عہد کی تصویر پر بڑے خلُوص اور اِحترام سے دونوں پَیر جوڑ کے کھڑا ہو جاتا جو مُستقبل کا شہنشاہ تھا۔ خالہ ہیرئٹ سے اِس کے

تعلُقات خوشگوار تھے۔ وہ بڑی پابندی سے والدین کو تفصیلی خط لکھتا اور زندگی کے مُتعلق خوش آیند منصُوبے بنانے میں مصرُوف رہتا۔ وہ بہت باقاعدہ اِنسان تھا۔ یہ باقاعدگی اُس نے ورثے میں پائی تھی اور اِس ورثے کا وہ کچھ دن سے اپنے کو واحد مُحافظ سمجھنے لگا تھا۔

یہ جوزف اُن عیسائیوں میں سے نہ تھا جن کے باپ دادا عیسائی تھے پچھلے دنوں وہ قحط اور بیکاری سے عاجز آ گیا تھا۔ کتنے لوگ اس قحط کی نذر ہو گئے تھے۔ پڑھے لکھے نوجوان بنگال بنگال کے نعرے مارتے پھرتے تھے اور تمام لوگ اُن سے اِتفاق کرتے تھے۔ وہ سب دردمند لوگ تھے۔ مگر وہ کیا کرتے۔ قُدرت بھی تو اُن کے خلاف تھی کبھی قحط آتا تو کبھی خلیج بنگال سے طُوفان اُٹھتے اور خس و خاشاک کی طرح بستیاں کی بستیاں اُکھڑتی اور بہہ جاتیں۔ وہ ننگے بھوکے کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہتے۔

پھر فرانسس نے صلاح کی کہ وہ عیسائی ہو جائے۔ تربیت خُشک چیزیں اور کپڑا ملتا ہے۔ سہارا تو ہو جائے گا۔ اس کے لیے اُسے ڈھاکہ جانا پڑا۔ مگر یہ سہارا بہت بڑا تھا۔ وہ کتنی بار خوفناک طُوفانوں میں بھی اپنا حصہ لینے اور نماز پڑھنے گیا تھا۔ گرجا کا پادری اُس سے خوش تھا اور وہ اُس کی مثال دیا کرتا تھا۔

یہ بیتے دِنوں کی باتیں تھیں۔ اب نہ گرجا تھا اور نہ گرجے کے

لوازمات۔ جوزف بہت بیمار تھا۔ وہ اپنے باشا کے آگے بیٹھا تھا۔ اُس کے چاروں طرف اور اُوپر بھی منظر بہت خوبصُورت تھا۔ گھٹا بڑے زور سے اُمڈی تھی۔ چاروں طرف درخت جھوم رہے تھے اور سرکنڈے جُھوئے جاتے تھے۔ مگر تاڑ ویسے ہی سیدھا کھڑا تھا۔ اُس نے ایک نظر منظر پر ڈالی مگر خوش نہ ہوسکا۔

پوکھر پر کوئی پرندہ پیٹ سے گرا اور زور سے چیخا۔ جوزف نے گردن آگے بڑھا کے دیکھا۔ وہ ڈُبکیاں کھا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اِسے بچالے مگر اُس کے اعصاب بے کار ہو گئے تھے۔ وہ اُٹھ نہ سکا اور سوچنے لگا "ناس ہو اِس کوڑھ کا۔ یہ اِرادہ بالکل پھُسپھُسا کر دیتا ہے۔ ایک زمانے میں میں بارش پانی میں ڈھا کر چل دیا کرتا تھا اور مدھو مجھے روکتی رہ جاتی تھی۔"

مدھو اُسے کچھ عیسائی ہونے، کچھ کوڑھ کی وجہ سے چھوڑ گئی تھی۔ پھر وہ فرانسس کی فکر میں پڑ گیا۔ چیچا جواب تک ڈھاکے سے نہ لوٹا تھا۔ وہ گرجے سے اپنا حصّہ لینے گیا تھا۔ اُس کی بیڑیاں بھی ختم ہو چلی تھیں۔

"طلب بھی بُری چیز ہے" جوزف نے سوچا۔

ادھر مانو اپنا لو کا کنارے پر باندھ رہا تھا۔ جوزف نے آواز دی: "اے مانو ایک بیڑی تو پھینکو۔" پر یہ مانو بڑا بدذات تھا۔ فوراً بیڑی چھپا گیا "امار پاس نا۔" ابھی جوزف کی بینائی کمزور نہیں

ہوئی تھی۔ اُس نے خود اُسے کش لگاتے دیکھا تھا۔

مانو نے جب سے جوٹ کی کاشت شروع کی تھی وہ بڑا خودغرض ہو گیا تھا۔ جوزف کو پتا تھا کہ یہ تمام جوٹ باہر جاتا ہے اور یہ خوشحالی اور دولت کا ضامن ہے۔ جوزف کوئی جاہل تو تھا نہیں۔

فرانسس واپس آیا تو نشے میں تھا۔ جوزف نے سوچا "معلوم ہوتا ہے آج کہیں ہاٹ میں کسی یار نے اِسے مُفت تاڑی پلا دی ہے۔"

تاڑی کو تو اُس کا بھی جی چاہ رہا تھا پر یہ باتیں تو عیش کی تھیں۔ اُس کے پاس تو دمڑی تک نہ تھی۔ فرانسس نہ ہوتا تو وہ بھوکا ہی مرجاتا۔ چاروں طرف مانو جیسے خودغرض لوگ تھے جو اُس کی بیماری کی وجہ سے اس سے کوسوں دُور رہتے۔

نشے میں فرانسس نے اُسے جلتی ہوئی طرف سے بیڑی تھما دی۔ وہ چلّا اُٹھا "میرے زخم دُکھتے ہیں۔ تم نے اور جلا دیے۔ دیکھتے نہیں اُنگلیوں پر۔ تم ہوش میں نہیں۔"

"دیکھتا ہُوں۔ چلو مُعاف کرو۔ مجھے دھیان نہیں رہا" فرانسس نے مستی میں کہا۔ آج وہ خوش تھا۔

جوزف کہنے لگا "فرانسس تم تو ڈھاکہ گھومتے ہو۔ کسی ڈاکٹر سے پُوچھا اِن زخموں کی کوئی دوا بھی ہے؟ ہو تو لا دو یا مجھے لے چلو۔"

اِن زخموں کی دوا اِن ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ اِن کے

پاس ہوتی تو یہ ہزاروں کو اچھا کر چکے ہوتے۔ یہ کیا جانیں۔ اِن کے پیسے ایک خاص ڈاکٹر ہے۔ میں تُمھیں بتاؤں۔ آج پادری صاحب نے گرجے میں عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کا بتایا۔ جب کوڑھ بہت بڑھا کوڑھیوں کے زخم بہت دُکھے اور اُنھوں نے تکلیف سے چیخ کے دُعا مانگی: "اے خُدا، تو ہم میں ایسا شخص بھیج جو ہماری چارہ گری کرے۔ ہمارے زخموں کو اچھا کر دے۔" تب خداوند نے کہا "اِنتظار کرو۔ تکلیف کو برداشت کرو۔ وہ آئے گا۔ وہ پیدا ہوگا۔ اُس دن کا اِنتظار کرو۔ وہ آتا ہے۔ دیکھو وہ ستارہ۔" پھر اُس کی بشارت بار بار دی گئی۔ اور وہ آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں شفا تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے کوڑھیوں نے آرام پایا اور اُس نے بیماروں کی چارہ گری کی۔ میں تُم سے کہتا ہُوں وہ آئے گا۔ نزارتھ کا عیسیٰ نہیں، چارہ گر۔ اُس کا ادنیٰ خادم عیسیٰ کی رُوح بے چین ہوتی ہے جب تُم اور تُمھارے ساتھی چلّاتے ہیں۔ وہ اُس کو ضرور بھیجے گا۔ میں بشارت دیتا ہُوں جوزف، تم اُس دن کا اِنتظار کرو۔"

قحط کے زمانے میں بنگالی آنا شروع ہُوئے تو آتے ہی چلے گئے۔ اُونچی اُونچی دھوتیاں باندھے عورتیں، لاغر بچے اور لڑکھڑاتے ہُوئے مرد۔ قافلے کے قافلے۔ لوگوں نے کراہت کھائی کیونکہ کُچھ کوڑھی بھی تھے۔ کُچھ نے رحم کھایا اور آٹا پیسے دُور سے بڑھا کر جھٹ سے

کواڑ بند کر لیے۔

آئی ٹی کالج کی نازک اندام لڑکیوں نے ناک چڑھا کے کہا "یہ بھی ایک مُصیبت ہیں۔ جدھر دیکھو چلے آرہے ہیں۔ اب طرح طرح کی بیماریاں پھیلیں گی۔"

تانگہ گزرتا رہا۔ پھر ڈسپنسری کے آگے رُک گیا۔ یہاں اُسے اپنے ہاتھ کی مرہم پٹّی کرانا تھی۔ اُس کے ہاتھ کے پھوڑے میں چیرا لگا تھا۔ روز آکے پٹّی کرانا پڑتی تھی۔ اُس کے بھائی نے اُسے ہاتھ دیا اور وہ ذرا دِقت سے تانگے سے کُود دی۔ اندر وہ چُپ چاپ بیٹھی پٹّی کراتی رہی۔ باہر نکل کر اس نے بھُوکے ننگے اِنسانوں کا مجمع دیکھا۔ کمپونڈر اُن کے مرہم لگا رہا تھا اور ساتھ ہی جھڑکیاں بھی دے رہا تھا۔ شہر میں ہیضہ پھیلا ہُوا تھا۔ یہ بھی غالباً بنگالی ہی اپنے ساتھ لائے تھے۔

پیچھے کُچھ کوڑھی کھڑے تھے جو محض بھیک مانگ رہے تھے۔ اِن میں سے ایک آگے بڑھا اور ٹُوٹی پھُوٹی اُردو میں کہنے لگا "اِن پر کوئی دوا لگا دو بابُو، یہ بہت دُکھتے ہیں۔" اُس نے اپنا ہاتھ سامنے کیا۔ دُور سے کمپونڈر نے دوا کی رُوئی پھرائی۔ بھکاری نے سسکاری بھری۔ کمپونڈر جھلا گیا "مفت کی دوا دیکھ کے پھیلتے ہیں۔ دن بھر سڑکوں پر پھرتے ہیں تب زخم نہیں دُکھتے۔ سالے بھکاری، جانے کہاں سے آگئے۔ شہر کی ہوا خراب کرنے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

ایک عورت آگے بڑھی۔ "ڈاکٹر بابُو، اِس کی کوئی دوا ہے؟"

ڈاکٹر نے ایک نظر اُس کے زخموں پر ڈالی اور کہنے لگا "اِس کی کوئی دوا نہیں۔ شہر سے باہر اِس کا اسپتال ہے۔ وہاں چلی جاؤ۔" پھر وہ کمپونڈر سے مُخاطب ہُوا: "نعیم، ذرا سی اِس پر مرکری کروم لگا دو۔"

وہ کھڑی، آنکھیں پھاڑے تماشا دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گہری سی سانس لی اور چند آنے آگے والی بھکارن کو دے کر تانگہ میں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے بھائی سے کہا: "علی اکبر بھائی کوڑھ کا کوئی علاج بھی ہے؟"

"ہاں ہے۔ شروع میں ہو جاتا ہے۔ لیکن جب زخم جسم پر ظاہر ہونے لگیں تب لا علاج ہے۔" پھر وہ کہنے لگی: "اِس کا کوئی ڈاکٹر ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔ باہر اسپتال ہے۔" علی اکبر نے اُسے بتایا۔

وہ کہنے لگی: "نہیں، میرا مطلب ہے کوئی ایسا ڈاکٹر بھی ہے جو اُن کی دلداری کرے؟ اِن سے تو بڑی نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ دیکھا نہیں آپ، نے کمپونڈر کیسا جھڑک رہا تھا۔ سارے جسم پر تو بچاروں کے زخم تھے۔ میرے ہاتھ کا زخم اِتنا دُکھتا ہے۔ اِن کے تو اتنے سارے جسم پہ ہیں۔ کتنے دُکھتے ہوں گے!" لڑکی نے تکلیف سے کہا۔

علی اکبر بولا: "ارے، کون دِلدار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تو ویسے بھی بے حس ہو جاتے ہیں۔ دن رات بیماری میں رہ کے پھر وہ بھی بچارے کیا کریں۔ بعض مریض پریشان بھی کرتے ہیں۔ جھنجھلاہٹ تو آتی ہی

ہو گی۔ جہاں تک دوا دارُو کا تعلّق ہے اپنا فرض ادا کرتے ہی ہیں۔"

لڑکی نے چڑ کر کہا: "تو نہ پڑھا کریں ڈاکٹری۔ جب پڑھتے ہیں تو تکلیف اور دُکھ کو محسُوس کرنے کے لیے دل بھی لایا کریں۔ ہر ایک کو ڈاکٹر بنانا ہی نہیں چاہیے۔ پہلے یہ دیکھا کریں کہ لڑکے کا دل نرم بھی ہے۔ بے حس تو نہیں ہے۔"

علی اکبر بھائی نے اُلجھ کر کہا: "اُونہہ، تُم تو دِیوانی ہو۔ میں اب مشورہ دُوں گا میڈیکل کالج والوں کو کہ پہلے اِن کے دل کا امتحان لینے تمھارے پاس بھیجا کریں۔ اور یہ تم اِن میں گھُسی کیوں جا رہی تھیں۔ دُور سے پیسے پھینک دِیے ہوتے۔ پتا ہے یہ مُتعدّی مرض ہے۔"

اِس پر وہ دل میں سوچنے لگی "کہتے ہیں حضرت صدّیقؓ تو اِنھیں اپنے ہونٹوں سے کھانا کھلاتے تھے۔" پر وہ علی اکبر سے کہنے لگی:

"یہ خیال اچھا ہے۔ میں تو ایسا دل کا اِمتحان لُوں کہ وہ کبھی رحم دِلی میں فیل نہ ہو۔ واقعی میرے پاس بھیجا کریں۔"

علی اکبر نے جھلا کے کہا "ہاں، چاہے ڈاکٹری میں فیل ہو جائیں۔"

لڑکی نے بُرا مان کے کہا "کیوں فیل ہو جائیں؟ وہ اَور اچھے ڈاکٹر ثابت ہوں گے۔"

"علی اکبر کہنے لگا: "دل و دماغ خُدا ساتھ نہیں دیتا۔"

وہ کہنے لگی: "کیوں، آپ کو خُدا کی سخاوت پر یقین نہیں؟ اُس کی دین ہے۔ دونوں بھی دے سکتا ہے۔"

علی اکبر نے کہا۔ "اچھا تم ہم سے بحث نہ کرو۔ تمھیں ہر بات کی دُھن ہو جاتی ہے۔"

یہاں وہ سکاٹ لینڈ سے ہفتہ بھر کی چھٹی پر آیا ہُوا تھا۔ بٹلر نے اسے احمد کا خط لا کر دیا اور کہنے لگا: "آج میں چھٹی کروں گا۔"

"کیوں؟ کسی خاتون سے ملنا ہے؟" ایڈورڈ نے ہنس کے پُوچھا۔

اس پر وہ کہنے لگا: "اِس لیے کہ آج اتوار ہے مجھے گرجا جانا ہے۔ اِس دن ہم عیسائی عبادت کرتے ہیں اور دُنیا کی عظیم ترین خاتون کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر طنز سے خفیف سا مُسکرایا۔

ایڈورڈ نے خُوش دلی سے ہنس کر کہا: "ضرور جاؤ اور یہ بھی لیتے جاؤ۔" اُس نے اُس کی طرف کچھ پیسے بڑھائے۔ شکریہ کہتے ہُوئے اُس نے نوٹ لے لیا اور ملامت آمیز نظروں سے اُسے دیکھتا ہُوا چل دیا۔ ایڈورڈ آج بھی اُس کے طنز سے لُطف اندوز ہُوا۔ آنٹ ہیریٹ اور پیٹر گرجا جا گئے ہُوئے تھے۔

پھر وہ مہاراجکمار سے پولو کھیلنے کے لیے نکل کھڑا ہُوا۔ یہ مہاراجکمار ہندوستان کی کسی ریاست سے آیا ہُوا تھا۔ اور اپنے گھوڑے ساتھ لایا تھا۔ مہاراجکمار ہرلنگھم پولو کلب کا ممبر اور مشّاق کھلاڑی تھا۔

یہاں پولو کے میدان سے ہٹ کر وہ اپنے گھوڑوں کے پاس کھڑا تھا اور ایک بوڑھے انگریز کو پولو کی تاریخ پر ہنس ہنس کے لیکچر پلا رہا تھا۔ اس بڈھے نے پولو کو "گھوڑے کی پیٹھ پر ہاکی" کہا تھا۔ مہاراجکمار کہہ رہا تھا۔

"یہ لفظ تبتی زبان کا ہے اور یہ کھیل وہیں کھیلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایران اور جاپان میں بھی رائج تھا۔ یہ خالص ایشیائی کھیل ہے۔ میری مانو' یہ دو سو برس پُرانا کھیل ہے۔ یہ لفظ اصل میں پولو بھی نہیں ہے 'پلو' ہے۔ تبتی میں اس کا مطلب گیند کا ہوتا ہے۔ انگریزوں نے اِسے ہندوستانیوں سے سیکھا۔ اِس کا پہلا مُقابلہ ۱۸۶۹ء میں یہاں ہادنسلو میں ہُوا تھا۔"

مگر بڈھا مُطمئن نہ ہُوا اور ضد کیے گیا کہ نہیں' یہ گھوڑے پر ہاکی اِن کے یہاں ہمیشہ سے کھیلی گئی ہے۔

مہاراجکمار خوش دلی سے ہنسا اور اُس نے ایڈورڈ کی طرف دیکھا۔

پھر اُس سے گرمجوشی سے ہاتھ مِلا کر کہنے لگا: "کم آن ینگ مین"

"ینگ مین مہاراجکمار سے ہار گیا۔ مگر اسے ہارنے کا ملال نہ تھا بلکہ اِتنے مشاق کھلاڑی کے ساتھ کھیلنے پر فخر تھا۔

دوبارہ کھیل میں مہاراجکمار نے اُسے لکڑی سے ٹھوکا دیا۔ "اُمید ہے تم بُرا نہیں مانو گے۔ میں تمھیں سِکھاؤں گا۔ میں ذرا بے تکلف ہُوں۔ میرے پولو سٹک پیٹھ پر مارنے کا خیال نہ کرنا۔

اِس پر وہ کہنے لگا "قطعی نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے بہت مزہ آ رہا ہے۔"

مگر وہ پھر ہارا۔ دونوں گھوڑوں کی طرف آئے۔ ایڈورڈ کہنے لگا "تُم بھی کہتے ہو گے کِس اناڑی سے پالا پڑا۔ سخت بور ہُوئے ہو گے۔ شاید میں بہترین پولو کبھی نہ کھیل سکوں۔"

مہاراجکمار کہنے لگا۔ "نہیں۔ میں تُمہارے ساتھ کھیل کے بور نہیں ہُوا۔ مجھے بہت مزہ آیا۔ ویسے یہ تُم ٹھیک کہہ رہے ہو' کہ تُم اچھے کھلاڑی نہیں ہو گے۔ مگر یہ ضروری نہیں۔ تُم اچھے ڈاکٹر بنو گے۔"

" ایڈورڈ نے خوش ہو کر کہا۔ "واقعی۔ تُمھیں کیسے معلُوم؟"

مہاراجکمار کہنے لگا: "اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

ایڈورڈ نے اُس سے پُوچھا: "تُمھیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟"

مہاراجکمار کہنے لگا: "نہیں' میں ہاتھ کی پُشت دیکھتا ہُوں۔ اب ذرا دبا کے ہاتھ مِلاؤ — ہُوں' تُم بہت اچھے ڈاکٹر بنو گے اور اگر سرجری لی ہے تو بہت اچھے سرجن ہو گے۔"

وہ پُوچھنے لگا: "مگر تمھیں یہ کیسے معلوم ہُوا؟ میں سرجری ہی پڑھ رہا ہُوں اور یہ میرا آخری سال ہے۔"

مہاراجکمار سنجیدگی سے کہنے لگا: "تُمھارا مضمون کیا ہے سرجری میں؟"

"کوڑھ" ایڈورڈ نے اُسے بتایا۔

مہاراجکمار نے اُسے غور سے دیکھا اور کہنے لگا "اچھا! مگر یہاں اِس مضمون میں کام کرنے کے مواقع بہت کم ہیں۔ تم ہندوستان آجاؤ۔"

"میرا ارادہ وہیں جانے کا ہے۔" اُس نے کہا۔

مہاراجکمار نے کہا "تم ضرور ہندوستان آؤ۔ میرے یہاں جودھ پور بھی آنا۔ وہاں ہم لوگ پولو کھیلیں گے۔ تمھیں شکار سے شوق ہے؟"

ایڈورڈ نے کہا "میں خود جودھ پور آنا چاہتا ہُوں۔ مانا کہ میں پولو میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا مگر مجھے یہ کھیل بہت پسند ہے۔ میں تم سے ایک منی پوری گھوڑا خریدوں گا۔"

مہاراجکمار ہنسا اور کہنے لگا "ضرور۔ گھوڑا تم خریدو گے تو نہیں۔ البتہ میں تمھیں تحفۃً دوں گا۔ اصل میں تمھیں پولو سے نہیں گھوڑوں سے محبت ہے۔ اِس لیے تم ایک اچھے اِنسان ہو۔ گھوڑوں کو دوست رکھنے والا آدمی نفیس ہوتا ہے۔ اور شکار؟"

ایڈورڈ کہنے لگا: "مجھے افسوس ہے کہ میں شکار میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ مجھے اس کا شوق نہیں۔ جان لینا، ایذا پہنچانا اور تڑپتے ہُوئے دیکھنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگ نہ کھیلیں۔ ہرگز نہیں۔"

مہاراجکمار کہنے لگا: "تم فکر نہ کرو۔ میں سمجھ گیا۔ تمھیں ایسا شوق نہیں ہوگا کیونکہ تم زندگی دینا چاہتے ہو۔ تم مسیحا ہو۔"

پھر وہ اُسے اپنے گھوڑے دکھانے لگا۔ ایڈورڈ کی آنکھیں کھل گئیں۔ نفیس شاندار منی پوری اور پہاڑی بارہ سے سولہ ہاتھ تک کے شاندار گرم جسموں کے توانا گھوڑے کھڑے تھے۔ ان کی گردنیں بہت حسین تھیں۔ ایڈورڈ نے محبت سے منی پوری کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا "در اصل پولو کھیل گھوڑے کی شان اور نمائش کا مظاہرہ ہے۔ واہ وا۔ بہت خوبصورت ہیں یہ۔"

پھر وہ گھر آگیا اور احمد کا خط کھول کر پڑھنے لگا۔ اُس نے لکھا تھا:—

بابا صاحب کا تبادلہ الہ آباد ہوگیا ہے۔ میم صاحب نے گھوڑے فروخت کر دیے۔ میں اب اپنے کو ادھر بھی مد فاضل سمجھنے لگا ہُوں۔ مجھے ہر وقت بے کاری کا احساس رہتا ہے۔ حالانکہ صاحب اور میم صاحب میرا بہت خیال کرتے ہیں۔ اگر تمھارا آنے کا ارادہ ہو تو مجھے لکھو۔ میں تمھاری راہ دیکھوں گا ورنہ پھر گاؤں چلا جاؤں۔ تمھاری بھیجی ہُوئی گھڑی ملی۔ میں تمھارا ممنون ہوں۔ تم میرا بہت خیال کرتے ہو۔ میں ہر دم تمھارا منتظر ہُوں۔ میری دُعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ یہ خط میں صاحب کے دفتر سے اُن کے کلرک سے لکھوا رہا ہُوں۔ مجھے انگریزی تو آتی نہیں۔ خدا حافظ!

تمھارا وفادار ملازم احمد

"بابا!" اُس کے کانوں میں ہزاروں میل دُور سے آواز آئی اور اُس کا دل رنجیدہ ہوگیا۔ پھر اُس نے احمد کے نام خط لکھا اور اپنی ماں کے لفافے میں رکھ دیا۔ خط کے آخر میں تاکید کردی کہ وہ اسے مطلب سمجھادیں۔

مُدّتوں سے علی اکبر اپنا ولایت جانا ٹال رہا تھا۔ وہ بی ایس سی کرچکا تھا اور اُس کا ایم ایس سی کرنے کا کوئی اِرادہ نہ تھا مگر محض ولایت نہ جانے کے مارے اُس نے داخلہ لے لیا تھا۔ اب ایم ایس سی بھی ہوگیا تھا۔ مگر پھر بھی ٹال رہا تھا۔ دراصل زُہرہ، اُس کی بریڑھ کی ہڈّی کا دُکھتا ہُوا مُہرہ، بُری طرح اُس کی جان کو لگی ہُوئی تھی۔

وہ یہیں لکھنؤ میں نوکری کی تلاش میں تھا۔ حالانکہ اُس کے والد نے ایک بار بھی جب وہ چُھٹیوں میں گھر گیا تھا زور دیا تھا کہ ولایت چلا جائے۔ مگر وہ اِنکار ہی کرتا رہا۔ وہ تو اب یہاں مُستقل قیام کا اِرادہ رکھتا تھا۔

نگین کی شادی کے بعد زُہرہ کی شادی کے اِمکانات کچھ کم ہوتے جارہے تھے۔ بیوی بیگم کے جلیٹھ نے ایک اَور پینترا بدلا تھا انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کا پیغام زُہرہ کے لیے دے دیا تھا۔ اور علی اکبر نے سوچا تھا "میں کس اُمید پہ یہاں بیٹھا ہُوں۔ چلو، یُونہی سہی جب میری کشتی کی قسمت میں ساحل نہیں، بیچ منجدھار ہی ہے تو اِسے یُونہی بہنے دو۔ مجھے واقعی اُس سے محبت ہے۔ کیریر ویریر اور

مُستقبل وغیرہ کیا۔ اس کی صُورت تو نظر آتی ہے۔"

پر اب وہ صُورت بھی چند دِنوں یا مہینوں کی مہمان تھی۔ زُہرہ نے بغیر چُون وچرا کے ارشد کی انگوٹھی پہن لی تھی۔ گو بیوی بیگم کو سخت رنج تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ "یہاں اِتنے دن رہا۔ زُہرہ کی طرف مُتوجّہ بھی تھا۔ کیا تھا جو پیغام بھجوا دیتا۔ آخر عابد سوتیلا ہے نا۔ یہ لڑکا مُجھے بہت پسند تھا۔"

وہ اُسے سامان سمیٹتے دیکھ کر بہت رنجیدہ ہُوئیں۔ پھر سوچنے لگیں: ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ اِتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے جارہا ہے اور جو صاحبزادے مُقدّمے کرنے کی ٹھان رہے تھے لڑکی اُن کی انگوٹھی پہنے بیٹھی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

علی اکبر بکس میں کپڑوں کی تہیں جماتے جماتے ایک ٹک رُک کے سوچنے لگا۔ "اچھا، تُمھاری مرضی۔ آج تک ہم ہی نہ سمجھ سکے کہ تُم سے کس قسم کی محبت کی جائے۔ تُم محبّت پر راضی ہی نہیں۔ ایک بار بھی جو تُم میری طرف اِلتفات سے دیکھ لیتیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ میں ایسا ویران سا کیوں جاتا۔ مُجھے کب ارمان ہے ولایت جانے کا۔ پر اب میں جارہا ہُوں اور واپس نہیں آؤں گا اِس مُلک میں، اِس شہر میں، کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ جان لو میں اِس شہر اور اِس لڑکی کا نام بھی بھُول گیا۔ یہ ارشد تُمھارا کون لگتا تھا۔ اِسے تُم کہاں سے جانتی تھیں جو انگوٹھی پہن کے بیٹھ گئیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ سب باتیں تو سرسری پر

پہلے ہی کھو دی جاتی ہیں۔ تمھاری اماں کو بھی رنج ہے۔ پر ہم انھیں کیسے بتائیں کہ یہ اُن کی لڑکی کسی لمحے محبت پر تیار نہیں ہوئی۔ جانتے بوجھتے نجان بنتی رہی۔ اِس صورت میں تو ارشد ہی پیغام بھیج سکتا تھا۔ ہم تو اُس وقت کہتے جب تُم نے کبھی ہماری نظر کا جواب دیا ہوتا۔ تُم نے تو جواب میں فوراً گھُٹتے بِلّی کی طرف دیکھا اور ہم ٹھہرے بقول تمھارے واجد علی شاہ کے جانشین۔"

بیوی بیگم تو یہ پیغام کبھی قبول نہ کرتیں مگر وہ بہت مُشکل میں تھیں۔ نگین کا پیغام واپس کرنے پر اُن کی ساری سُسرال اور باہر کے آدمی انھیں بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ اب بیوی بیگم کسی کو کیا بتاتیں کہ چچا کے بیٹے سے لڑکی بھی تو راضی نہیں تھی۔ پھر جائداد کے حصّے کے مُطالبے کا قضیہ بھی یُونہی جھکتا تھا۔ ورنہ وہ کبھی بل چھین نہ لینے دیتے تھے۔ اور یہ وکیل صاحب کے بڑے بھائی خلافِ توقع بڑے ہوشیار نکلے۔ اِس سے پہلے تو کبھی محبت آئی نا اب کے گرتے پڑتے آئے۔ کئی دن رہے اور بھائی سے پہروں تنہائی میں باتیں کیں۔ دونوں بھائی خُوب مسرت زدہ رہتے اور یہیں تک نہیں، وہ انھیں ساتھ لے کر گئے۔ ہفتہ بھر بعد جو وکیل صاحب آئے تو مت پلٹی ہوئی تھی۔ ساری محنت پر اُن کی پانی پھر گیا۔

انھوں نے ہاتھ بیچ کے سوچا "مُوا یہ بھی کوئی کردار ہُوا۔ یا تو نام نہ لیتے تھے کسی کا یا وہاں سے آکر یہ تھا کہ زُہرہ کی شادی ہو گی تو ارشد سے، ورنہ نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ بیوی ناخنوں سے گوشت جُدا نہیں ہوسکتا۔ میرا ایک ہی بھائی رہ گیا ہے۔ پھر بڑا ہے، وہ جو کہے گا میں کروں گا۔ مردانیت دکھانے پر آئے تو ایسی اُلٹی۔ اِن کا کوئی سدا سے کردار ہی نہ رہا۔ ہم نے تو شروع دن سے یہ دیکھا کہ جو جس نے پڑھا دیا، وہی پڑھنے لگے۔"

چُنانچہ وہ چل دیا۔ ماں باپ سے اُس نے اپنے آنے نہ آنے کے متعلق کچھ نہ کہا مگر دِل میں ٹھان چُکا تھا کہ اب واپس نہ آؤں گا۔

وہ آگیا تھا۔ نزارت کا عیسیٰ نہیں محض چارہ گر۔ اس کی ماں نے بڑی محبت سے اُسے پیار کیا تھا۔ باپ نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔

مگر اُس کا باپ اُس کے آنے سے تھوڑا سا ملُول تھا، وہ یہاں رہنے کو آیا تھا اور وہ محسوس کرتے تھے کہ شاید اُنھیں یہاں سے جانا پڑ جائے لارڈ ہمفری دِل گرفتہ تھے۔ جنگ کے شعلے عرصہ ہُوا کہ بھڑک چکے تھے اِس سے پہلے شہزادہ ولی عہد تخت نشین ہو کر تخت سے دست بردار بھی ہو چکا تھا۔ اب اس کا نامعقول چھوٹا بھائی، شہنشاہ جارج ششم تخت پر بیٹھا تھا۔ انگلستان کے مرغزاروں میں آگ لگی تھی اور تیزی سے لندن کی طرف، خود ان کے گھر کی طرف، بڑھ رہی تھی۔ اِس آگ میں انگلستان کے جواں سال بیٹے جل رہے تھے۔

ہندوستانی رُوٹھے بیٹھے تھے کہ اُن کی رضامندی لیے بغیر برطانیہ نے اُن کو بھی جنگ میں شریک کر لیا تھا۔ وہ بے حد ناراض تھے اور سختی سے آزادی کا مُطالبہ کر رہے تھے۔

اُنھوں نے اِس کی طرف دیکھا اور باوجود رنج اور تلخی کے، خوش دلی سے مُسکرا دیے۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تازہ تازہ،

جوان، تندرست۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ دونوں برابر کھڑے تھے۔ وہ ذرا اندھیرے میں تھے اور اس پر شفق کی سُرخ روشنی پڑ رہی تھی۔

اُنھوں نے سوچا "شہزادہ ولی عہد نے فیصلہ کر لیا ہے اِس لیے وہ یہاں رہے گا۔ ولی عہدوں کے فیصلے اٹل ہُوا کرتے ہیں۔"

ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر مُسکرائے اور وہ اپنے مُستقبل، اپنی تقدیر اور اپنی نئی نوکری پر روانہ ہو گیا۔ لکھنؤ ہسپتال میں اُسے چند مہینے کام کرنا تھا۔ اِس کے بعد مدراس کوڑھ کے ہسپتال میں جانا تھا۔ بعد ازاں جہاں بھی اس کی ضرورت ہوگی۔

پھر وہ اِس سوتے ہُوئے شہر لکھنؤ میں آیا۔ چند دن سرمورس کے یہاں رہا اور پھر ہسپتال سے ملے ہُوئے گھر میں آرام سے آباد ہو گیا۔ احمد اُس کے ساتھ تھا اور وہ ایک دم بہت اہم ہو گیا تھا۔ بڑا ڈان فوج میں میجر تھا اور اِن دنوں مع اپنی بیوی کے لاہور چھاؤنی میں مقیم تھا۔ سرمورس اُس کی طرف سے فکرمند تھے کہ معلوم نہیں کس وقت اُس کا بُلاوا محاذ سے آجائے۔

سرمورس اُس سے اپنی بھوری بھوری مُونچھیں ہلا ہلا کر لندن کا حال سُنتے رہے۔ وہ ابھی مہدی منزل نہیں گیا تھا کیونکہ علی وہاں نہ تھا۔ مگر اُس نے لکھا تھا کہ جلد اُس کا تبادلہ ہونے والا ہے۔ یہاں اسپتال میں اُس کی مُلاقات ایک اینگلو انڈین لڑکی کیتھرین سے ہُوئی۔ اُسے یہ لڑکی اچھی لگی۔ اس کے دوغلے خون نے اِسے بڑا دِل کش

بنا دیا تھا۔

وہ کیتھرین سے اکثر ملتا تھا۔ کیتھرین کو بھی یہ نووارد انگریز ڈاکٹر اچھا لگا۔ کیونکہ یہ اینگلو انڈینوں کو نہ حقیر سمجھتا تھا اور نہ محض تفریح کا ذریعہ۔ وہ اِن سے برابری سے ملتا تھا۔ کیتھرین کے نرم بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہُوئے تھے اور اِس میں سے شنیل کے یوڈی کلون کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

کیتھرین نے ذرا اور قریب کھسک کے اُس سے پُوچھا "تم سارجنٹ میجر روبرٹ ہلٹن کو جانتے ہو؟ اُسے اینگلو انڈینوں سے بڑی نفرت تھی اور اُن پر ترس بھی کھاتا تھا۔"

وہ کہنے لگا: "میں کسی سارجنٹ میجر کو نہیں جانتا اور نہ مجھے کسی سے نفرت ہے۔ میں میجر مورس کو جانتا ہوں جو میرا دوست ہے، اور جو آج کل لاہور میں ہے۔"

اِس پر وہ کہنے لگی: "مُعاف کرنا۔ میں میجر مورس کی نہیں ہلٹن کی بات کر رہی تھی۔ خیر، تم تو اُسے جانتے ہی نہیں۔ خود تمھارا خیال کیا ہے ہم لوگوں کے مُتعلق؟"

وہ کہنے لگا: "میرا کوئی خیال نہیں ہے۔ تم ہماری جیسی اِنسان ہو بلکہ شاید ہم سے بہتر ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تم میں دونوں قوموں کی خُوبیاں آ گئی ہوں۔ تم مزاج اور شکل کے اِعتبار سے بڑی دلچسپ ہو۔ باقی رہی یہ بات کہ اینگلو انڈینوں میں کیا خرابی ہے تو اُنھوں نے

بس ذرا اپنی ذہنیت خراب کر لی ہے۔ اِسی مُلک کو اُنھیں اپنا مُلک سمجھنا چاہیے۔ یہ بڑا کشادہ اور اچھا مُلک ہے۔ پیدائش میں اولاد کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ میرا تو اس مُعاملے میں کچھ اور ہی خیال ہے۔ مگر شاید تم سمجھ نہ سکو۔"

وہ کہنے لگی: "نہیں تم مجھے بتاؤ۔ میں سمجھوں گی۔"

"میری منطق اِس بارے میں قطعی اُلٹی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک مُلک کے لوگ دوسرے مُلک میں شادیاں کریں تو بین الاقوامی بھائی چارہ قائم ہو جائے۔ یہ تمام جنگیں نفرت اور حقارت ہی کا تو نتیجہ ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جرمن ہمارے خلاف ہتھیار نہ اُٹھاتے۔ غور تو کرو، وہ ہمارا ہمسایہ مُلک ہے۔"

وہ کہنے لگی: "میرے خیال میں تمھاری منطق صحیح ہے۔ تُم ٹھیک کہتے ہو۔"

وہ دونوں چُپ رہے۔ پھر کیتھرین کہنے لگی: "تم بہت پیارے ہو۔ آج تک میں جتنے لوگوں سے ملی اُن سب سے تم اچھے ہو۔"

وہ جُھکا اور اُس نے کیتھرین کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ تب اُس نے اپنے ہاتھ اُس کے جسم کی طرف بڑھا دیے اور اُس کے جسم کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دونوں قریب ہُوئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ محزون تھے۔ ایڈورڈ کو تنہائی کا احساس تھا، کیتھرین سے لوگ حقارت سے پیش آتے تھے۔ اُسے احساسِ کمتری

تھا اور وہ یگانگت اور تسکین کے لیے ایک دُوسرے سے لپٹے۔
اُس نے مسہری کے پردے ڈال لیے اور سرہانے کی روشنی گُل
کردی۔

باہر شبنم رات کی تاریکی میں جگہ جگہ ضائع ہوتی رہی۔ ایڈورڈ کو بھی
اپنے ضائع ہونے کا احساس ہُوا۔ اُس نے سوچا "میں یُوں کب تک
ضائع ہوتا رہوں گا؟"

ایک بار پھر اس نے کیتھرین کو اپنے بازوؤں میں لیا۔ اُس وقت
اُسے شدید تنہائی اور تشنہ کامی کا احساس ہو رہا تھا۔

اور یہاں بُدھ کے پیروؤں کی خانقاہ بڑے پُراسرار اندھیرے میں
لپٹی ہوئی تھی۔ یہاں کہیں دُور دُور بجلی نہ تھی کہ اس بلسلی اور گھنے
درختوں کے اندھیارے میں جھلملاتی۔ وہ نارنجی لباسوں میں ملبوس
امن سے بیٹھے بھگتی کی باتیں کر رہے تھے۔ نیچے سے آئی ہُوئی خبروں
پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا۔

مگر بُدھ کے اِس پیرو کو جو ٹھیک سے ابھی بُدھ کے ارشادات
سمجھا بھی نہ تھا بےچینی اور کھوج تھی۔ باتیں کرتے کرتے یک لخت اُسے
اُس بھکارن کا خیال آیا اور وہ بےچینی سے اُٹھ کے دریا کی سمت آگیا۔
نیچے دریا کا پاٹ وسیع تھا۔ اُوپر مٹی کے پہاڑوں پر جنگل گھنا اور
سرسبز تھا۔

اُس نے ایک نظر دریا پر ڈالی اور سوچنے لگا "یہ دریا کتنا چوڑا
ہے" اور پھر نیچے اُترتا چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے تھم کے سوچا "میں
کس سمت روانہ ہو رہا ہُوں؟ اور ایسا کیوں کر رہا ہُوں؟ کیا مُجھے
محبت تھی یا محض کھوج؟" مگر وہ چلتا رہا اور کُچھ نہ سمجھ سکا۔

ایک رات ایک دن وہ بنا مقصد چلتا رہا — کس کو پُوچھتا کیا
پُوچھتا؟ محبت تھی یا کھوج' یہ بھی تو معلوم نہیں تھا اُسے۔ پیچھے خانقاہ
میں امن چھوڑ کے وہ دُکھ اور پریشانی کی دُنیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔
وہ کون تھی؟ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔

کچھ رستا اُس نے پیدل طے کیا کُچھ دریا میں پیر کے اور اب وہ
نوکے میں بیٹھا تھا۔ ملاح نے چپّو اعتماد اور یقین سے اُٹھائے۔ وہ
ضرور اُسے پار کرے گا اور کشتی کنارے تک پہنچ جائے گی۔ ملاح نے
گیت چھیڑا: "پانی سے ڈرنے کی کیا بات ہے۔ موت ہر طرح آئے گی
دھیرے دھیرے بڑھے جا بڑھے جا۔ جلدی نہ کر آہستہ آہستہ سویرا
ہوتا ہے اور نیا دن طلوع ہوتا ہے۔ وہ دن ضرور آتا ہے جس کا انتظار
ہو۔ وہ دیکھو مجھے ساحل نظر آتا ہے۔"

بُدھ کے بےچین پیرو کو چین نہ تھا اس لیے وہ ملاح کا گیت
نہ سمجھ سکا۔ وہ اب یہ سمجھنا چاہ رہا تھا کہ محبت کیا شے ہے۔
کھوجتے کھوجتے گھومتے گھومتے وہ اُس کی باشا کے آگے کھڑا
ہُوا جہاں کبھی وہ رہی تھی اور جہاں اب جوزف رہتا تھا۔

جوزف نے اُسے دیکھا اور فرانسس سے پُوچھا "کیا یہ وہی ہے جس کا اِنتظار کیا جا رہا ہے؟ شاید وہ آگیا! اِسی کی بشارت دی گئی تھی؟"

فرانسس نے ایک ٹک اُس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: "جوزف، تم بتاؤ۔ تمھیں اِس کی ضرورت ہے؟ جو تمھارا دِل کہے گا وہ صحیح ہوگا"

جوزف نے گوتم بُدھ کے پیرو سے پُوچھا: "کیا تم وُہی ہو؟"

پیرو نے کہا "اُس کی صفات بیان کرو۔ اُس کی صفات کیا ہیں؟ اگر وہ مجھ میں موجُود ہوں گی تو میں وُہی ہُوں گا"

جوزف نے کہا "ہم اُس کی کوئی صفت نہیں جانتے۔ ہم صِرف اِتنا جانتے ہیں کہ ہمیں ایک چارہ گر کا اِنتظار ہے۔ کیا تم زخموں پر پھاہے رکھ سکتے ہو؟"

گوتم بُدھ کے پَیرو نے کہا "نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں صِرف سوچتا ہُوں اور بہت سے لوگوں کی فکر خصُوصاً بُدھ کی، مجھے سمجھائی جا رہی ہے اور نروان کے حصُول کے لیے ہم سب کوشاں ہیں"

جوزف نے کہا "تب تم وہ شخص نہیں ہو۔ ہم نروان کیا کریں۔ ہمیں بیماری نے کب کا نروان دلوا دیا ہے۔ ہم تو سمجھے تم وہی شخص ہو۔ ہم تو پہلے ہی دُکھیا تھے۔ تم نے اَور دُکھ پہنچایا۔ تم کس کی تلاش میں آئے ہو؟"

وہ کہنے لگا "مجھے کسی بات کے مُتعلق کُچھ نہیں معلُوم۔ شاید میں بھی اُسی کی تلاش میں آیا ہوں۔ اب تو مجھے ایسا ہی خیال پڑتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مجھے لَوٹ جانا چاہیے۔

راستے میں وہ سوچنے لگا "وہ شخص کون ہے جِن کا اِنھیں اِتنا اِنتظار ہے! شاید وہ محبت ہو۔ شاید وہ امن ہو یا شاید وہ مقصد ہو۔ ہوسکتا ہے وہ مہاتما بُدھ خود ہو یا شاید وہ عیسیٰ ہو"

اُوپر چڑھتے ہُوئے اُس نے سوچا "مجھے بھی اُس کا اِنتظار کرنا چاہیے تھا" گوتم بُدھ کے بے چَین پَیرو کو چَین نہ نصیب ہُوا۔ وہ ایک اَور اُلجھن میں پڑ گیا۔

کپتان راؤ ارشد علی خاں میس میں سٹرڈے نائٹ منا رہا تھا اور روز مرّہ سے زیادہ پی رہا تھا۔ پیچھے سے میجر مورس نے اُس کے کندھے پر تھپکی دی جس میں مزید نہ پینے کی طرف اِشارہ تھا۔ وہ جلدی سے گھُوما اور میجر کے سامنے آگیا۔

"ہلو اولڈ بوائے" میجر نے کہا اور اُس کی منگنی پر مُبارکباد دی۔ اُس نے ہنس کر شکریہ ادا کیا۔ اُس کی انگوٹھی کا نگینہ مَیس کی تیز روشنیوں میں ماند پڑ گیا تھا اور اُس کے چہرے سے اُداسی جھلک رہی تھی جسے میجر نے محسُوس نہیں کیا۔ میجر نے اُس سے کہا کہ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو اُن کے یہاں لے کر آئے۔ مسز مورس میس کی رات میں شریک نہیں تھیں کیونکہ چند دن ہُوئے اُن کے ہاں بچّہ پیدا ہُوا تھا۔

ارشد نے آج پہلی بار میجر کو غور سے دیکھا تھا۔ یہ انگریز افسر ہندوستانی

افسروں کو قطعی مُنہ نہ لگاتے تھے۔ لیکن براؤن کچھ بے فکر سا تھا۔ ویسے بھی اِس جنگ نے ہوش مند انگریزوں کو مصلحتہً ہندوستانیوں کے قریب کر دیا تھا۔ پھر براؤن پنجاب کی اُس رجمنٹ سے تعلق رکھتا تھا جس کا جنرل آکنلیک تھا، جسے اپنے ہندوستانی سپاہیوں سے محبت تھی۔

ارشد ڈنر سُوٹ میں خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔ شاید اِس لیے کہ وہ کم عُمر نہ تھا۔ اُس نے کمیشن دیر سے جوائن کیا تھا یا شاید اِس لیے کہ ہر وقت محاذ پر جانے کا اندیشہ تھا۔ یا ہو سکتا ہے مختلف وقتوں میں بہت سی لڑکیوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اِس میں اِضطراب اور انجانی خوشی کا اِحساس ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، وہ شاد نہ تھا۔ اس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئیں مگر اُس کو کسی سے محبت نہ ہو سکی۔

اُسے اِس منگنی سے کچھ کوفت سی ہو رہی تھی۔ ایک سال پہلے اُس کے ابّا اُس سے اِسی لڑکی کے باپ پر مُقدمہ دائر کروانے کی فکر میں تھے۔ وہ نجانے کیا سوچ کر چپ ہو گئے تھے۔ اور اب وہ اِس کی شادی کر رہے تھے۔ اُس کے دل میں چچا کے خلاف کدُورت تھی جنھوں نے اُس کا اور اُس کے باپ کا حصّہ دبا لیا تھا۔ پھر وہ جب منگنی کرنے گیا تھا تو اُسے لڑکی میں بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی۔

وہ بڑا بیٹا تھا اور بڑے ناز و نعمت میں پلا تھا۔ جب بے پروائی اُس کی طبیعت میں رچ بس گئی تو ایک دم اُس کے ابّا نے اُسے ذمّہ دار قرار دے دیا۔ اُسے اپنی تینوں بہنوں کی شادی بھی کرنا تھی جو اِس سے

جا و بے جا توقعات رکھتی تھیں۔ اِن تمام ذمّہ داریوں اور بڑے ہونے کے باوجود اُس کی شخصیت اپنے چھوٹے بھائی کے آگے دب جاتی تھی۔ ارشد نے دو سال ایف۔ ایس۔ سی میں ناکام ہونے کے بعد کمیشن جوائن کیا تھا اور اُس کا چھوٹا بھائی انور ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ولایت میں اور آگے پڑھ رہا تھا۔ وہ تو چیا بتا کرتا تھا۔ ارشد کو اپنے بھائی سے تھوڑا سا حسد تھا، مگر خود اُس کا خیال تھا کہ اُس کا چھوٹا بھائی اُس سے حسد کرتا ہے۔ چھوٹے بھائی کا خیال آتے ہی اُسے مزید کوفت ہوئی اور وہ کپتان اکمل کی خوبصورت بیوی کی طرف متوجّہ ہو گیا۔

رات کی سیاہی سفیدی میں ڈھل رہی تھی تب ارشد کو میس سے نکلتے ہوئے اُس لڑکے کا خیال آیا جو اس کے وہاں پہنچنے پر سامان سمیٹ رہا تھا۔ وہ اُس لڑکی کی طرف سے شک و شبہ میں پڑ گیا۔

اور یہ علی اکبر بھی خُوب تھا۔ یا تو اِتنا کاہل تھا یا مُلکوں مُلکوں پھر رہا تھا۔
ولایت سے وہ یہاں آگیا تھا اور سخت سوشلسٹ خیالات کا حامی ہوگیا تھا۔
مسجدوں، کلیساؤں اور مندروں کے یکسر خلاف تھا۔ وہ مذہب تو مذہب
محبت تک کے خلاف بھی بڑا سخت پرچار کر رہا تھا۔ وہ لوگوں سے کہتا
تھا:۔
"محبت بھی ایک قدیم مذہب ہے۔ یہ محض کاہل ذہنوں کی تخلیق
ہے۔ خیال کی کوئی بنیاد نہیں۔ محبت عمل کو مفلوج کرتی ہے۔ اِس
زنجیر کو بھی توڑ دو۔ دوستو، بھائیو، آگے بڑھو۔ کام کرو۔ محبت مذہب،
اقدار اور ایسی تمام چیزوں کو ختم کر دو۔ نظامِ کُہنہ کو توڑ دو اور سُرخ
روشنی کی طرف بڑھو۔"
اور یہ وہ کہہ رہا تھا جو کاہل تھا۔ انڈر گراؤنڈ سختیاں جھیلتا ہُوا وہ
عجب مسخرہ لگ رہا تھا۔ ابھی چند دن ہُوئے وہ جیل سے چھُوٹا تھا۔ مگر
اُسے کسی بات کی پرواہ ہی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ جماعت تھی۔ وہ
اب اکیلا نہ تھا۔ ہر راہ اور ہر موڑ پر اُسے ایک عورت مِلتی تھی جو
اُس کی محنت، اُس کے خلوص اور اُس کے رویّے کی پرستش کرتی

تھی۔ مگر وہ اُسے بھی یہی سمجھاتا تھا:
"جذبات کی رَو میں نہ بہو۔ ہر چیز جماعت کے گرد گھُومتی ہے۔
جماعت میں بڑی قوّت ہے اور جماعت افراد پر مشتمل ہے۔ محض ایک
شخص پر دھیان نہ دو۔ فردِ واحد کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرے بعد اَور بھی
آئیں گے۔ وہ آتے رہیں گے کیونکہ کام جاری رہے گا۔"
وہ اپنی تنہائی کے لمحوں میں اُنھیں بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے ہونٹ
اُن کے ہونٹوں میں پیوست کر لیے ہر جگہ، ہر وقت یہی کہتا تھا۔ اُسے
دُھن ہو گئی تھی۔ کھُردرے کپڑے، بڑھے ہُوئے بال، اُلجھی ہوئی ڈاڑھی،
کھوئی کھوئی آنکھیں۔ یہ علی اکبر تھا جو مزید سفر کر رہا تھا۔

وہ جودھ پور آیا اور اِتنے سارے گھوڑے دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔ مہاراجہ کمار
جودھ پوری لباس میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور کہنے
لگا، "مجھے معلوم تھا تُم آؤ گے۔ یہ تُم نے بہت اچھا کیا۔ مجھے اُمید
ہے بلکہ یقین ہے کہ بیمار تمھارے ہاتھوں سے آرام پائیں گے۔"
ایڈورڈ نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کی سیاہ آنکھوں کی طرف
دیکھنے لگا جو اُس کے آنے کی خوشی میں چمک رہی تھیں اور جو جنگ
اور ہندوستان کی سیاسی اُلجھنوں سے بے نیاز تھیں۔ وہ دوست تھا،
مہمان نواز تھا، سخی تھا اور پولو کا شائق تھا۔ اُس کے پیچھے شاندار تاریخی
پس منظر تھا لیکن وہ اِس سے بھی بے نیاز تھا۔ یہاں اُس کے اصطبلوں

میں خوبصورت سڈول جسموں کے آسامی، منی پوری، ہمالین اور بہاڑی گھوڑے تھے۔ یہ پہاڑی نسلیں اُس کے خاندان نے خود بنائی تھیں اور پشتوں سے یہ انھیں پالتے آئے تھے۔ وہ بغیر کسی دقت کے مہاراجکمار کے بہترین منی پوری پر سوار ہُوا اور اُس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ گھوڑے نے اُسے اپنی پشت پہ خوش آمدید کہا اور بڑی سُبک روی سے کینٹر میں چلنے لگا۔

اِتنے بہت سے گھوڑوں کو خاموشی سے سر جھکائے کھڑا دیکھ کے اُس کے ذہن میں سینٹ جون، اور سینٹ انتھونی جیسے حلیم الطبع درویشوں کا تصور اُبھرا تھا۔ اُس نے سوچا تھا "نزارت کے عیسیٰ اور خُدا کے آگے وہ ایسے ہی اطاعت سے سر جُھکاتے ہوں گے۔"

مہاراجکمار نے اُس کے ساتھ پولو کھیلی اور جان کے ہار گیا۔ ایڈورڈ نے ہنس کر کہا "مگر یہ تمھاری فتح تھی اور میری شکست۔ میں تمھاری مہمان نوازی کے احسان تلے دب گیا۔"

مہاراجکمار بھی ہنسنے لگا۔ اُس نے کہا "ارے نہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ محض خوش ہونے کے لیے خوش ہوتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔"

اِس پر ایڈورڈ کہنے لگا: "مگر میں خوش باش اِنسان نہیں ہُوں۔ اِسی لیے شِکار میں تمھارا ساتھ نہیں دے پاتا ہُوں ——"

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ مہاراجکمار نے کہا "تمھیں دُکھ کا

اِحساس ہے۔

ایڈورڈ نے دھیرے سے کہا "شاید"۔ پھر وہ چائے پینے کو محل میں آ گئے۔

دو تین دن رہنے کے باوجود بھی ایڈورڈ اُس کے متعلق کچھ جان نہ سکا حالانکہ وہ جاننا چاہتا تھا۔ مہاراجکمار کا باپ مر چکا تھا۔ ماں بوڑھی تھی۔ دو بھائی ولایت میں پڑھ رہے تھے اور غالباً بہن کوئی نہ تھی۔ وہ اب تک غیر شادی شُدہ تھا (حالانکہ ہندوستان میں شادیاں جلدی ہوتی تھیں خصوصاً ہندوؤں کی) ایڈورڈ نے سوچا، مگر وہ باوجود کوشش کے یہ نہ جان سکا کہ اُس نے اب تک شادی کیوں نہ کی تھی اور یہ کہ کیا اِس نے کبھی محبت کی تھی یا نہیں۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے سوالات کو ٹال دیا کرتا تھا۔

مہاراجکمار باجگزار تھا۔ اُس کے اختیارات حکُومت نے عرصے سے چھین لیے تھے۔ اس کی جاگیر سُکڑ گئی تھی۔ مگر اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ وہ بہت بے تکلف دوست تھا، مگر ایڈورڈ باوجود کوشش کے اُس سے بے تکلف نہ ہو سکا۔ اُس نے ایڈورڈ کو تحفتاً ایک منی پوری گھوڑا دیا جس کا نام ایڈورڈ نے عرب کی ایک نسل پر شریف السرج رکھا۔

ایڈورڈ نے اُسے رکونو کی ایک چھوٹی سی سیپ کی ٹرے اور ایک پُرانی پینٹنگ دی۔ وہ بہت خوش ہُوا اور بار بار سراہتا رہا۔ حالانکہ اُس کا گھر بیش قیمت نوادرات سے پُر تھا۔ ایڈورڈ نے سوچا:

یہ بھی مہمان نوازی کا ایک طریقہ ہے۔
مہاراجکمار کے گھوڑے اور مہاراجکمار کا پولو میں جان کے ہارنا اُس کے دماغ میں محفُوظ ہو گیا۔ وہ ہارتے وقت دُھوپ میں بڑا ہی خوبصُورت لگ رہا تھا۔"
دراصل حُسن انسان کی اپنی ذات میں ہوتا ہے۔" ایڈورڈ نے سوچا۔

علی آگیا تھا مگر وہ سب کسی شادی میں جا رہے تھے۔ علی نے ایڈورڈ سے کہا "تُم بھی چلو۔"

ایڈورڈ کو ہندوستانی شادیاں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اُسے یہاں کی رسمیں بہت پسند تھیں۔ اُسے توستی کی رسم تک پسند تھی۔ ایک بار اُس کا جی مچلا اور جانے کو سوچنے لگا۔ مگر باوُجود علی کے اصرار اور جی چاہنے کے اُس کے دل نے منع کیا۔ اور اُس نے اِنکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا: "میرا بُلاوہ نہیں۔ بُرا لگتا ہے ایسے جاتے۔"

اِس پر علی کہنے لگا: کمال کرتے ہو۔ کوئی غیر جگہ تو نہیں ہے۔ اور نہ تُم سے تکلّف ہے۔ نگین کی بہن کی شادی ہے۔ تُم نگین سے ملے؟

پھر اُس نے نگین کو بُلوایا۔ علی کی بیوی کو دیکھ کے وہ خوش ہُوا مگر جب وہ واپس جانے کو مُڑی تو اُس نے محسُوس کیا کہ اُس کی شخصیت کسی اور شخصیت میں بدل گئی ہے، جو اُس کی جانی پہچانی

تھی۔ ایک لمحے کو وہ چونکا۔ اُس نے اپنے اندر تڑپ سی محسُوس کی مگر یہ اِحساس پلک جھپکنے سے زیادہ نہ تھا۔
ایڈورڈ نے سوچا شاید رنج مجھ میں پہلے سے موجُود تھا۔ پھر علی نے اُسے اپنے پھُوپی زاد بھائی بیرسٹر جان عالم اور اُس کی بیوی شاہ زمانی بیگم سے بلوایا جو بہت خُوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ اُس نے اِسے بڑے ٹھسّے سے دیکھا اور ادا سے مُسکرائی۔ وہ ذرا سا جھینپا، تھوڑا سا سُرخ ہُوا اور پھر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ نرم نرم آواز میں اُس سے باتیں کہنے لگی۔ ایڈورڈ کو محسُوس ہُوا کہ وہ بڑی اچھی انگریزی بول رہی ہے۔ مگر وہ اکثر جواب اُردو میں دیتا رہا۔
اُس نے اُس کے حُسن کو بہت سراہا اور سوچنے لگا "یہ حُسن، یہ جمال، یہ خمیدہ سیاہ زُلفیں۔" اُس نے اُس کے پیروں پر نگاہ ڈال کے چپکے سے دل میں کہا "اور یہ نازک نازک پاؤں" اُس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی اور کانوں کی لویں گرم ہو گئیں۔ اِس وقت وہ جھلک اُس کے ذہن سے اوجھل ہو گئی اور رنج کا تاثر وقتی خُوشی میں بدل گیا۔
پھر علی اُسے دادی امّاں کے پاس لے گیا۔ "دادی امّاں، یہ ایڈورڈ آیا ہے۔ یاد ہے آپ کو؟ پہچانتی ہیں؟ اب آپ اِس سے بھی پردہ کریں گی؟"

دادی امّاں کہنے لگیں: "اے ہے، کہاں پردہ کر رہی ہُوں۔ کیوں نہیں پہچانتی۔ ابھی کل کی بات ہے، یہیں بیٹھا آم کھا رہا تھا۔

ماشاء اللہ جوان ہوگیا۔"
دادی اماں نے اسے دُعائیں دیں، شفقت کا اِظہار کیا اور ایڈورڈ نے دادی اماں کی شفقت کا یقین کیا۔

پھر وہ جانے کو کھڑا ہوگیا۔ وہ سب بھی جا رہے تھے۔ باہر نکل کر اُس نے مہدی منزل کے سرسبز باغ کو دیکھا اور سر جھکا کے موٹر سٹارٹ کرنے لگا۔ سڑک پر آکے اُس نے شہنائی کی آواز سُنی۔ یہ آواز اُس نے اکثر سُنی تھی اور اسے سُن کر اُسے مسرت ہوتی تھی۔ پر آج نجانے کیوں اِس کی آواز سے اُس کا دل ذرا سا ڈوبا، وہ رنجیدہ ہُوا۔ وہ جھلک ذہن پر پھر اُبھری۔ آج کا دن، اُس نے حساب لگایا، اُداسی کا باعث ہُوا۔

اور ایڈورڈ کو کیا معلوم تھا کہ جس شادی کی شہنائی سُن کر وہ اُداس ہُوا تھا اِس شادی میں بڑی اُلجھنیں تھیں۔ فریقین کے دل صاف نہ تھے۔ نکاح سے پہلے ہی اُنھوں نے جائداد کا تصفیہ کروالیا تھا اور مُقررہ حصّے سے زیادہ لیا تھا۔ بیوی بیگم کو جلیٹھ اور بیٹی کے کے علاوہ ارشد کو داماد بنا کے ایک اَور حِصّہ بھی دینا پڑا۔ وہ تو ایسا کبھی نہ کرتیں، خود وکیل صاحب اَڑ گئے اور پہلی بار میاں بیوی کے درمیان کوئی معقول جھگڑا ہُوا۔

اِس کے علاوہ جیٹھانی نے دیورانی کو بے نقط سُنائیں اور زندگی بھر کے بدلے چُکائے۔ بیوہ دیورانی نے گڑے مُردے اُکھاڑے اور

اپنے لڑکے کے پیغام (جو اُنھوں نے کئی سال پہلے نگین کے لیے دیا تھا اور جو رد کر دیا گیا تھا) کا قصّہ مہمانوں کو سُنایا۔

دُلہن اور دُلہن کی ماں بہنوں کی کافی سُبکی ہُوئی۔ دُلہن کی بہن اپنی سُسرال میں خفیف ہُوئی۔ دُلہن کا دل پریشان اور جی اُچاٹ رہا اور دُولہا مُنہ بنائے اُسے ایسے اُٹھا کے لے گیا جیسے کوئی بِن مانگی مُصیبت یا فضُول کا بوجھ ہے۔

دُلہن ایک صُوبہ لانگھ کے دُوسرے صُوبے میں جا رہی تھی۔ اُسے اس کا بھی قلق تھا۔ اِس سے اُس کی ساس نندوں نے راستے بھر بات نہ کی تھی۔ اُس کی زندگی کا آغاز اُس کے میاں لے ایک طعنے سے ہُوا تھا۔ جسے اُس نے اپنے دل پر لکھ لیا تھا۔ ارشد نے اُس سے کہا تھا "کیا علی اکبر کی کوئی جائداد نہ تھی۔ یا اُس نے خُود انکار کر دیا تھا؟"

اِس پر اُسے بہت تاؤ آیا مگر وہ غم کھا گئی اور رنج سے سوچنے لگی: "یہ علی اکبر کا کیا ذکر تھا۔ یہ سراسر کمینہ پن ہے۔ وہ غریب کسی بیچ میں بھی ہو۔ اِس کا کیا موقع تھا!"

پھر کچھ دیر بعد وہ سامان کی بے ترتیبی پر اُلجھا اور سارے سفر میں دُوسری بات اُس نے یہ کہی کہ "منجھلی چچی نے چھوٹی چچی کے ساتھ شرُوع سے بڑی زیادتی روا رکھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ منجھلے چچا سدا زن مُرید کیوں بنے رہے۔ خود قانون پڑھا تھا۔ دُوسروں کے حقُوق کی حفاظت کرتے رہے پر اپنے مرحُوم بھائی کے یتیم بچّوں اور

بیوی کے حقوق کا کبھی خیال نہ آیا۔"
اسے اِس پر بھی تاؤ آیا مگر وہ پھر غم کھا گئی۔ اِس میں شک نہیں
اُس کی ماں نے بہت زیادتی کی تھی۔ اُس کے باپ نے کسی بلند کرداری
کا مُظاہرہ نہ کیا تھا۔ وہ خود مانتی تھی۔ اُسے اِس بارے میں اپنے
ماں باپ سے شکایت تھی۔ مگر یقیناً یہ صلاح اُس نے انھیں نہ
دی تھی۔ اِس کا ذکر اُس سے کرنا چھچھورا پن تھا۔

اُس کے دل میں اِس شخص کی طرف سے کدُورت آ گئی تھی،
جسے اُس نے ابھی برتا نہ تھا۔ وہ جیسے بھی تھے، اُس کے ماں
باپ تھے جن کے مُتعلق اِس بچارے علی اکبر نے کہا تھا "والدین
کی محض عزت اور خدمت کرنا چاہیے"۔ اُسے اپنے ماں باپ کی
اِس کی زبان سے بُرائی سُن کر غصّہ آیا۔ پھر وہ رنج سے عیسائیوں
کے اِس مقولے کے مُتعلق سوچنے لگی کہ باپ کا گُناہ بیٹا بھگتتا ہے
ہے۔ عیسیٰ آدم کے گُناہ کی خاطر سُولی پر چڑھا۔

اُس نے سوچا "چونکہ میرے باپ کا کوئی بیٹا نہ تھا اور میں بڑی
اولاد ہوں اِس لیے سُولی پر چڑھنے جا رہی ہوں"۔ اُس کا دل بہت گھبرا
رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی "یہ قیدِ بامشقت ہے جو مجھے میرے باپ
کے گُناہ کی خاطر دی گئی ہے۔ پتا نہیں یہ کیسے کٹے گی"۔

مگر اِس کدورت کے باوجود اُس نے اُسے دیکھا اور دل میں
کہنے لگی "ویسے یہ بڑا خوش شکل ہے۔ اِس کی طبیعت کی سختی اِس کے

چہرے پر نہیں ہے۔ مگر اِس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ہیں۔ خیر یہ
اُس کی ذاتی تلخیاں ہیں جس کا تعلق اُس کی اپنی زندگی سے ہے۔
پھر اُس نے اُلجھ کر اُس کے ہاتھ ایک طرف ہٹا دیے۔ اِس نے اُس
کے ہاتھوں کی سختی محسوس کی اور دل میں سوچنے لگی، اچھا ہُوا یہ ڈاکٹر
نہ بنا۔ یہ مریضوں کی پٹائی کیا کرتا۔

اُس کا جی بے حد گھبرا رہا تھا اور کہیں جانے کو چاہ رہا تھا۔
براؤن لاہور میں تھا اور یہاں مہدی منزل میں کوئی نہ تھا۔ علی اور نگین
تشکا [illegible] گئے ہُوئے تھے اور جانِ عالم شبیر صاحب کے ساتھ کہیں باہر
نے [illegible]بیر صاحب کی بیوی اندر تھیں اُس نے گھنٹی بجائی۔

نشست کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ ایک دم اندر کی جانب
بڑھا۔ شاید کسی نوکر نے دروازہ کھولا تھا۔ اُس نے بتی نہیں جلائی
بلکہ کونے کا بڑا لیمپ روشن کیا جس کی خوابناک روشنی میں ایڈورڈ
نے اُسے دیکھا۔ شاید وہ نہا کے نکلی تھی۔ اُس کے بال کھُلے ہوئے
تھے اور اُن میں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اطلس کے
ڈھیلے پاجامے کے پائنچے اُٹھائے ہُوئے تھی اور اُس کی پنڈلیاں
نظر آ رہی تھیں۔ باریک آبی رنگ کا دوپٹا جس کے کناروں پہ پتلی
روپہلی چٹکی ٹکی ہوئی تھی، اُس کے شانوں سے نیچے تک پڑا ہُوا
تھا مگر اِس میں سے بھی بغیر بنیان کے آبی کُرتے میں سے اُس کا

شفاف، گداز اور گرم بدن جھلک رہا تھا۔

"اوہ!" ایڈورڈ گھبرا کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ اُس کے بہت نزدیک کھڑی تھی۔ اُس کے جسم کی آنچ ایڈورڈ محسوس کر رہا تھا۔

وہ معذرت کرنے لگا: "مُعاف کیجیے گا۔ اگر علی نہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں پھر آجاؤں گا۔ علی سے کہہ دیجیے گا میں آیا تھا۔ شکریہ"

وہ مُڑنے لگا مگر شاہ زمانی بیگم نے اُسے بہ اِصرار روکا اور شربت بنوانے اندر چلی گئی۔ وہ بیٹھ گیا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ شروع ستمبر کی تاریخیں تھیں مگر یہاں مہدی منزل کے اِس بڑے کمرے میں اُسے سخت گرمی لگ رہی تھی۔

چاندی کی طشتری میں شربت کا گلاس رکھ کر وہ خود ہی لائی۔ اُس نے ہاتھوں کے گجرے مہک رہے تھے۔ وہ کسی بات پر کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔ اُس کی آواز میں بلا کی جنسی کشش تھی۔ ایڈورڈ کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ بہنے لگا۔ نیم تاریک ماحول۔ خاموشی۔ یہ اِشارے یہ کنائے۔ یہ بُلاوے۔ یک لخت ایڈورڈ کا دل اسے چھونے، چھیڑنے اور بے رحمی سے لپٹانے کو چاہا۔ مگر وہ پیے ہُوئے نہ تھا وہ ہوش میں تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

وہ کہنے لگی میں علی صاحب سے کہہ تو دوں گی مگر اب کب آؤ گے؟

وہ بہانے بنانے اور اپنی عدیمُ الفُرصتی کا بہانہ کرنے لگا۔ مگر

اُس نے اِصرار کیا اور وہ اِنکار نہ کر سکا۔

باہر نکل کر وہ کلب کی طرف مُڑ گیا۔ یہاں اُس نے بلیرڈ کھیلا، سیر ہو کر پی مگر رقص نہیں کیا۔ پھر وہ اپنے باپ کے دوست کرومبی کی بیٹی ایڈونا سے ہنستا بولتا رہا۔ اور گھر واپس جاتے ہُوئے راستے میں سوچنے لگا "ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے ایڈونا سے شادی کر لینی چاہیے۔ کچھ دن ٹھہر کے کر لُوں گا۔"

رِم جھم رِم جھم، پھوئیاں پھوئیاں، جل برستا تھا۔ پانی نئے موتی گلابی کنولوں پر پڑ رہے تھے۔ تالاب میں جل بیل پھیلی پڑی تھی۔ دُھلے دُھلائے تُریلے کے شفاف پتّے دھیرے دھیرے ہواؤں میں جُھومتے تھے۔ سبزے اور پانی سے اُوپر سفید گردنیں اُونچی کیے بگلے بیٹھے تھے، جیسے کسی کے اِنتظار میں ہوں۔ مانجھیوں نے نوکے کھولیں اور چوڑے پاٹ کے دریا میں زور سے چپّو چلانے لگے۔ وہ ترنگ میں تھے۔ ایک گیت چھیڑتا تھا دُوسرا اُسے اُٹھاتا تھا۔ گاتی بجاتی دُنیا دریا پر بہتی تھی۔

گوتم بُدھ کے پیرو نے خانقاہ کے برآمدے میں سے سامنے دیکھا اور نیچے اُترنے لگا۔ پھر اُس نے جُھک کے دریا کو دیکھا اور بغیر یہ سوچے کہ دریا کا پاٹ کتنا چوڑا ہے وہ نیچے اُترتا چلا گیا۔ نیچے سیڑھیاں کٹی ہُوئی تھیں۔ بچتا بچاتا وہ کنارے پر آ گیا۔ ملّاح نے اُسے دیکھا اور اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ ملّاح خاصے خردماغ تھے مگر اِس کی بات اور تھی۔ یہ اِن درختوں میں چھپی ہُوئی خانقاہ کا طالب علم تھا۔ باعزّت اور قابلِ احترام نئو کا بہتی رہی۔ ایک بار اور گوتم کا بے چَین پیرو امن

کی دُنیا چھوڑ دُکھی اور شوریدہ سر دُنیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر وہ کسی سے رستا پُوچھتا تو اُسے مِل جاتا مگر وہ بنا کسی سے پُوچھے چلتا رہا، نیچے گھنے جنگلوں میں۔

پھر وہ ایک ایسی بستی میں آیا جہاں کے سب لوگ ننگے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کیں، نارنجی پلّو کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور پھر اُس طرف آیا جہاں دھان کے کھیت پانی میں ڈُوبتے تھے۔ اِس میں کھڑے ہُوئے ننگے بچّے سے جو ذرا ذرا سی مچھلیاں پکڑ رہا تھا اُس نے دھیرج سے کچھ بات کی۔ بچّے نے اُسے حیرت سے دیکھا، اُس کی بات کا جواب دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔

یہاں ہوا تیز تھی مگر اُس نے محسُوس کیا کہ تاڑ اور ناریل ساکت ہیں اور کوئی تیزی سے اُن پر چڑھ رہا ہے۔ اُوپر ڈاب لٹک رہے تھے۔ عورتیں اور مرد ہاٹ سے واپس آ رہے تھے۔ راہ میں سبزی کے ٹوکرے رکھے تھے۔ کنارے پر مچھلی بکتی تھی۔ مگر اُسے اِن میں سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ بازار میں سے ہو کر وہ ہرے بھرے راستوں کی طرف مُڑا۔ کھیتوں کے بیچ میں سے جاتی ہُوئی کچّی سڑک گیلی تھی اور اُس کے پیڑ چپک رہے تھے۔

فرانسس سے جوزف نے کہا "میں نے رات خواب دیکھا اور اُس کے آنے کی بشارت لی۔ میں نے دیکھا وہ ڈھاکے میں ہے

اور تم مجھے نوکے میں بٹھائے لیجا رہے ہو اور وہ صورت شکل میں
ہمارے بڑے پادری صاحب سے بھی اچھا ہے۔"

فرانسس نے بڑے جوش سے کہا "میں نہ کہتا تھا جوزف، تم
جی نہ چھوڑو۔ وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔"

گوتم بدھ کا بے چین پیرو مزید آگے بڑھا اور اُس باشا کے
آگے کھڑا ہو گیا جہاں کبھی وہ رہتی تھی۔

جوزف نے کہا "تم پھر آگئے۔ کیا تمھیں نروان حاصل ہو گیا؟"

بدھی نے کہا "مجھے کچھ بھی نہیں حاصل ہوا۔ میں کھوج میں
ہوں۔ یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ کیا اِس باشا میں تم مجھے بھی ٹھہرا
لوگے؟"

جوزف نے کہا "ہم کو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر یہ بیماری لگنے
والی ہے اور اگر یہ ہو گئی تو تمھیں کسی چیز کی جستجو نہ رہے گی۔ تمھاری
مرضی ہے۔"

طالب علم نے کہا۔ "میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ کیا تمھیں یقین
ہے کہ وہ آئے گا؟"

"ہمیں یقین ہے" یک زبان ہو کر فرانسس اور جوزف نے کہا۔

نارنجی دھوتی والے نے کہا "تب میں یہاں ٹھہرتا ہوں، اُس
سے پوچھنے کے لیے کہ کیا وہ لازرس کی طرح موت کے بعد زندگی
پا سکتی ہے۔ دراصل میں قطعی بھٹکا ہوا ہوں۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا

ہوں کہ محبت کیا شئے ہے۔ کھوج اور تلاش کس چیز کی کی جاتی ہے
اور کیا وہ مل جاتی ہے؟ اور مل جاتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟ اور اگر کچھ
محسوس ہوتا ہے تو کیا وہ مکتی ہے؟ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ تم میرے
بیٹھنے کا خیال نہ کرنا۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے۔ وہ
جس کا اس شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ کہیں وہ خود ہی تو محبت،
مکتی اور تلاش نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو چلے جانے سے میں گھاٹے میں
رہوں۔"

کسی کی پیٹھ ننگی تھی اور وہ چار خانے کی دھوتی لپیٹے، بال بکھرائے
خونِ جگر سے کاغذ پہ دُکھ کی تصویر بناتا تھا اور رنگ بھرتا تھا۔ کسی کا
گریبان چاک تھا، کندھوں پہ اُلجھے ہوئے بال بکھرے تھے، جگہ جگہ
سے دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور وہ بھی خونِ جگر سے اشعار میں دُکھ کا
رنگ بھرتا تھا۔ مگر دُکھ کے آگے کوئی بند نہ تھا۔ وہ پھر بھی بڑھتا جاتا
تھا۔ گوتم بدھ کا سادہ مزاج، بے چین پیرو منتظر رہا۔

اور ارشد کا اُس سے سال بھر ہی میں دل بھر گیا اور لڑکیوں کی
طرح۔ مگر اور لڑکیوں میں یہ بات تھی کہ وہ اتنی سہل الحصول نہ تھیں
اُس کے لاشعور میں اس بات کا احساس رہتا کہ اُن کے ملنے میں
ذرا دشواری ہے۔ وہ دوری ایک ذرا سی کشش قائم رکھتی اور
جب وہ عرصے بعد اِن میں سے کسی لڑکی سے ملتا تو اُسے اِس کی

تمنا ہوتی۔ پر یہاں آسانی اور ہر وقت کا ساتھ تھا اور اب محض ضرورت کی بات تھی۔ بھوک میں تو انسان بدمزہ کھانا بھی کھا لیتا ہے۔

وہ ایک دُوسرے سے آنکھیں چُراتے تھے۔ دراصل ارشد نے محسُوس کیا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں کچُھ نہ تھا کوئی پیغام اور کوئی تڑپ نہ تھی۔ پھر اُس کی طرف دیکھ کے کچُھ اُس کا ضمیر خجل بھی ہوتا تھا۔ وہ یُوں کہ شادی کے ضابطے کی رُو سے تو اُس نے اُس پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ پہلی لڑکی ہے اور وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر جب وہ اُس کی طرف دیکھتی تو خواہ مخواہ ہی ارشد کو یہ محسُوس ہونے لگتا کہ وہ اُس کی ہر بات سے واقف ہے۔ پھر اُسے دُعا کے یہ الفاظ یاد آتے جو نکاح کے وقت کی جاتی ہے۔ "خدا ان میں ایسی ہی محبت قائم رکھے جیسی سلیمانؑ اور بلقیس میں تھی، جیسی یوسفؑ اور زلیخا میں —

اِس وقت بھی ارشد نے میس کی بار میں پیتے پیتے سوچا "نکاح ایک مُقدس عہدنامہ ہے جو دو مومنوں کے درمیان ہوتا ہے اور اِس کا خوش کُن بار جو محبت کے الفاظ سے شرُوع ہوتا ہے، ایک عورت و مرد اپنے کندھوں پر اُٹھاتے ہیں۔ اور مومن ریاکار نہیں ہوتا مگر پھر یُوں ہُوا کہ اِس کے بعد سے مومن کی ریاکاری کا باب شرُوع ہُوا۔

اپنے خیال میں وہ پی کے اس کے جسم کی بے حسّی اور زندگی کی تلخی اور دائیں بائیں کی باتیں بھُلاتا اُس سے بے رحمی سے پیش آتا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ عورت اُس کے لیے ناموزُوں تھی۔

تلخی بڑھتی رہی۔ وہ خوش نہ ہُوا اور اُس عورت نے بڑی کراہت سے پچھلے پہر جھُرجھُری لی۔ ارشد نے اُٹھ کر سگرٹ جلایا اور کہنے لگا: "وہ نگین کے ساتھ جو علی کی بھاوج تُمھیں خُدا حافظ کہہ رہی تھیں، ان کا کیا نام ہے؟"

"کیوں؟ اُن کا نام شاہ زمانی بیگم ہے۔ وہ علی کے پھُوپھی زاد بھائی کی بیوی ہیں۔ بڑی خُوبصُورت ہیں۔ مگر تمھیں اِتنے دن بعد اُن کا کیوں خیال آیا؟"

وہ کہنے لگا: "کوئی خاص بات نہیں۔ ایسے ہی آگیا۔"

اور یہ بھی مومن کی ریاکاری تھی۔ اُسے ایسے ہی اُس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اُسی لڑکی نے اُس کے سہرے کی لڑیاں سوار ہوتے وقت اُٹھائی تھیں۔ اُن کی نظریں ملی تھیں، ایک لمحے کو۔ اور وہ مخصُوص شخص جو محض ایک شخص کے لیے ہوتا ہے اور جس کی آنکھوں کی تڑپ صرف ایک شخص سمجھ سکتا ہے، وہ اُس کے سامنے موجُود تھا۔

وہ پھر کہنے لگی "وہ بہت خُوبصُورت ہے۔"

"ہُوں" — ارشد نے گہری آواز میں کہا، سگرٹ بُجھایا اور سوگیا۔ وہ اکثر اُس کے مُتعلق سوچتا رہا تھا۔ زُہرہ نے نیم تاریکی میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو سحر کی پہلی کرن میں بہت خُوبصُورت لگ رہا تھا۔

علی نے نگین سے کہا "بی بی، ذرا نیچے جا کے کلب میں ایڈورڈ کو فون کرنا کہ میں اُسے یاد کرتا ہُوں۔ اُس دن وہ آیا تو میں مل نہ سکا۔ اب وہ مدراس جانے والا ہے۔ آج ہفتہ ہے یقیناً وہ وہیں ہوگا۔ الہ آباد سے واپس آگیا ہوگا۔"

علی کو نزلہ زکام ہو رہا تھا اور وہ اُوپر اپنے کمرے میں رضائی اوڑھے لیٹا تھا یا بقول نگین کے ذرا نخرے کر رہا تھا۔ دادی اماں کا لاڈلا تھا۔ اور اُس سے خدمت کروا رہا تھا۔

علی کی طبیعت ذرا ماندی ہوتی تو اُس کا جی چاہتا کہ اس کے چاروں طرف دادی اماں، نگین اور اُس کے دوست بیٹھے ہوں۔ نگین کسی انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرتے گھبراتی تھی اور وہ بھی کسی مرد سے۔ اُس کی انگریزی زیادہ صاف نہ تھی۔ شاہ زمانی بیگم نے اُس کی مُشکل حل کر دی۔ وہ کہنے لگی "تُم بیٹھو، میں فون کیے دیتی ہُوں۔"

وہ مدراس جانے والا تھا اِس لیے الہ آباد اپنے باپ سے ملنے گیا تھا۔ جنگ جاری تھی۔ اُس کے باپ کو طرح طرح کی فکریں لاحق تھیں۔ اگر وہ جیت بھی جاتے ہیں تب بھی خسارہ ہی تھا۔ جنگ کے بعد کوئی قوم سو برس تک تو اُٹھتی نہیں۔ انگلستان میں اِس کے بعد مزید بے کاری بڑھنی تھی۔ پھر یہاں ہندوستانی اِس جنگ سے فایدہ اُٹھا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے "اِس جنگ کے فیصلے کے ساتھ ہمارا بھی فیصلہ کرو۔ ہمیں آزاد کرو۔" جگہ جگہ سخت گڑبڑ ہو رہی تھی۔

شہر شہر گولیاں برس رہی تھیں۔ آج بمبئی میں گولی چلنے کی خبر آئی تو کل بہار میں۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بلکہ مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ اُن کا بیٹا، ایڈورڈ، جو خالص انگریز تھا، ہندوستانیوں کے اِس مُطالبے کو حق بجانب قرار دیتا تھا اور اپنی حکومت کی مذمت کرتا تھا۔ بیٹے کی احمقانہ منطق باپ کی سمجھ سے باہر تھی۔

اُس نے کھانے کی میز پہ اُن سے کہا: "اِس مُلک پہ ہمارا حق کہاں سے آگیا؟ یہ قطعی بے ایمانی سے حاصل کیا گیا تھا۔ ایک عرصے سے انگلستان اِس پہ پل رہا ہے۔ انگریز اِن کی گاڑھی کمائی، ان کے کھیتوں کا اناج، اِن کا قیمتی جُوٹ سب باہر بھیجتے رہے۔ یہاں کسان بھُوکا مرتا رہا۔ ہم نے اِن کے فنکاروں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ ہاتھ کٹوا دیے۔ یہ ہم نے فن اور نفاست کی قدر کی تھی۔ ہم بیروک اور رکوکو کے نوادرات کی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ہیں۔ یہ کسی اَور کا سرمایہ تھا اِس لیے اِسے مٹا دیا گیا۔ ہمیں ڈی ولیرا کی قدر کرنا سکھائی گئی کیونکہ وہ آئرلینڈ کی آزادی کے لیے کوشاں رہا۔ اُس نے اِس کی خاطر قید و بند کی مُصیبتیں جھیلیں۔ مگر ہمیں سراج الدولہ سے نفرت کرنا سکھایا گیا۔ غلامی ہر قوم کے لیے ایک لعنت ہے۔ اگر آج جرمن انگلستان کو ___

وہ اِتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اُنھوں نے آہستہ سے کہا "خاموش رہو"

وہ کوئی بدشگونی کی بات سُننا نہ چاہتے تھے۔

اُس نے پھر کہا "مگر یہ سراسر زیادتی ہے ڈیڈی"۔

وہ اُسے بتانا چاہتے تھے کہ اُنھوں نے اِس مُلک کو بہت کچھ دیا۔ یہ قوم ناشکری ہے۔ اُنھوں نے اِسے ریلیں اور بجلی دی۔ سیاسی شعور اور اپنے وسائل سے فائدہ اُٹھانے کی تمیز سکھائی۔۔ مگر اُنھوں نے صرف اِتنا کہا: "یہ آزادی کے بعد ایک دُوسرے کا خُون بہائیں گے"۔

اس پر اُس نے اِنتہائی بیزاری مگر نرمی سے کہا "اِس لیے اِنھیں آزادی نہ دی جائے۔ یہ باشعور ذہن کا جواب نہیں ہے۔ اور پھر یہ نفرت کا بیج بھی اِن میں ہم ہی نے بویا ہے۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ ہماری پالیسی تھی"۔

اُنھیں ہندوستان کے مرغزاروں میں خُون بہتا نظر آرہا تھا۔ اِس مُلک کو اُنھوں نے سنوارا تھا۔ یہاں اُنھوں نے پُل بنائے تھے، ریلوے لائنیں بچھائی تھیں مگر یہ لڑکا کچھ نہیں سمجھتا۔

"ولی عہد" اُنھوں نے سوچا "ولی عہدوں کے خیالات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں"۔

اُسے اپنے باپ سے اس قسم کی گفتگو کا رنج تھا۔ وہ کمزور ہو رہے تھے۔ اُن کے بال بہت سفید ہوگئے تھے۔ اُن کے ساتھ جو ایک مخصُوص معاشرہ اور مدرسۂ فکر تھا وہ ختم ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے کام کیے تھے۔ اور اُس نے کام اب شروع کیا تھا۔ اُس نے بُرا کیا جو اِس قسم کی

گفتگو اُن سے کی۔

بَیرے نے اُسے کاپی لاکر دی۔ اُس نے مزید وِہسکی کا آرڈر دیا اور دستخط کیے۔ بلیرڈ ڈسٹک کو ذرا تولا اور سبز مخمل کی بانات پر گیند لُڑھک کے گڑھے میں گری۔ وہ جیت رہا تھا۔ تب اُسے پیغام ملا کہ ٹیلیفون پر اُسے کوئی بُلاتا ہے ۔۔ واپس آکے اُس نے بقیہ وِہسکی ختم کی، بازی جیتی اور عہدی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اُوپر، نگین، علی کے پاس بیٹھی اس کے شانے دبا رہی تھی۔ ایڈورڈ نے رشک سے علی کو دیکھا اور خوش دلی سے اُسے چھیڑنے لگا۔ وہ وہ بہت پیے ہُوئے تھا۔

علی نے اُس سے کہا "تم بھی اب شادی کر لو۔ ایڈونا سے سفارش کروں؟"

وہ ہنسا اور کہنے لگا: "ابھی نہیں۔ کچھ دن اور ٹھہر جاؤ"۔

اِس پر علی کہنے لگا: "کیوں؟ کسی پری کا اِنتظار ہے جو اُوپر سے آئے گی؟"

اُس نے شرارت سے شاہ زمانی بیگم کی طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"راجا تو تم بنے بیٹھے ہو۔ شاید پری آئے"۔

علی نے نگین سے کہا۔ "ذرا ایڈورڈ کے لیے چائے تو بنواؤ"۔

وہ کہنے لگا "تکلّف نہ کرو۔ میں وِہسکی سے لبریز ہُوں۔ مزید گنجائش نہیں"۔

"علی بولا "ایک پیالی چائے بھی ڈال لو۔ تم میں بہت گنجائش ہے پینے کی۔ میں بھی تمھارے طفیل پی لوں گا۔ ورنہ یہ مجھے چائے تھوڑی دے گی۔ دادی امّاں نے اسے منع کر دیا ہے۔ مجھے زیادہ چائے پلانے کو۔ اُن کا خیال ہے کہ نزلہ خشک ہو جائے گا۔"

نگین جانے کو مڑی اور ایڈورڈ نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں الزام رکھتے ہو اِس پر؟ صبح سے نجانے کتنی چائے بنوا چکی ہوگی۔ یہ تو بہت اچھی ہے"۔ وہ ذرا سا رنجیدہ ہوا۔ چائے پی کے جانے کو کھڑا ہو گیا۔

علی نے کہا "کھانا کھالو"۔

مگر اُس نے کہا "احمد انتظار کر رہا ہوگا"۔

نگین علی کے پاس بیٹھی رہی اور شاہ زمانی بیگم اُسے چھوڑنے گئی۔ تاریک زینے میں شاہ زمانی بیگم نے بتّی نہیں جلائی۔ ایڈورڈ کو سوئچ کا پتا نہ تھا۔ شاہ زمانی کے گلے میں موتیا کی کنٹھی مہکتی تھی اور پور پور میں رچی ہوئی مہندی کی مہک اُس میں شامل ہو رہی تھی۔ وہ مدہوش تھا۔ پھر بھی وہ سنبھلا اور ایک ذرا پیچھے کو کھسکا مگر تاریکی میں وہ لڑکھڑائی اور اُس پر ہاتھ رکھ کے سیدھی ہوتے کے لیے اُس کے اور قریب ہو گئی۔ یک لخت وہ بڑی بے رحمی سے اُس پر جھپٹا اور اُسے اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا۔ وہ گھبرانے لگی۔

تب اُس نے کہا "میرے قریب نہ آؤ۔ میں اِتنی زور سے تمھیں لپٹاؤں گا کہ تم مر جاؤ گی۔ مجھے تم سے محبت نہیں"۔

وہ ہنسا، اُسے علٰحدہ کیا اور راستے میں موٹر چلاتے ہوئے سوچنے لگا "مجھے آخر کس سے محبت ہے؟"

اور جوزف مُنتظِر ہی رہا - اِسی انتظار میں اُس کی آنکھیں بے نُور ہوئیں اور پھر اسی اِنتظار میں وہ چل بسا اِس وقت کٹھل پکتے تھے - بیج پوری اشناسوں میں سے خوشبُودار رس ٹپکتا تھا - راہوں میں مُسافر تھم کر ٹھنڈی اور بھینی باس کے ڈاب پیتے تھے - ایسے میں وہ چل بسا اور یہ پکّا ہُوا پیلا پیلا کٹھل اُسے کِتنا پسند تھا - اُس کی باشا کے عین سامنے اُونچا گھنا کٹھل کا پیڑ تھا - کٹھل دھب سے نیچے گِرتا جیسے یہ درخت کوڑھی ہی کے لیے لگایا گیا ہو - اُسے حاصِل کرنے میں اُسے کوئی دِقت نہ ہوتی تھی - بس فرانسِس اُسے صاف کر دیتا تھا - اُس کا کھانا ہی کٹھل تھا - یہ نرم جو تھا اور کچھ اُس سے نہ چبتا - مُنہ کے زخم دُکھتے تھے -

فرانسِس جوزف پر مٹّی ڈال کر ڈھاکہ چلا گیا - یہ بُڈھی اس کا کون لگتا تھا جو وہ یہاں بیٹھتا - اُس کا ہم مذہب بھی تو نہ تھا - پھر اُدھر جوزف کی حالت کی وجہ سے فرانسِس کا گرجا جانا بھی نہ ہوتا ، جو وہ کچھ لاتا - دو چار دن وہ ڈھاکہ میں مزدُوری بھی کر لیتا تھا - اس بُڈھی کو منع کیا تھا کہ یہاں نہ رہے - پر وہ نہ مانا اور کوڑھ

لگا کے بیٹھ گیا - خود فرانسِس کی بات اور تھی - وہ بڑا خدا رسیدہ آدمی تھا - عیسیٰ کا سچا پیرو - اُس کا یقین تھا کہ اُسے کوڑھ نہیں لگ سکتا - اور اب بُڈھی کے اعصاب بے کار ہو چکے تھے اور بقول جوزف بیماری نے اُسے آپ ہی آپ نروان دلوا دیا تھا - اب محض اِنتظار ہی تھا اُسے - اور جو بھکارن کی لڑکی اُس کی دیکھ بھال نہ کرتی تو وہ بھُوکا مر جاتا -

بہرحال ابھی اُس کی بیماری اِتنی نہ بڑھی تھی - بس ناک سے رطُوبت آ رہی تھی - اعصاب بے کار ہو رہے تھے - ابھی اُس کا علاج ہو سکتا تھا - پر کون اُس کا علاج کرتا - ڈھاکہ میں کوئی اسپتال تو تھا نہیں - یہ بھکارن کی لڑکی بڑی رحم دل تھی - اس نے سُنا تھا کہ اس کی ماں اور نانی اِسی بیماری میں مری تھیں - اُس کے دل میں ترس تھا اور اب اُسے اِس بُڈھی سے محبت ہو گئی تھی -

" چھی چھی " مالو کہتا - " ایسی بیماری ہے اُسے پھر بھی یہ اُسے لپٹتی ہے - یہ اُس کے ساتھ سوتی ہے - چھی چھی - یہ اور کوئی بیماری تو نہیں سکتی - شرُوع میں ایسے ہی جوزف ہونے لگا تھا - ایسا ہی کابل " -

شمپا کو ذرا فکر نہ تھی - وہ یہی سوچے جاتی تھی " یہ اچھا ہو جائے گا میری ماں نے خواب دیکھا تھا ' جاگتے میں دیکھا تھا کہ مجھے کسی نے اُٹھا لیا ہے - میں بچ گئی - یہ بھی اچھا ہو جائے گا - جوزف بھی یہی کہتا تھا - کوئی ڈاکٹر آئے گا - آئے گا کیوں نہیں - مُعجزے بھی تو ہوتے ہیں - اچھا

یہ بیماری ہی سہی پر جس سے شمسو کی ماسی نے میرا بیاہ کیا تھا اُس سے یہ اچھا ہے۔ وہ مجھے ہر وقت بھکارن کی بیٹی کہتا تھا۔ تاڑی پی کر مارتا تھا۔ خود مانو بڑا کہیں کا اچھا ہے نا۔ پہلے اسے مجھ سے چھڑوایا۔ وہ میرا لڑکا بھی لے گیا۔ خود تین دن رکھ کے مجھے دھتکارا۔ یہ مانو تو ایسا ہے کوئی مرتا ہو تو اپنے پوکھر سے جل نہ دے چلّو بھر۔ خود مٹھی (مٹھائی) کھائے گا دوسرے کو زہر بھی نہ دے گا اگر پیسہ خرچ ہو۔

اور آج اُس نے کھیت سے پلٹتے ہوئے بُدھی کے لیے خود چڑھ کے ڈاب کاٹا۔ بالم کے کھیت سے اَنناس چُرایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے ڈاب کا پانی اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ کوئی کام اُسے کرنے نہیں دیا۔ حالانکہ ابھی وہ باشا کا سب کام کر لیتا تھا۔ بھات پکا لیتا تھا، مچھلی صاف کر لیتا تھا۔ وہ صِرف کھیت پر کام کرتی تھی۔ پر آج اُسے مانو کی بات کا غصّہ تھا نا۔

اِس رات اُس نے بڑی محبت سے بُدھی کو پیار کیا اور لپٹایا اور اُسے یقین دلاتی رہی کہ جیسے اُسے کسی نے بچایا تھا، بیماری بڑھنے سے پہلے اُسے بھی کوئی بچا لے گا۔ وہ اچھا ہو جائے گا۔ پر اِس رات گوتم کا بے چین پَیرو اُس سے یہی کہتا رہا: "ایک بار اور میری طرف دیکھو۔ پھر کے سے نظریں اُٹھاؤ۔ کیا باہر جل پڑتا ہے؟ شمپا، میری طرف دیکھو۔"

بُدھی بار بار اُس کی کاجل ایسی آنکھوں میں بھکارن کو تلاش

کرتا رہا۔ وہ سو گئی۔ بُدھی اُس کے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا "تیری آنکھیں، تیری آتما اِس میں محفوظ ہے۔ اور عیسیٰ کی آتما اُس آنے والے میں جنم لے گی جس کی بشارت فرانسس نے دی اور جوزف نے خواب سے لی۔ اب میں سمجھا جوزف کی بات۔ میں اُس کا مُنتظر رہوں گا اور دیکھوں گا مُکتی اور شانتی کو چین سے اِس میں براجتے۔ مجھے چین نہیں۔ دیکھوں گا چین کیسے ملتا ہے۔ میں زندہ رہوں گا اور اِنتظار کروں گا۔ وہ آئے گا جس کا اِتنا اِنتظار ہے۔ وہ چارہ گر ہے وہ میری رُوح کے زخموں پر بھی پھاہا رکھے گا۔

"پھر اُس نے باہر دیکھا اور کہنے لگا "شمپا" اب اُٹھ بھی چکو۔ یہ صُبح کی کرن مجھے آنے والے کی بشارت دیتی ہے۔ بیماروں کے دل اُس کے لیے تڑپتے ہیں۔ یہ زمین اُسے بُلاتی ہے۔ وہ آئے گا۔ یہ زمین، یہ دُکھ، یہ لاچاروں کی تڑپ اُسے کھینچ لائے گی۔ شمپا اُٹھو نا۔ وہ آئے گا۔"

مانو نے سُنہری چٹائی پر بیٹھ کے نفیس بھات اور مچھلی کھاتے ہوئے حقارت سے اپنی بیوی سے کہا "یہ سب کوڑھی ایک وقت پر اِنتظار کرنے لگتے ہیں۔ پر یہ ابھی سے اِنتظار کرنے لگا۔ راجا بنا بیٹھا خدمت کرواتا ہے۔ نکال دیا ہوگا اسے گُرو نے خانقاہ سے۔ بڑا بدمعاش ہے۔"

مانو نہ جانے کیوں بُدھی سے جلتا تھا۔

زہرہ کے خسر ریٹائر ہوئے اور بیٹے کے پاس رہنے آئے تو
انھیں دل کی شکایت ہوگئی۔ یہاں انھوں نے قسطوں پر چھاؤنی
میں زمین لے کر گھر بنایا۔ تینوں بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹا بیٹا
میم لے آیا تھا۔ خیر اس پر انھیں کچھ زیادہ اعتراض نہ تھا۔ فوجی آدمی
تھے۔ انگریزوں میں اُٹھے بیٹھے تھے۔ انھوں نے میم سے انگریزی
بولنا چاہی پر وہ اُن کی انگریزی پر ہنستی تھی اور میاں سے کہتی "تمھارا
باپ قطعی غلط انگریزی بولتا ہے"۔

وہ ساس سے تو بالکل ہی نہ بولتی۔ نندیں آتیں تو اُن پر کڑی نظر
رکھتی اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتی۔ مثلاً یہ کہ وہ بچوں کی تربیت
اچھی نہیں کر رہی ہیں۔ نندیں میم سمجھ کر اُس کی بات شربت کے گھونٹ
کی طرح پی جاتیں۔ زہرہ پر اُسے ایسا اعتراض نہ تھا۔ وہ اس کے
دونوں لڑکوں سے بھی خوش رہتی تھی بلکہ شام کو ایک آدھ گھنٹا انھیں
پڑھایا بھی کرتی تھی۔ زہرہ سے اُسے صرف ایک ہی شکایت تھی کہ وہ
کپڑے لتے اور میک اَپ کے مُعاملے میں بے پروا تھی۔ وہ اُسے
میک اَپ کرنے اور اُس کے فوائد اکثر سمجھاتی تھی۔ اپنے میاں سے
وہ خوش تھی لیکن میم ہونے کے باوجود ارشد کے بے تحاشا پینے پر
اعتراض کرتی۔ ارشد کو میمیں ویسے بھی پسند نہ تھیں۔ وہ اکثر زہرہ
سے کہتا تھا:

"معلوم نہیں انور کیسے رہتا ہے۔ ہر وقت انگریزی بولنا پھر
ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا جس کی ہر بات اپنے سے مختلف ہو،
اُسی کا دل ہے۔ میں نہیں رہ سکتا تھا"۔

زہرہ کہتی "دل کی بات ہے۔ وہ تو خوش ہے۔ تم سے زیادہ
اچھا رہتا ہے۔ نہ پیتا ہے نہ گھر سے بیزار ہے"۔

یہ میم بھی پکی میم تھی۔ اِس نے ہندوستانی کپڑے کبھی پہن کے
نہ دیے۔ اُردو کبھی نہ بولی اور ہمیشہ انگریزی کھانا کھایا۔ انور
ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ ارشد کو ساس کی طرف سے اپنے اور
زُہرہ کے حصّے کی جائداد کے پیسے مِلے تھے۔ اِس سے اُس نے
ساتھ ہی ایک علٰحدہ گھر بنوا لیا تھا۔ وہ اور اُس کے بیوی بچّے اِس
میں رہتے تھے۔

•

یہ میم ہندوستانیوں سے مِلتی بھی کم تھی۔ یہاں چھاؤنی میں وہ صرف
براؤن کی میم سے بے تکلّف تھی۔ دُوسروں سے محض رواداری سے مِل
لیتی۔ براؤن کی میم طبیعت کی اچھی تھی اُس کے ایک لڑکی اور ایک
لڑکا تھا۔ وہ اُن کی سالگرہ پر انور کی میم اور زُہرہ کے بچّوں کو بُلایا
کرتی تھی۔ ویسے میجر براؤن موریس گھر کے ڈنروں پر بھی اِن سب
کو بُلاتے تھے۔ خود ارشد نے بھی اپنے بھائی کی شادی کے ڈنر پر میجر
اور مسز موریس کو مدعُو کیا تھا۔ ارشد کے آبا نے انور کا نکاح اور ولیمہ
باقاعدہ کیا تھا اور میم کو زیورات دیے تھے۔ ارشد کی امّاں میم کا بڑا

خیال کرتی تھیں۔ جب اُن کی بیٹیاں آئی ہُوئی ہوتیں اور گھر میں گڑبڑ ہوتی تو وہ اُس کا ناشتا اُس کے کمرے میں بھجوا دیتیں۔

اور جب مسٹر کو زُہرہ کی قدر آئی اور وہ اُس کی طرف جا کے بیٹھنے اور سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے تو چل بسے۔ زُہرہ کو واقعی اُن کے مرنے کا قلق ہُوا۔ اُس کے چچا بھی تو تھے۔ پر میم نے کُرسی پہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے مسز مورس کے پُرسے کا شکریہ ادا کیا اور بس اِتنا کہا: "وہ ایک اچھا آدمی تھا۔" اُس نے انور کو بھی سمجھایا کہ ماں باپ ہمیشہ نہیں رہتے۔ مگر انور بہت رویا۔

یہاں ریت پہ سمندر کے کنارے وہ آرام کُرسی پہ بیٹھا کاہلی سے پڑھتا رہا تھا۔ صُبح جب وہ آیا تھا تو وہ کچھ دیر سمندر میں کنارے کنارے تیرا تھا۔ ایک ذرا اُس نے گرم ریت میں لوٹ لگائی پھر کنارے پر بیٹھ کے نہایا مگر ریت ٹھیک سے صاف نہیں ہُوئی تھی۔ وہ یُونہی کُرسی پر بیٹھ کے پڑھنے لگا۔

احمد اندر ہٹ سے آیا۔ اُس نے تولیے سے اُس کی ریت جھاڑی اور اُس کی پیٹھ پہ مرہم ملنے لگا تاکہ کھال تیز دُھوپ میں نہ جُھلسے۔ یہ احمد اُس کا بڑا خیال کرتا تھا۔ احمد کا ہاتھ اب اُس کے کسرتی بازوؤں پر تھا۔ اُس نے اپنے بازوؤں کی مچھلیاں اُٹھا کے احمد کو دکھائیں تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا "بابا، تُم ولایت سے دُبلے ہو کے آئے تھے اب اچھے ہو گئے ہو۔"

احمد کی اُنگلیاں اُس کے سینے کے بالوں میں اُلجھ رہی تھیں۔ پھر اُس نے اُس کے پیر ملے۔ اور اب وہ اُس کی گردن پر مالش کر رہا تھا۔ کل سے اُس کی گردن کچھ اکڑی ہوئی تھی۔ اُس نے احمد سے کہا "تُم بڑی اچھی مالش کرتے ہو۔"

پھر اُس نے انگڑائی لی اور سوچنے لگا: "یہ احمد مجھے بالکل کاہل کیے دے رہا ہے"۔ احمد نے اُس کی پیٹھ پر تولیہ ڈالا اور اندر سے گلاس میں بیئر لا کر دی۔ اتوار کا سارا دن اُس نے ایسے ہی گزارا۔ اب احمد اُس سے چلنے کو کہہ رہا تھا کیونکہ شام ہو رہی تھی اور اُوپر تاڑ اور ناریل کے درختوں پر بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ کسی وقت ان میں سے چاند ذرا سا جھانکتا اور چھُپ جاتا۔ اس کا اَور بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ کیونکہ لوگ کم ہو گئے تھے اور چاند نکلتا چھُپتا بڑا دلچسپ لگ رہا تھا۔ لیکن احمد نے اُس سے کہا کہ رستے میں بارش آ لے گی۔

اُس نے کاہلی سے اُٹھتے ہُوئے کہا "تم جو میرے گارجین بنے ہُوئے ہو تو تُم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ میری بیوی مُجھے چار دن میں طلاق دے دے گی"۔

احمد کہنے لگا: "وہ کیوں بابا؟ میم صاحب مُجھ سے بہت خوش رہے گی۔ اپنی میم صاحب مُجھ پر کبھی ناراض ہُوئی؟"

وہ ہنسا اور بولا: "اپنی میم صاحب کی بات اَور ہے۔ وہ میری ماں ہے۔ وہ یُوں دے گی طلاق کہ تمھارے بنائے ہُوئے پروگرام پر چلوں گا اور وہ جلے گی۔ ابھی تک تم مُجھے بابا کہتے ہو۔ ذرا غور تو کرو"۔

احمد حیرت سے کہنے لگا: "اور کیا کہا کرُوں بابا؟ تُم شادی تو کرو۔ کوئی طلاق نہیں دیتی"۔

وہ چُپ ہو گیا اور اندر جانے لگا۔

احمد کہنے لگا: "نہالو"۔

"گھر پر نہاؤں گا"۔ ایڈورڈ نے کاہلی سے کہا۔

احمد نے کہا "گھر پر بھی نہا لینا"۔

اِس پر وہ بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ "اب تُم مجھے یا تو یہاں نہلوا لو یا گھر پر۔ میں دوبار نہیں نہاؤں گا۔ فیصلہ کر لو"۔

احمد ہنسا اور بولا "اچھا بابا گھر پر نہا لینا"۔

وہ خوش ہو کر بولا "یہ بات ٹھیک کہی"۔

چاندی جیسی چمکتی ہُوئی سڑک پر موٹر چلاتے چلاتے اُس نے سانولی سلونی، بھرے بھرے جسموں والی تامل عورتوں کو دیکھا۔ وہ کسی ہوئی باریک کنارے دار ساریاں باندھے تھیں۔ اُنھوں نے سیاہ چمکیلے بالوں کے جُوڑوں میں پھُول سجا رکھے تھے۔ اُسے انیتا کا خیال آیا اور وہ احمد سے کہنے لگا: "میں نہا دھو کر ذرا باہر جاؤں گا۔ تُم اِنتظار نہ کرنا"۔

"اور کب آؤ گے؟" احمد نے پُوچھا۔

"جلد ہی آ جاؤں گا۔ کبھی دیر سے بھی آیا" ایڈورڈ نے کہا اور مُڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

احمد نے کہا "کبھی نہیں" اور سوچنے لگا کہ لکھنؤ میں بابا بڑی دیر سے ہفتے کی رات کو آیا کرتا تھا۔ جب ہی تو کہتا ہُوں شادی کر لے۔

نہا دھو کے وہ انیتا کی طرف چل دیا۔ رستے میں اُس کے کان میں تامل تلگو اور انگریزی پڑی۔ وہ سوچنے لگا یہ مدراس بھی خُوب ہے۔

اِس شہر میں بیک وقت تین زبانیں فراٹے سے بولی جاتی ہیں۔ انیتا ایک انڈین کرسچین لڑکی تھی۔ اُس کا باپ ہومیوپیتھک ڈاکٹر تھا۔ بھائی مدراس سے کہیں باہر نوکر تھا اور دو جوان بہنیں مرگئی تھیں۔ انیتا کسی سکول میں پڑھاتی تھی اور ایم۔اے کی تیاری بھی کررہی تھی۔ یہ لڑکی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ اُسے میم بننے کا شوق نہ تھا۔ وہ پڑھی لکھی ذہین لڑکی تھی مگر کم گو اور سمجھ دار تھی۔ وہ بول بول کے اپنی ذہانت اور خیالات سے مرعوب نہ کرتی تھی۔ وہ بھی آزادی کی حامی تھی مگر اُسے وطنیت کا ہسٹریا نہ تھا۔ اِس کے علاوہ وہ اچھی کیتھولک تھی۔ اتوار کے اتوار والدین کے ساتھ گرجے ضرور جاتی مگر نہ عیسائیت کا پرچار کرتی نہ مُدا باپ کے ارشادات رٹتی رہتی۔ اُس نے اِس سے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ گرجے جاتا ہے یا نہیں۔ اُسے اِس کے سیاسی یا مذہبی عقائد جاننے کی کوئی فکر نہ تھی۔

"یہ لڑکی اچھی ہے" اُس نے سوچا تھا۔

وہ تینوں، باپ بیٹی اور ماں، ناریل کی بڑی سی چٹائی پر بیٹھے چاول اور کھٹی دال کھا رہے تھے۔ ایڈورڈ کو ان کی کھٹی دال بہت پسند تھی مگر وہ بغیر انیتا کے مدعو کیے ان کے یہاں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اُس نے کمرے میں جھانک کر انھیں سلام کیا اور نشست کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد انیتا کے باپ نے اُس سے دو گھڑی بات کی اور مطب چلا گیا۔

انیتا سڈول اور گداز بدن کی بڑے تیکھے نقش و نگار کی سانولی سُنہری لڑکی تھی۔ وہ اُسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ یہاں اُس کا پلنگ تھا۔ ایک طرف میز کرسی تھی۔ میز پر لیمپ اور کتابیں رکھی تھیں۔ نیچے موٹی سی نرم چٹائی بچھی تھی۔ یہ سادہ سا، صاف ستھرا کمرہ اُسے بڑا اچھا لگا۔

وہ بے خیالی میں کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ چٹائی پہ بیٹھی اُس سے باتیں کرتی رہی۔ اُس کے جوڑے میں پھول سجے تھے اور تن پر سفید عنابی کنارے کی ساری خوب کس کے بندھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اُس کا سُنہری چہرہ اپنے سفید ہاتھوں میں تھاما اور اُس کے عنابی ہونٹ دیر تک چومتا رہا۔ اُس کے بالوں میں سے میٹھی میٹھی کچے ناریل کی خوشبو آرہی تھی۔ ایڈورڈ نے کئی بار اُس کے بالوں پر ناک رکھ کے لمبی لمبی سانسیں لیں۔ اُس کے کانوں کو چوما جن میں چھوٹی چھوٹی سونے کی کیلیں پڑی تھیں۔ پھر اُس کی ناک کی سونے کی کیل کو اپنی ناک کی نوک سے چھوا اور پھر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

انیتا نے اُس سے کہا "تم مجھے اچھے لگتے ہو۔"

وہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ نہ اُس نے محبت مانگی اور نہ دی۔ اُس نے ایک بار اور دل میں کہا "یہ بہت اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔" اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔

وہ مسکرائی۔ اُس کے عنابی ہونٹوں سے سفید دانت جھانکے۔ وہ کہنے لگی: "میں تمھیں ستار سُناؤں؟ تمھیں ہندوستانی موسیقی سے کوئی

دلچسپی ہے؟ تم اسے سمجھتے ہو؟"

ایڈورڈ ذرا جھینپا، ہنسا اور کہنے لگا "میں ہندوستانی موسیقی کو بالکل نہیں سمجھتا۔ مجھ پر اس کا عجیب تاثر ہوتا ہے۔ کبھی میں بہت اُداس ہو جاتا ہوں۔ کبھی تھوڑی سی خوشی ہوتی ہے۔ بہرحال مجھے اِس سے دلچسپی ہے۔ میں سمجھتا نہیں لیکن میں سنوں گا۔"

اینیتا نے اُسے غور سے دیکھا اور کہنے لگی: "تم اِس کی ریاضی نہ سمجھو وہ الگ بات ہے۔ مگر تمھاری رُوح اِس کی کیفیت کو سمجھتی ہے ہندوستانی موسیقی کا مُوڈ اور رُوح سے تعلق ہے اور یہ ایک کیفیت ہے۔ یہ سُر سنگیت کا مُلک ہے جہاں تم بیٹھے ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے؟"

وہ کہنے لگا: "ہاں مجھے معلوم ہے۔"

وہ بولی: "اچھا میں تمھیں سُناتی اور سمجھاتی ہُوں۔"

اُس نے کونے میں سے ستار اُٹھایا اور پھر سُر سنگیت کی دُنیا میں کھو گئی۔

پھر اُس نے ہاتھ جوڑے، سر جُھکایا اور کہنے لگی "یہ کھماج ٹھاٹھ میں جے جے ونتی تھی۔ یہ تمھیں اُس راگ سے جو میں نے اِس سے پہلے بجایا تھا کچھ مختلف لگی؟" وہ کہنے لگا: "ہاں لگی یہ مسرت کا راگ ہے۔"

وہ بولی "ٹھیک کہتے ہو۔ یہ علم تو دریا ہے ڈاکٹر صاحب۔"

وہ کہنے لگا: "مگر پھر بھی اُداسی رہی۔ ہندوستانی میوزک عمُوماً غم ناک ہوتا ہے۔ مجھ پر کاہلی طاری ہو رہی ہے۔"

اس پر وہ مُسکرائی اور کہنے لگی: "یہ تم پر لُطف و سُرور طاری ہو رہا ہے جسے تم کاہلی کہتے ہو۔ ہندوستانی میوزک میں رنج ہی سے راگ اُٹھتا ہے۔ یہ رنج رُوح کا ہے۔"

وہ کہنے لگا: "تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب میں اِسے سُنتا ہُوں تو رنج، تنہائی کا اِحساس اور جُستجو بڑھ جاتی ہے۔ شاید اِس لیے کہ رُوح ——"

وہ اِتنا کہہ کر چُپ ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ الفاظ میں کس طرح اِحساس کو ڈھالے۔ اینیتا نے اُس کا جملہ مکمل کیا اور کہنے لگی:۔

"رُوح سے تعلّق پیدا ہو جاتا ہے اور رُوح سامنے ہوتی ہے۔ تب ہمیں اس کی تنہائی کا اِحساس ہوتا ہے۔ رُوح طلب کرتی ہے اور ہم تلاش کرنے لگتے ہیں۔"

"اوہ۔ ٹھیک کہتی ہو۔" ایڈورڈ نے جیسے تڑپ کے کہا۔

وہ کہنے لگی: "اگر بور نہ ہُوئے ہو تو میں تمھیں شام کا راگ، ایمن کلیان، سُناؤں؟ ابھی شام ہے نا تم چاند پر نظر رکھو۔"

کھڑکی کے پردے اُس نے سرکا دیے اور ایڈورڈ نے دل میں کہا "یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ کاش میں اس سے محبت کر سکتا۔"

ایک ٹک اُس نے اس کی سمجھ دار آنکھوں میں جھانکا اور محبت نہ کر سکا۔

"سنُوں گا" اُس نے سر ہلا کے کہا۔

اینتا نے کہا "سُنانے سے پہلے میں تمھیں اسے سمجھا دوں تاکہ بقول
تمھارے رنج کی کیفیت کو سمجھ سکو یا لطف و سرور کی کیفیت کو وضاحت
سے محسوس کر سکو۔ یہ رنج ہی رنج ہے۔ یہ فراق اور جُدائی کا راگ ہے۔
اِس میں غم کی شدید کسک ہے۔ مگر اس میں تم دبی دبی سی خوشی بھی
پاؤ گے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ دن کی جُدائی اور شام کی آمد کی خوشی کے ملے جُلے
اِمتزاج کا راگ ہے۔ لو سُنو۔"

ایڈورڈ کا دِل اُس کے مدھم تیوروں میں ڈوبتا اور ڈولتا رہا اور
بقول اُس کے اس پر کاہلی طاری ہوتی رہی۔ تنہائی اور رنج گہرا ہوتا
رہا۔ تلاش جاری رہی۔

اینتا نے ستار پر سے سر اُٹھایا اور سوچنے لگی "یہ کون ہے جسے
میں یہ راگ، ٹھاٹھ، سُر، سنگیت اور الاپ سُنا رہی ہُوں۔ مہادیو،
شوجی مہاراج، دیپک کر بہری۔"

پھر وہ اُس سے کہنے لگی: "یہ راگ دیوتاؤں کو پیش کیا جاتا ہے
اور تمھیں اِس لیے سُنایا گیا کہ تم محبُوب نہ تھے۔ راگ، سُر، ٹھاٹھ،
الاپ رُوح کو بیدار کرتے ہیں۔ اِن سے دُکھ اور رنج جنم لیتا ہے اور
دُکھ رُوح کو بیدار کرتا ہے۔ مہاتما گوتم بُدھ کی رُوح کو بھی دُکھ ہی
نے بیدار کیا تھا۔ تم اس قسم کے مرض کے چارہ گر ہو کہ شاید تمھاری
رُوح کو بھی دُکھ کا راگ بیدار کرے اور اس کی کیفیت تم پر کاہلی

طاری نہ کرے۔"

جل اور گیت کے شہر میں ایڈورڈ نے اس رات اینتا کو مہاکلی
سمجھا اور اُس کے جسم کی گرمی سے پگھل پگھل گیا۔ اس میں اُس نے
سُر سنگیت کی کیفیت پائی اور اُس پر سُرور طاری ہو گیا۔ مگر فراق
کا پہلا شدید اِحساس اُسے یہیں ہُوا اور تنہائی اور رنج کا اِحساس
لے کر وہ گھر واپس لوٹا۔ وہ راہ میں سوچتا رہا "میں اچھا پینے والا
ہُوں۔ ہمیشہ ہی تشنہ کام لوٹتا ہُوں۔ کوئی ایسا ساقی بھی پیدا ہو گا
جو مجھے پلا سکے۔"

ابھی وہ یہاں چند مہینے بھی نہ رہا تھا کہ اُس کا بُلاوا لاہور سے
آ گیا۔ وہاں داتا کے دربار کے پیچھے جو مُتعدّی امراض کا ہسپتال تھا
اُس میں کوڑھ کا شُعبہ کس مپُرسی کا شکار تھا۔ لائل پور اور لاہور کے
گرد و نواح میں کوڑھی کھلے عام سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔
بڑی مُشکل تھی۔ ایک ڈاکٹر وہاں آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ ایڈورڈ کا
جی یہاں لگ گیا تھا اِسے وہاں جانے سے کوفت ہو رہی تھی۔ اِس
نے سوچا کہ یہ مجرّد ہونا بھی ایک مُصیبت ہے۔ جہاں ضرورت ہُوئی
اُٹھا یا بھیج دیا۔ اور بھی ڈاکٹر ہیں مگر وہ سب شادی شُدہ ہیں۔ وہ
کیوں اُکھڑ کے جائیں گے۔ پھر دنوں وہاں برادرن کے ساتھ رہنا
پڑے گا کیونکہ مجرّد ہونے کا ایک یہ بھی نقصان ہے کہ جائے رہائش

مُشکل سے ملتی ہے اور وہ بھی علٰحدہ ۔ پیئنگ گیسٹ ہوتے سے مجھے
کوفت ہوتی ہے ۔ یہ جگہ بڑی اچھی ہے ۔ فضول مجھے اُکھاڑ رہے ہیں؛
اور یہ لاہور جانا قطعی منحوس ثابت ہُوا ۔ شریف السّرج کو سانپ نے
کاٹ لیا ۔ وہ اِس کے سامنے خاموش پڑا تھا اور وہ اُس کی گردن کو
سہلا رہا تھا ۔ ساری رات وہ تڑپتا اور سسکتا رہا ۔ تمام رات وہ اُٹھ
اُٹھ کے آتا اور اُسے دیکھتا ۔ اُس نے ایک ٹک ایڈورڈ کو دیکھا اور
آنکھیں مُوند لیں ۔

وہ جُھکا اور آہستہ سے اُس کی آدھ کُھلی آنکھوں کو بند کر کے کہا
"تُم دوست تھے اور ساتھی تھے ۔ یہ کیسی منزل ہے کہ تُم مُجھے
چھوڑ گئے ؟"

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ۔ چند منٹ وہ آنکھیں
بند کیے بیٹھا رہا ۔ وہیں اس کے پاس، اُکڑوں ۔ اُس نے اپنے ہاتھ
سے اُس پر مٹی ڈالی اور قبر کے کتبے پر نام اور نسل کے علاوہ یہ
الفاظ کندہ کروائے :۔

"یہ ایک مخلص دوست تھا ۔ بہت مُطیع اور فرماں بردار ۔ یہ کبھی
ہانپا نہیں ۔"

اور آج انیتا نے اُسے کئی دن بعد کھانے پر مدعُو کیا تھا ۔ وہ جانے
والا تھا اور یہ ایک طرح اُس کی الوداعی دعوت تھی ۔ کوری دریز چٹائی پر

چمکتی ہُوئی تھالیوں میں کھانا پروسا ہُوا تھا ۔ گرم گرم پُوریاں تھیں
اور اُجلے اُجلے چاول ۔ چٹ پٹی مہک اُٹھ رہی تھی ۔

کونے میں نیچی سی تپائی پر ڈیلیا کے پھُول سجے تھے ۔ پاس ہی بڑا سا
سیندوری رنگ کا پام کا گملا رکھا تھا ۔ اُس کے بیٹھنے کے لیے چٹائی
کے کنارے پر تلے اُوپر دو کُشن رکھے تھے ۔ پھلوں کے پیالے میں
اناناس کے زرد گول قتلے رس میں ڈُوبے ہُوئے تھے اور پھُول دار چینی
کی رکابی میں کیلے رکھے تھے ۔

اُس نے چمچے سے چاول، کھٹی دال اور املی کا پانی ملا کے کھائے ۔
ہاتھ سے پُوری اور بھاجی کھائی ۔ بظاہر وہ خوش اور قانع رہا مگر اُس کا جی
رنجیدہ تھا ۔ خود انیتا کچھ پریشان سی تھی ۔ ہر جگہ اُس کے بھائی بندوں پر
گولی چل رہی تھی ۔

وہ کہنے لگی: "نہ صرف تُم بلکہ تمھاری ساری قوم یہاں سے واپس
چلی جائے تو بھی ایک سو برس ساتھ رہنے کی وجہ سے ہمارے تمھارے
درمیان تعلّق اور لگاؤ موجود رہے گا ۔ بلکہ اِس صُورت میں ہم اَور بھی زیادہ
صاف دلی سے ملیں گے اور یاد رکھیں گے ۔ وہ ہمارا مُطالبہ ٹھُکرا رہے
ہیں ۔ غُلامی تو کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی ۔ یہ تو لعنت اور بدبختی کا ایک طوق
ہوتا ہے ۔ کیا خیال ہے تمھارا ؟"

وہ کیا کہتا ۔ انگریز ہوتے کی حیثیت سے اُس کے لیے نہ بولنا ہی
مُناسب تھا ۔ وہ چُپ کا رہا ۔ اپنے باپ سے یا کسی انگریز کے سامنے

اپنے خیالات کا اِظہار کر لینا اور بات تھی۔ ان لوگوں سے اِس قسم کی بات کرنا دانش مندی کے خلاف تھا۔

وہ کہنے لگا: "تم کو معلوم ہے، میں تو محض مُعالج ہُوں — مجھے سیاست سے کیا سروکار"۔

حالانکہ وہ اُسے سولہ آنے حق بجانب سمجھتا تھا پھر بھی مصلحتاً خاموش رہا۔ اور اینیتا نے بھی آج پہلی بار اس سے اِس قسم کی گفتگو کی تھی۔

"شاید وہ واقعی پریشان ہو" ایڈورڈ نے رستے میں سوچا۔

احمد بیمار تھا۔ وہ اُسے لے کر ہسپتال گیا۔ اُس کو بران کائی ٹس ہو گیا تھا۔ دو دن احمد بیمار رہا۔ وہ دن میں کئی کئی بار اُسے دیکھنے گیا اور پھر آخری دِن اُس نے زور سے احمد کو پکارا۔ احمد نے آنکھیں کھولیں اور کہا "بابا، اپنا خیال رکھنا"۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں ایک ہاتھ اُس کا احمد کے سینے پر تھا، دُوسرے سے وہ اپنا سر پکڑے ہُوئے تھا کہ نرس نے اُس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ احمد کو اٹھانے والے آ گئے تھے۔ بڑی دِقت سے اُس نے آنسوؤں کا ایک پُورا دریا پیا۔

مسجد میں لوگ احمد کے جنازے کی نماز پڑھتے تھے اور وہ ذرا دُور اپنی موٹر میں دِل گرفتہ سا بیٹھا تھا۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی بڑی قیمتی شے کھو گئی تھی۔ اپنے ہاتھ سے چند مُٹھی خاک اُس نے احمد پہ ڈالی اور چُپکے سے کہا "تم دوست بھی تھے اور گارجین

بھی۔ تُم بھی چھوڑ گئے"۔

موٹر چلاتے چلاتے اُسے اپنے الفاظ یاد آئے "تُم جو میرے گارجین بنے ہو—" پھر احمد کے الفاظ "کبھی اپنی میم صاحب مجھ سے ناراض ہوئیں؟ بابا نہالو۔ بابا یہ" گھر آ کے اُس نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور نائٹ سُوٹ بدلنے غسل خانے میں گیا تو اُسے خیال آیا کہ پاجامے کا الاسٹک ڈھیلا ہو گیا تھا اور وہ احمد سے کہنا بھول گیا تھا۔ اُس نے پاجامہ اُٹھا کے دیکھا۔ احمد نے الاسٹک نیا ڈال دیا تھا۔

"میرے جو تُم نے میری عادتیں خراب کر دی ہیں اِن کا کیا ہوگا!" اِس وقت اُسے زندگی کی بے ثباتی کا سخت اِحساس ہُوا۔ آج اُسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔

لیٹنے کے بعد اُس نے حساب لگایا اور دھیرے سے کہا "لاہور جانا نُقصان کا باعث ہُوا"۔

ریل سرپٹ دوڑی جا رہی تھی اور وہ اکیلا تھا۔ خود ہی سیٹ پر اُس نے اپنا بستر بچھایا اور ایسے ہی جُوتوں اور کپڑوں سمیت لیٹ گیا۔

جب وہ کبھی ایسے لیٹا کرتا تو احمد اُس سے کہتا "بابا کپڑے بدل لو۔ میں نے غُسل خانے میں نائٹ سُوٹ لگا دیا ہے۔"

اور اِس پر بھی وہ جب نہ اُٹھتا تو احمد اُس کے جُوتے کھینچ کھینچ کے اُتارنے لگتا تھا۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ جاتا۔ "کتنی بار منع کیا ہے میرے جُوتے مت اُتارا کرو۔ مجھے نہیں اچھا لگتا۔ مگر وہی کرو گے جو میں منع کروں گا۔"

"تو پھر اُٹھ کے کپڑے بدل لو۔"

"اُٹھتا تو ہُوں۔ مگر تم کو تو ہر بات کی گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔"

یہ مُکالمے وہ دُہرا رہا تھا۔ پھر ہڑبڑا کے وہ جُوتے اُتارنے لگا جیسے احمد کی رُوح اُس کے جُوتے اُتارنے کی کوشش کر رہی ہو۔

کپڑے بدل کے وہ لیٹا تو سوچنے لگا "جہاں میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے، وہیں بھیجا جا رہا ہوں۔ ہر چیز نئی۔ احمد کے بغیر کیسے کام چلے گا۔

یہ شہر کبھی اُسے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ وہ بور ہو رہا تھا۔ یہاں اُس نے براؤن

کے نوکر کی وساطت سے خان کو نوکر رکھا اور احمد کی جگہ کسی کو نوکر رکھ کر رنجیدہ ہُوا پھر اُسے گولف روڈ پر ایک مکان میں اُوپر کا حصّہ مِل گیا۔ ہسپتال کی حالت ابتر تھی۔ اُس نے جم کے کئی دن صفائیاں کروائیں، ڈانٹ پھٹکار کی، لائل پُور اور لاہور کے گرد و نواح سے کوڑھی سمٹوائے۔ کتنے کوڑھیوں کو تو سڑک پر سے وہ خود سمیٹ کے لایا۔

جب ذرا ہسپتال مُنظّم ہُوا اور گھر جما تو وہ باہر نکلا۔ جب سے وہ ولایت سے آیا تھا وہی سُوٹ چل رہے تھے۔ مدراس وغیرہ میں گرم سُوٹوں کی ایسی ضرورت نہ تھی۔ وہ پیٹ مین کی طرف بڑھ رہا تھا تو اُس میں سے ایک مرد اور عورت نکل رہے تھے۔ پہلے عورت کا پہلُو والا رُخ سامنے آیا اور پھر پیٹھ۔ وہ دیکھتا رہا اور کھو گیا۔ یہ جانی پہچانی صُورت تھی۔ اِس کا عکس وہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ جیپ میں بیٹھنے لگی تو وہ تیزی سے جیپ کے پیچھے گیا، نمبر پڑھا اور پھر ٹھٹک کے اُسے جاتا دیکھتا رہا جب تک کہ وہ بالکل غائب نہ ہو گئی۔ دُکان میں آکر اُس نے نوٹ بُک میں نمبر لکھا۔ آپ ہی آپ مُسکرایا۔ شوق سے کپڑا پسند کیا اور سُوٹ کا ناپ دیا پھر دُکان سے نکل کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ایک انجانی خوشی سے موٹر کی طرف بڑھا۔

بے وجہ وہ اِس سے پہلے کبھی نہیں گھُوما تھا۔ کبھی سے وقت طے ہُوا یا کسی کام سے جانا ہُوا تو چلا گیا ورنہ کلب چلا جاتا۔ آج بھی وہ پنجاب ایسوسی ایشن کلب ہی جا رہا تھا۔ اِس طرف بڑھتے بڑھتے اُس نے گاڑی

واپس کرلی۔ ایک چکر دکانوں کا کاٹا اور دور سے کریا رام کے سامنے ایک
جیپ کھڑی دیکھ کر اُس طرف مڑ گیا۔ موٹر روک کے جیپ کا نمبر پڑھا
تو یک لخت دل دھڑکا۔ یہ وہی جیپ تھی۔ جتنی پھرتی وہ دکان میں داخل
ہُوا، اتنی ہی پھرتی سے سیلزمین بڑھا "یس سر۔"
وہ گڑبڑا گیا۔ کچھ لینا ہوتا تو بتاتا۔ کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا:۔
"جیری کین ہے تمھارے پاس؟ میرا مطلب پٹرول والا ڈبا۔"
سیلزمین ہنسا، "یہ تو سر، جنرل مرچنٹ کی دکان ہے۔ بنیانیں، موزے وغیرہ وغیرہ۔"
"اچھا کوئی بات نہیں۔ دیکھو شاید جیری کین بھی مل جائے۔"
سیلزمین نے حیرت سے اُسے دیکھا اور دوسرے گاہکوں کی طرف
مڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ گورا دیوانہ تو نہیں۔ لیکن گورا سیلزمین سے
جان چھڑا کے خوش تھا۔ وہ بیچ میں بچھی ہوئی میز کے ایک طرف کھڑا
اُسے دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے کھڑی اون دیکھ رہی تھی۔
ایک دم ایڈورڈ کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا۔ وہ دیکھے گیا۔
فوجی وردی والے شخص نے جو اُس دن پٹ مین کی دکان میں بھی اُس
کے ساتھ تھا، سرسری سی نظر اس پر ڈالی۔ اُس نے جھٹ نظریں
جھکا لیں اور باہر جا کے جیپ کے پاس کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا۔
فوجی ہے جیپ میں آتا ہے۔ یقیناً چھاؤنی میں رہتا ہوگا اور اِس
کا میاں ہوگا۔ مجھے براؤن کے یہاں جانا چاہیے۔

جاتے جاتے اُسے احساس ہُوا کہ لاہور بڑی اچھی جگہ ہے اور
یہاں سردی کیسی مزے کی پڑتی ہے۔ اندھیرے میں اُسے عمارتوں اور
درختوں کا رنگ پہلے سے نسبتاً نکھرا ہُوا اور جان دار لگا۔ اُس نے سوچا،
میرا خیال غلط نکلا۔ یہ بہت سے شہروں سے اچھا ہے۔ کل میں براؤن
کے یہاں جاؤں گا۔

اِس رات اُسے ذرا تسلّی رہی۔ مگر اِس تسلّی کی رات نے اُسے تھکا
دیا۔ وہ براؤن کے یہاں جانے کا پروگرام بناتا اور بگاڑتا رہا۔ وہ سوجاتا
مگر پھر آنکھ آپ ہی آپ کھل جاتی۔ مدّت سے سگرٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔
اِس لیے وہ اُٹھ اُٹھ کے پانی پیتا رہا۔
"بھلا وہ کیسے کپڑے پہنے تھی۔" اُسے یاد نہیں آئے۔ شاید اُس نے
اُس کے کپڑوں پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ اُسے
عورتوں کے کپڑے بڑی تفصیل سے یاد رہتے تھے۔ اُسے اب بھی یاد تھا
کہ ستار سُنانے والے دِن انیتا کی چولی عُنّابی تھی اور اُس میں گرہ لگی ہوئی
تھی۔ اور اُس دن، جس دن وہ بہت پیے ہُوئے تھا اور علی کی طبیعت
ناساز تھی، شاہ زمانی بیگم کے کُرتے کا رنگ ہلکا انگوری تھا۔ ایک بارگی اس
راہ گیر عورت کی یاد ذہن میں زور سے چمکی۔ اُس نے اُسے ہٹانا چاہا اور
کیتھرین، شاہ زمانی اور انیتا کی طرف دھیان کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ وہ گمنام
عورت اُس کے دل و دماغ پر چھائی ہُوئی تھی۔ اُس نے جنگ کرنی

چھوڑ دی اور تسلّی سے اُس کے مُتعلق سوچنے لگا۔

اُس کے نقش و نگار کیسے تھے؟" کچھ خیال نہیں پھر بھی وہ ذہن میں تھی۔ وہ تفصیل سے اُس کے مُتعلق سوچنے لگا۔ اُس کے ساتھی کی وردی کے بٹنوں پر بنے ہُوئے کام سے لے کر جیپ کی نمبر پلیٹ کا ذرا سا ترچھا پن تک اُس کے ذہن میں محفُوظ تھا۔ کیونکہ اِس سے مُتعلق ہر چیز دلچسپ تھی۔

وہ پیرِ ٹکا کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ میں اِتنا ڈُوبا ہُوا تھا کہ کھُلی ہُوئی کھِڑکی میں سے آتی ہُوئی سرد ہوا کا اِحساس تک نہ ہُوا۔ "اچھا اُس کے بال کیسے تھے؟" کچھ دھیان نہیں۔ اُس کے باوجود وہ ذہن میں بجلی کی طرح کوندرہی تھی۔ کیا وہ کوئی رُوح تھی؟ اچھا میں کل شام براؤن کے یہاں ضرور جاؤں گا۔ اب تو فیصلہ ہو گیا۔ اے نیند اب تو آجا۔ بھیڑیں گنیں۔ صُبح اُٹھنے کا دِھیان کیا۔ آنکھیں بند کیں مگر نیند اَور دل کو سُلاتے میں مصرُوف تھی۔

دِن بھر اُس نے جی لگا کے شام کی اُمّید پر کام کیا۔ بات بے بات مُسکرایا اور بلا وجہ اُداس بھی ہُوا۔ مریضوں سے معمول سے زیادہ نرمی برتی۔ ایک انوکھا گداز اُس میں پیدا ہو رہا تھا جس سے اِس سے پہلے وہ واقف نہ تھا۔ ایک لمحے کو اُسے خیال آیا کہ وہ اِنسان بن رہا ہے، رحیم اور حسّاس۔

مُدّت بعد پوکھر کے کنارے نرم کنولوں پہ آہستہ سے پیرِ ٹکا کے اُس نے بانسری مُنہ میں دبائی۔ اُس کے سُروں پر پتلی پتلی اُنگلیاں رکھیں، مٹیالی سی دھوتی کا پلّو اپنے گرد لپیٹا، گیان اور بُدھ کے فلسفے سے تھوڑی سی آشنا سیاہ کاہل آنکھیں رنجیدگی سے اُٹھائیں اور دھیرج سے نغمہ اُٹھایا۔ مدّھم مدّھم سُر کاہلی سے بکھرتے رہے۔

بانسری اُس نے اپنی گود میں رکھ لی اور اُن نغموں کی آواز سُنتا رہا جو ہوا میں دُور دُور پھیل گئے تھے۔ جب وہ اَور دُور ہو گئے اور اُس کی سماعت اُن کو سمجھنے سے قاصر ہو گئی تب وہ لمبی داڑھی اور بکھرے ہُوئے بالوں والے کی کوتیاؤں کو دھیرے دھیرے دُہرانے لگا۔

گیتا انجلی کے خالق نے اپنی کسی کوتیا میں کہا ہے، وہ یاد کرنے لگا۔ اس کا ایک بند اُسے یاد آیا "افسوس، مجھے ہوش نہ رہا۔ اور میں تمھاری بجتی ہُوئی چھاگل کے ترنّم میں ڈُوبتا چلا گیا اور غم سے آشنا ہُوا۔"

"اُس کا دُوسرا بند کیا تھا؟" اُس نے بوجھل ذہن پہ زور ڈالا۔ یہ سب وہ خانقاہ میں پڑھ چُکا تھا مگر بھُولتا جاتا تھا۔ اعصاب کاہل ہو رہے تھے۔ اُس نے کہا "اگر زندگی میں ایسے کام نہ کیے کہ مرکز زندہ جاوید

ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ محبت میں ذات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ تم مجھے زندگی ہی میں زندۂ جاوید بنا سکتی ہو۔ کیونکہ میں محبت میں امر ہُوا ہوں؟

یہ لمبی داڑھی والا خُوب کہتا تھا۔ پہلے مجھے اُس کی پُوری پُوری کویتائیں یاد تھیں پر اب ایک آدھ بند سے زیادہ یاد نہیں۔

مگر یہ امر کیسے ہوتے ہیں؟ دیکھوں گا اُسے جو امر ہونے آتا ہے۔

وہ اُٹھنے لگا۔ شمپا واپس آتی تھی۔ وہ شکایت کرنے لگی۔ کئی دِن سے کھیتوں میں پانی اُونچا ہو رہا ہے۔ دیکھو میرے پاؤں، جگہ جگہ سے زخمی ہو رہے ہیں اور راستے میں ڈوب اٹھیں اور کاٹتی ہے۔ مجھ سے تو نوچی نہیں جاتی۔

وہ دھیرے دھیرے چلّو بھر بھر کے پوکھر کا پانی اُس کے پاؤں پر ڈالنے لگا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کے زخموں میں کوڑھ پہنچا دیا۔

اُس نے صِرف اتنا کہا "شمپا، میری طرف دیکھو" اور تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک سایہ سا بھکارن کا لرزا اور غائب ہو گیا۔

ایسی کوئی بات نہیں تھی، اُس نے دل کو سمجھایا۔ وہ پیٹ مین میں اپنے گرم گیبرڈین کے بھورے رنگ کے سُوٹ کی ٹرائی دے گا۔ سب کام معقولیت سے ہونا چاہیے۔ وہ ایک ذمّہ دار اور سنجیدہ انسان تھا۔ ایک لمحہ بھی اُس نے کبھی ضائع نہیں کیا تھا۔

وہ پیٹ مین کی طرف بڑھا۔ موٹر قرینے سے روکی، مُقفل کی،

چابی جیب میں ڈالی۔ چاروں طرف مُتلاشی نظریں دوڑائیں اور دل کو ڈوبنے سے بچایا۔ پھر دُکان کی نچلی سیڑھی پر آ کے ٹھٹکا اور سوچنے لگا، یہی وہ مقام ہے جہاں میں نے اُس کا جلوہ دیکھا تھا۔ وہ مُسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔

اُس نے سُوٹ کو محبت سے دیکھا اور پیار سے ہاتھ پھیرا، تسلی سے ٹرائی دی اور درزی کو ہدایت دیتا رہا "ایک ذرا یہاں خفیف سا جھول رہتا ہے۔" درزی نے سلوٹیں صاف کیں، نشان لگائے۔ اِس طرح سُوٹ کی ٹرائی دینے پر وہ اپنی طرف سے مُطمئن ہُوا۔ گاڑی گھما کے لایا اور چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

براؤن کے گھر کے سامنے گھبراہٹ ہُوئی، موٹر بیک کرتے وقت اُلجھا، پیچھے گرد کا ایک طُوفان اُٹھا۔ تیز تیز سٹیئرنگ کاٹنے اور کوشش کے باوجود موٹر ذرا ترچھی رہی۔ پیچھے گرد دیکھ کے اپنی بدتمیزی پہ غُصّہ آیا اور چہرہ سُرخ ہو گیا۔ برآمدے میں آ کر گھنٹی بجائی۔ اندر کھٹ پٹ ہوئی۔ دِل بے تحاشا دھڑکا۔ بیرا دروازہ کھول کے ذرا سا جُھکا۔ وہیں کھڑے کھڑے اُس نے پُوچھا "میجر صاحب ہے؟"

"ہے۔ آئیے۔"

اندر گیلری میں جاتے ہُوئے اُس نے دل کو تھاما اور بے حد بشاشت سے گیلری کے دُوسرے سرے سے آتے ہُوئے براؤن سے کہا:

"ہلو براؤن۔"

براؤن نے جواب میں کہا "ہلو اولڈ بوائے۔"

نشست کے کمرے میں آکے وہ بہت مایوس ہوا۔ وہ یہاں نہ تھی۔ وہ جھنجھلایا گویا وہ یہاں اُس کی منتظر بیٹھی تھی۔ جیسے اُس نے یہاں ملنے کا وقت طے کر رکھا تھا۔ اُس نے یہ کہہ کر بات ٹالی "مگر میں تو براؤن سے ملنے آیا ہوں۔"

براؤن نے پوچھا "بیئر، وہسکی، جن؟" اور کیبنٹ کھولنی چاہی۔

"کچھ نہیں۔ میں چائے پی لوں گا۔"

براؤن نے حیرت سے دیکھا اور پوچھنے لگا "خیریت؟"

"بس جی نہیں چاہ رہا ہے۔" اُس نے کہا اور ڈھے جانے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

براؤن نے اُسے غور سے دیکھا اور پوچھنے لگا: "گرل فرینڈ کا انتظام کروں؟ وہیں ایف۔ سی کالج کے قریب ایک اینگلو انڈین فیملی ہے۔ اُس کے باپ کا نام ہارڈی ہے۔"

وہ سوچنے لگا "یہ بھی کنواروں کا ایک پرابلم ہے۔"

براؤن بولا "شادی سے پہلے وہ میری گرل فرینڈ رہ چکی ہے۔ اچھی لڑکی ہے: میرین۔"

اُسے بہت کوفت ہوئی۔ بیزاری سے کہنے لگا "بتادوں گا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔"

براؤن نے اُسے غور سے دیکھا اور سگرٹ ایش ٹرے میں رکھا اور

اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے، جھک کے کہنے لگا، "ایڈورڈ، شادی کر لو۔"

وہ جھنجھلا گیا بولا: "میں کیا کر رہا ہوں؟ بدمعاشیاں کر رہا ہوں؟ عورتوں کو اغوا کر رہا ہوں؟ بالکل آرام سے ہوں۔ پتا نہیں تمھیں کیا ہو رہا ہے۔"

براؤن کہنے لگا: "مجھے کچھ ہو رہا ہے یا تمھیں؟"

اِتنے میں جولیٹ داخل ہوئی "ہیلو ایڈورڈ۔"

اُس نے براؤن سے جان چھڑائی اور "ہلو جولی" کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ جولیٹ براؤن کو یوں اس کے پاس راز داری سے بیٹھا دیکھ کے حیران ہوئی۔ پوچھنے لگی: "کیا بات ہے؟"

براؤن بولا: "کوئی بات نہیں۔ میں اِس سے یہ کہہ رہا ہوں کہ شادی کرلے۔ یہ بُرا مانتا ہے۔"

وہ جھلا کے کہنے لگا: "یہ بات نہیں ہے جولی۔ یہ جان کو آجاتا ہے تم نہیں جانتیں۔ یہ اسی طرح نینی تال میں میرے پیچھے پڑ جایا کرتا تھا۔"

جولی کہنے لگی: "ہاں، یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کی عادت ہے۔ یہ اِسی طرح کسی بات کے لیے میرے پیچھے پڑ جاتا ہے۔"

وہ بولا: "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جیسے یہ میرا گارجین ہو۔"

براؤن ہنسنے لگا۔ بولا "فی الحال اِس جگہ میں تمھارا گارجین ہی ہوں۔ کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔"

اِس پر وہ شکایتاً جولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "دیکھ رہی ہو جولی براؤن کیسی فضول باتیں کرتا ہے۔ شادی سے کیا ہوتا ہے۔ تمھاری

سال گرہ مجھ سے تین مہینے بعد ہوتی ہے۔ میں کنوارا ہُوں تو تم میرے گارجین ہو گئے۔ خیر، میں تمھاری گارجین شپ قبول نہیں کر رہا۔"

اور تھم تھم کے وہ دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید وہ آئے۔ اپنے میاں ہی کے ساتھ آجائے۔ خالی اُس کا میاں ہی آجائے۔ یہ تو معلوم ہو کہ براؤن ان لوگوں کو جانتا بھی ہے یا نہیں۔

پھر وہ جانے کو اُٹھ کھڑا ہُوا۔ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے اُس نے پلٹ کے کہا "یس، براؤن"۔ جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ جیسے وہ اُس سے کہنے والا ہو کہ ابکی آؤں تو اُسے بُلا رکھنا۔ پھر وہ گڑبڑا کے کہنے لگا "میرا مطلب ہے اب کب آؤں؟"

یہ بھی کوئی سوال تھا اور وہ بھی براؤن جیسے بچپن کے یار سے۔ ہزاروں بار اکٹھے اُنھوں نے وقت گزارا تھا۔ ساتھ پڑھا تھا۔ اپنے فلیٹ میں جانے سے پہلے وہ اُس کے ساتھ رہا تھا۔ جولی کو بھی حیرت ہُوئی۔

براؤن نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا: "جب میں تمھیں مدعو کروں۔ میں کہتا ہُوں تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔ یہ تنہائی ہے، جو تمھیں کریک کر رہی ہے۔"

وہ بڑبڑایا "کنوارا ہونا بھی ایک عذاب ہے"۔ اُس کے بڑبڑانے پر براؤن کہنے لگا: "ضرور تمھارے ساتھ کوئی گھپلا ہے۔"

اس پر وہ بولا "میرے ساتھ کوئی گھپلا نہیں ہے۔ میں تو اس

خیال سے کہہ رہا تھا کہ آج کل تُم جنگ کی وجہ سے مصروف ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے ایڈورڈ۔"

وہ جھلایا "اچھا تو کوئی اَور بات ہو گی جو تمھیں معلوم ہو گی۔"

براؤن ہنسا اور کہنے لگا، "معلوم تو نہیں ہے البتہ کرُوں گا۔"

جاتے جاتے دھیرے سے اُس نے کہا۔ "کر لینا۔"

جولی نے اُسے روکا "ہاں ایڈورڈ، آٹھ کو شیرل کی سال گرہ ہے۔ تمھارے بچے نہیں تو تُم خود آجانا۔"

"اوہ" اُسے خیال آیا۔ وہ آج بچّوں سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ پُوچھنے لگا "بچے کہاں ہیں؟ شیرل کو بُلوانا۔"

شیرل آئی "ہیلو انکل ایڈورڈ۔"

"ہیلو سویٹ گرل۔ میں نے سُنا ہے تم بہت بڑی ہونے والی ہو۔ میں کیا لاؤں تحفہ؟"

"پیانو، انکل ایڈورڈ۔"

اس پر براؤن کہنے لگا "ایڈورڈ، بڑا والا نہ اُٹھا لانا۔"

وہ اَور غصّے ہُوا۔ "میں پاگل تو نہیں ہُوں۔ اگر میرے بچے نہیں تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ مجھے کسی بات کا اندازہ ہی نہیں۔"

جولی کہنے لگی "سچ تو ہے براؤن۔ اب اس کی ٹانگ گھسیٹنا چھوڑ دو۔"

چھاؤنی میں اُس نے موٹر آہستہ چلائی۔ شاید وہ نظر آجائے۔ ہر جیپ کو غور سے دیکھتا اور سوچتا رہا "تمنائیں یُوں آسانی سے پُوری

نہیں، تو نہیں۔ یہ دل ہی ایک شے ہے جو سخت احمق ہے۔ بچارا دل، دماغ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے دوڑتا ہے مگر خود احمق ہے۔"
اُس نے لمبی سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔

آگے کچی فٹ پیری پر کچھ گھوڑے جا رہے تھے۔ گھوڑے دیکھ کر اُسے شربت السرج کا خیال آتا تھا اور تکلیف ہُوا کرتی تھی۔ آج صرف خیال آیا، تکلیف نہیں ہُوئی۔ وہ سوچنے لگا، "وقت شاید مرہم ہے اور میں وقت کا لحاظ کیے بغیر ایک قوسِ قزح کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

شمپا اُس کے سینے سے سر لگائے بیٹھی تھی۔ وہ کاہل ہو رہی تھی۔

"اُٹھو نا شمپا" اُس نے کہا۔

آج اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ابھی تک تھالی میں یُونہی رکھا تھا۔
"تھوڑے سے بھات تو کھا لو۔"

"اُوں ہُونہہ۔ امّی کو وجہ بھالو نالا گے۔"

وہ چُپ چاپ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ شمپا کے اعصاب پر تھکن طاری ہو رہی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ وہ اُسے رنج سے دیکھتا رہا اور سوچنے لگا "نہ میں یہاں آ کے رہتا نہ مجھے یہ بیماری لگتی۔ نہ شمپا میرے پاس آتی نہ خود بیمار ہوتی۔ پر میں خود نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں میں اس کی ماں کی تپش آتا مجھے کھینچ لاتا۔ اللہ۔ میرا کیا ہے۔ یہ اچھی ہو جائے۔

یہ اسے میری خدمت اور محبت کا صلہ ملا ہے۔ محبت اور اس کا صلہ۔ یہ شے کیا ہے؟

"مجھے ہوش نہ رہا اور میں غم سے آشنا ہُوا۔ یہ غم کیا ہے۔ میری رُوح پر بھی غم ہے۔ مجھے بھی ہوش نہ رہا تھا اور میں نیچے اُترتا چلا گیا۔ پر اس کے پیروں میں چھاؤں کب تھی جو بجتی۔ البتہ ترنم تھا۔ میں یہاں کس لیے بیٹھا ہُوں، یہ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ اُن کی بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو یہاں مُنتظر بیٹھے رہے۔ میں یہاں بیٹھا ہُوں موت اور اُس سے بھی پرے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے۔ فاصلے اور وقت کوئی چیز نہیں۔ فی الحال وہ وقت کے فاصلے طے کر رہا ہے۔ وہ کوئی عیسیٰ نہ ہوگا۔ وہ اپنی تکمیل کرنے آئے گا، اِس لیے کہ وہ غم سے آشنا ہوگا۔ وہ تڑپے گا۔ تب وہ اَوروں کا دُکھ ڈھونڈے گا جو اُس کے دُکھ کو ہلکا کر دے۔ ہم تڑپیں گے اور اُسے بلائیں گے۔ کشش، کشش کو کھینچے گی۔"

یہ کوڑھ کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ سفید داغ تقدیس کے نشان ہیں۔ اِسی غرض کے لیے عیسیٰ کو معجزہ عطا ہُوا اور اُس نے مسیحا کا لقب پایا۔ پر اَے مسیحا، اب وقت آتا ہے کہ تو اِس سرزمین پر قدم رکھے کہ داغ داغ دل تجھے بُلاتے ہیں۔ اے خُدا شمپا کے لیے اُسے بھیج دے۔ اے خُدا تو جانتا ہے کہ اسے چھوڑ کے نہ میں مر سکتا ہُوں نہ اسے مرتے دیکھ سکتا ہُوں۔ اے گوتم، مانا کہ میں تیرا ناکارہ پیرو ہُوں، پر تُو خُدا سے میری سفارش کر۔"

نہیں۔ تو تیں۔ یہ دل ہی ایک شئے ہے جو سخت احمق ہے۔ بچارا دل دماغ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے دَوڑتا ہے مگر خود احمق ہے۔"
اُس نے لمبی سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔
آگے کچی فٹ پیری پر کچھ گھوڑے جا رہے تھے۔ گھوڑے دیکھ کر اُسے شربت السرج کا خیال آتا تھا اور تکلیف ہُوا کرتی تھی۔ آج صرف خیال آیا "تکلیف نہیں ہُوئی۔ وہ سوچنے لگا' وقت شاید مرہم ہے اور میں وقت کا لحاظ کیے بغیر ایک قوسِ قزح کا پیچھا کر رہا ہوں۔

شمپا اُس کے سینے سے سر لگائے بیٹھی تھی۔ وہ کاہل ہو رہی تھی۔
"اُٹھو نا شمپا" اُس نے کہا۔
آج اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ابھی تک تھالی میں یُونہی رکھا تھا۔
"تھوڑے سے بھات تو کھا لو"
"اُوں ہُونہہ۔ امی کو وہ چیز بھالو نالا گے"
وہ چُپ چاپ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ شمپا کے اعصاب پر تھکن طاری ہو رہی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ وہ اُسے رنج سے دیکھتا رہا اور سوچنے لگا "نہ میں یہاں آ کے رہتا نہ مجھے یہ بیماری لگتی۔ نہ شمپا میرے پاس آتی نہ خود بیمار ہوتی۔ پر میں خود نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں میں اس کی ماں کی بپتا آتما مجھے نیچے اُتار لائی۔ میرا کیا ہے۔ یہ اچھی ہو جائے۔

یہ اسے میری خدمت اور محبت کا صلہ ملا ہے۔ محبت اور اس کا صلہ۔ یہ شے کیا ہے؟
"مجھے ہوش نہ رہا اور میں غم سے آشنا ہُوا۔ یہ غم کیا ہے۔ میری رُوح پر بھی غم ہے۔ مجھے بھی ہوش نہ رہا تھا اور میں نیچے اُترتا چلا گیا۔ پر اس کے پیروں میں چھاگل کب تھی جو بجتی البتہ ترنم تھا۔ میں یہاں کس لیے بیٹھا ہُوں' یہ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ اُن کی بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو یہاں منتظر بیٹھے رہے۔ میں یہاں بیٹھا ہُوں موت اور اُس سے بھی پرے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے۔ فاصلے اور وقت کوئی چیز نہیں۔ فی الحال وہ وقت کے فاصلے طے کر رہا ہے۔ وہ کوئی عیسیٰ نہ ہوگا۔ وہ اپنی تکمیل کرنے آئے گا' اس لیے کہ وہ غم سے آشنا ہوگا۔ وہ تڑپے گا۔ تب وہ اوروں کا دُکھ ڈھونڈے گا جو اُس کے دُکھ کو ہلکا کر دے۔ ہم تڑپیں گے اور اُسے بلائیں گے کشش' کشش کو کھینچے گی"
یہ کوڑھ کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ سفید داغ تقدیس کے نشان ہیں۔ اسی غرض کے لیے عیسیٰ کو معجزہ عطا ہُوا اور اُس نے مسیحا کا لقب پایا۔ پر اے مسیحا' اب وقت آتا ہے کہ تو اس سرزمین پر قدم رکھے کہ داغ داغ دل تجھے بلاتے ہیں۔ اے خدا شمپا کے لیے اُسے بھیج دے۔ اے خدا تو جانتا ہے کہ اسے چھوڑ کے نہ میں مر سکتا ہُوں نہ اسے مرتے دیکھ سکتا ہُوں۔ اے گوتم' مانا کہ میں تیرا ناکارہ پیرو ہُوں' پر تو خدا سے میری سفارش کر"

ایک ذرا جو شمپا کسمسائی تو اُس نے کہا "آ، میں تجھے کویتا سناؤں"۔
وہ کہنے لگی: "اپنی کہی ہوئی؟"
وہ افسوس سے کہنے لگا: "جو میں وہاں اُوپر رہتا تو کویتا بھی کہنے
لگتا۔ پر یہ میں داڑھی والے کی سُناتا ہوں"۔
وہ کہنے لگی: "اُسی کی سُنا دو"۔
وہ بولا: "لمبی داڑھی والے نے کہا ہے شمپا کہ

راہ تکتے تکتے
تیری زلفوں پہ سفیدی آئی
اور اِس پر بھی تو تنہائی میں
منتظرِ آواز رہا۔

تب اُس نے کہا، ہاں رہا۔ اِس خیال سے کہ آج نہیں کل تو آئے
گی وہ آواز۔
"تو سمجھی شمپا، وہ آئے گا۔ ایک مسیحا، زخموں کا مداوا لے کر"۔
وہ کہنے لگی: "اور تم اچھے ہو جاؤ گے"۔
"میں نہیں شمپا، تم"۔
"جو تم وہاں رہتے تو بڑے لیکھک ہو جاتے۔ کویتا بھی کہنے لگتے۔
تم وہاں سے کیوں آ گئے؟"
اِس پر وہ کہنے لگا: "بس میری مرضی۔ میں آ گیا۔ جو کام ہو گیا
اس کا پوچھنا کیا"۔

وہ کہنے لگی "تمھیں کسی سے محبت ہو گی۔ کیا مجھ سے ہے؟"
مانتی کے طالب علم نے قدرے توقف کیا۔ پھر کہنے لگا "ہاں،
ہے۔ مگر کسی کے وسیلے سے"۔
وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی اور بُرا مان کے کہنے لگی "بات تیرے کی۔ یہ
بہت بُری بات ہوئی۔ تم نے وہاں پڑھا ہوتا۔ وہاں رہے ہوتے۔
فضول بھکاریوں کے چکر میں پڑ گئے۔ کویتا کہنی سیکھی ہوتی"۔
"کیوں سیکھتا؟ کیوں پڑھتا؟ اِس سے مجھے کیا ملتا۔ کیا فرق پڑتا؟"
وہ ہنس کر کہنے لگی: "اب کیا مل رہا ہے؟ اب کیا فرق پڑ رہا ہے؟"
وہ بڑے سرور سے کہنے لگا: "تجھے کیا معلوم مجھے کیا مل رہا ہے، میں
کیا پڑھ رہا ہوں۔ میں کیا سیکھ رہا ہوں۔ تو کیا سمجھے کیا جانے۔ تجھے
فرق کیسے سمجھاؤں۔ وہ بھکارن تھوڑی تھی۔ بھکاری تو میں تھا۔
مانگتے مانگتے یہاں تک آ گیا۔ کبھی کبھی بالواسطہ بھی محبت کی جاتی ہے"
"وہ تو وہاں رہ کے بھی کر سکتے تھے"۔ وہ رنج سے کہنے لگی۔
"جب میں سمجھا نہ تھا۔ پھر یہ بھی تو عبادت ہے۔ کسی اور کام میں
دھیان ہو تو اس میں فرق آتا ہے۔ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے جو کام بھی
کرے اور محبت بھی کرے۔ شاید وہ آنے والا ایسا ہی کرے۔ جب دِل
ٹوٹتا ہے تو آدمی جھکتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دلوں سے مل جاتا ہے۔
شاید اُس کا دل ابھی نہ ٹوٹا ہو۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ کچھ رِشی ہُوا جا رہا
ہُوں۔ میرا دِل مجھے باتیں بتانے لگا ہے"۔

وہ ہٹ سے کہنے لگی: "پر تم وہاں کیوں نہیں رہے؟"

"تو بڑی جھکی ہے۔ وہ تو ایسی نہ لگتی تھی۔ پر وہ بھی جھکی ہی ہو گی جو مجھے کھینچ لائی۔ محبت بھی ذہن کی ایک جھک ہی تو ہے۔ ہے نا! جب ہی تو تو گڑھ لگا کے بیٹھ رہی"

اِس پر وہ بولی: "اور پھر بھی تم نہ ملے"

"ہاں شمپا، میں نے بھی کونڈھ لگایا۔ علم چھوڑا، گیان چھوڑا، سکھ چین چھوڑا پر وہ نہ ملی۔ بڑا درویش ہے وہ جو پھر بھی کام سے لگا رہا۔ خود سہارا کھویا مگر اوروں کو سہارا دیا۔ دیکھو کب آتا ہے"

یہ وسط نومبر کی شام تھی۔ ہلکی سی خنکی بڑھ گئی تھی اور یہ خنکی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ جاڑے کی مخصوص سوگواری شروع ہو گئی تھی۔

ہسپتال واپس آ کر اُسے خیال آیا کہ کل شیرل کی سالگرہ ہے اور اُسے پیانو خرید کے دینا ہے۔ مگر یہ پیانو ملتے کہاں ہیں؟ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ شاید انار کلی میں ملتے ہوں۔ مگر نہ انار کلی وہ کبھی گیا تھا اور نہ اُس کا اِرادہ تھا۔ سُنا تھا وہاں بہت گڑبڑ ہوتی ہے۔ وہ امریکن تو تھا نہیں اور نہ ٹورِسٹ تھا جو شہر کے کونے کھدروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

اُس نے اپنی دائیں طرف ایک نظر ڈالی، کمرشیل بلڈنگ میں کھلونوں کی دُکانیں تھیں۔ مگر آج اُس نے گرد بہت کھائی تھی۔ ہسپتال سے داتا صاحب کے دربار تک سڑک خراب تھی۔ اِس کے علاوہ بغیر تہائے دھوئے وحشیوں کی طرح دُکانوں میں گھسنا وضع کے خلاف تھا۔ اگر مال روڈ پہ مل جائے تو اچھا ہے۔ مگر مال روڈ پر پٹھان درزی اور کچھ جوتوں کی دُکانیں تھیں۔ عین اِس وقت اُسے احمد یاد آیا۔ اُسے ایسی باتوں کی خبر رہتی تھی۔ یہ خان تو یہاں اُس سے بھی زیادہ اجنبی تھا۔ پھر اُس نے

ذہن پر زور ڈالا اور مُسکرا کے سوچنے لگا " شاید اُس دُکان پہ مل جائے جہاں میں نے جیری کین پُوچھا تھا "

پھر وہ تھوڑا سا اُداس ہُوا اور مال روڈ سے اپنی سڑک پر مُڑتے ہوئے اُس نے ایک بار چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید کوئی جیب نظر آجائے مگر ایسا نہ ہُوا ۔ بوجھل قدموں سے اُوپر چڑھتے ہُوئے اُس نے جُھنجھلا کے سوچا " یہاں میں اکیلا ہُوں اِس لیے سوچنے زیادہ لگا ہُوں ۔ اور یہ سارے ذہن کے جھنجھٹ ہیں ۔ کبھی کسی نے قوسِ قزح کا بھی پیچھا کیا ہے ۔ تنہائی بڑھ گئی ہے اور کچھ نہیں ۔ پیانو خرید کے مجھے کلب جانا چاہیے "

اور یہ خان بظاہر بڑی چھوٹی سی اُلجھن پیدا کرتا تھا مگر وہ دیر تک کوفت کا باعث ہوتی تھی ۔ اُس نے شام کے لباس کے ساتھ رات کے کھانے کا موزہ لگا دیا تھا ۔ ایڈورڈ نے دراز کھول کر شام کے کپڑوں کے ساتھ کا موزہ نکالا اور ساتھ ہی خان کو جز بز ہو کر نرمی سے فرق سمجھایا ۔

نہا دھو کر وہ کھڑا ہُوا تو جیسے کچھ ڈھونڈنے لگا ۔ جب وہ تیار ہو کر کھڑا ہوتا تھا تو احمد اپنے ہاتھ سے اُس کی جیب میں رُومال رکھتا اور کاج میں اَدھ کھلی کلی لگاتا تھا ۔ خیر پھول کی تو کوئی بات نہ تھی ۔ لیکن کپڑے پہنا کر وہ آخری بار بڑے چاؤ سے برُش بھی کرتا تھا اور پھر سر سے پیر تک اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ۔ آج سے پہلے اِس خیال سے اُسے اتنی شدید تکلیف کبھی نہیں ہُوئی تھی ۔

" وقت ـــــ " اُس نے سوچا اور مُڑ گیا نیچے اُترنے کو ۔ شام زیادہ

ہو گئی تھی " جیری کین کی دُکان بند نہ ہو جائے " وہ پھر مُسکرایا اور چل دیا ۔

سیلز مین اُس کی طرف بڑھا ۔ وہ اُسے پہچان گیا تھا اور سوچ رہا تھا " دیکھو آج یہ کیا مانگتا ہے ! " مگر آج گورا دیوانگی میں نہ تھا ۔ اُس نے پیانو مانگا ۔ لیکن اُس کا رنگ بھی ایک مسئلہ تھا ۔ تین رنگ کے پیانو تھے ۔ کالا ، سُرخ اور نیلا ۔ تھوڑی دیر وہ چُپ کھڑا رہا ۔ اِدھر اُدھر دیکھتا بھی رہا اور چُپکے سے کہنے لگا " ہر روز کرسمس نہیں آتا کہ کیک کھانے کو ملے " پھر وہ سیلز مین سے ہی پُوچھنے لگا کہ کس رنگ کا پیانو خریدے ؟

سیلز مین نے پُوچھا " لڑکی ہے یا لڑکا ؟ "

" لڑکی "

" تو آپ سُرخ لے جائیے "

اُس نے سُرخ لے لیا ۔ اُس کا کلب جانے کا ارادہ تھا ۔ باہر آ کے وہ سیڑھیوں پر چند منٹ مُنہ اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا ۔ پھر مال روڈ پر آ کر کلب جانے کا ارادہ مُلتوی کر دیا اور گھر کی طرف مُڑ گیا ۔ گھر آ کے اُس نے مغربی موسیقی سُننے کی کوشش کی مگر اُس کے سُر سرور انگیز تھے پھر اُس نے مدراس سے لائے ہُوئے ستار کے ریکارڈ سُنے ۔ اِن سے وہ رنجیدہ ہُوا ۔ آخری ریکارڈ اُس نے پھر انگریزی لگایا ۔ یہ والز کا ریکارڈ تھا ۔ گانے والے کی آواز صاف گہری اور دل کش تھی ۔ رنج اور خوشی کا تاثر مدغم تھا ۔ یہ اُسے اچھا لگا اِس موسیقی نے اُس کے جذبات کو مُتوازن رکھا ۔ پھر وہ کھڑا ہُوا اور یہ " اُسے تھاپ دینے لگا "

"والز" اُس نے سوچا "سنگیت کے گیان کے بغیر بے معنی ہو جاتا ہے"
پھر اُس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور سوچنے لگا "یہ اکثر خالی ہی رہے۔
انھیں ہم رقص شاذ و نادر ہی نصیب ہُوا۔ انھیں کسی خاص ہم رقص کی
تلاش ہے"

پھر وہ بیٹھ گیا اور خالی پیر چلانے لگا۔ ویسے وہ بال رُوم ڈانسنگ
کا زیادہ شوقین نہ تھا۔ کبھی کسی موقعے پر تکلّفاً کسی کا ساتھ دے دیتا تھا۔

کھانا کھا کے وہ لیٹ گیا اور ایک ناول پڑھنے لگا۔ رومانس شروع
ہونے پر بور ہُوا اور کوڑھ سے متعلق ایک کتاب پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے
مضمون کے بیچ میں اُنگلی رکھ کے اُس نے کتاب ذرا بند کی اور سوچنے لگا
"کوئی ضرورت نہیں راہ گیروں کے متعلق سوچنے کی۔ کیا واہیات پن ہے۔
جتنا کسی چیز کے متعلق غور و خوض کرو اُتنا ہی وہ ذہن پر دیوانگی کی طرح
مسلّط ہو تی جاتی ہے۔ ذرا سی قوّتِ ارادی کی بات ہے"

اُس نے سر کو جھٹکا اور پھر پڑھنے لگا۔ مگر وہ دیوانگی سر میں موجود رہی
اور وہ توجّہ سے نہ پڑھ سکا۔ شاید نیند آ رہی تھی۔ اُس نے کتاب بند
کر دی اور سوچنے لگا۔ اِس کا کچھ مداوا کرنا چاہیے۔ وہ میرین کون ہے؟
کل براؤن سے پُوچھوں گا"۔ مگر پھر اُسے ایسا لگا جیسے وہ خود اپنا مذاق
اُڑا رہا ہے۔ ایک بار پھر سونے کی نیّت کرتے کرتے اُس نے اُلجھ کے
کہا "کیا خرافات ہے"

شاید اندر کیک کٹ رہا تھا۔ بڑی زور سے اُس کا دل دھڑکا۔ حالانکہ
اِس وقت اُسے اس کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ گھر پہ
تیار ہونے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ براؤن دیکھتے
ہی کہے گا "مُعزّز مہمان آ گیا"

گیلری کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر کھانے کے کمرے میں بتّیاں جھلملا
رہی تھیں۔ براؤن نے اُسے دیکھا اور اُس نے وہی کہا جو اِس نے سوچا
تھا۔ "مُعزّز مہمان آ گیا"

اُوپر سجاوٹیں ٹنگی تھیں اور قمقمے جھلملاتے تھے۔ بچّے اور بڑے
سب ہی تھے۔ دبا دبا شور تھا۔ شیرل سفید جھالروں کی فراک میں
پُھدکتی ہُوئی آئی "انکل ایڈورڈ" اور انکل ایڈورڈ نے اپنے آپ کو
کہتے سُنا "ڈارلنگ"۔ وہ تھوڑا سا جُھکا اور بغیر پیار کیے پیالو اُس کے ہاتھ
میں تھما دیا۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کیک کون کاٹے؟ "ممی" مگر ممی ذرا جھینپی۔
"ڈیڈی" مگر ڈیڈی نے کہا "یہ کام مُجھ سے نہیں ہو گا۔ ایڈورڈ تم کرو گے؟"
اور ایڈورڈ نے کہا "نہ۔ میں نے اپنا کیک ہمیشہ غلط کاٹا"۔ خود شیرل کو
ڈر تھا کہ کہیں اُوپر کا تھام جھام نہ گر جائے۔ اُس نے بغیر سوچے سمجھے
کہا "آنٹی زہرہ کاٹ دیں گی"

اور تب اُس نے اُسے دیکھا۔ زرتار سجاوٹوں کے نیچے جھلملاتے
قمقموں اور جلتی ہُوئی پگھلتی ہُوئی شمعوں سے اُوپر۔ دل ایک جھٹکے کو

دھڑکنا بھُولا اور دِل کا وہ خاموش لمحہ کِس قدر اذیت ناک تھا۔
"دِل سا احمق ساتھی"۔
اِس سے زیادہ وہ نہ سوچ سکا اور کُرسی پر بیٹھ گیا۔ کیک غلط کٹا۔ زہرہ کے ہاتھ سے طشتری گرتے گرتے اِس لیے بچی کہ ایڈورڈ نے اُسے تھام لیا تھا۔ ایک ٹک اُن کی نظریں ملیں، پھر ایڈورڈ نے سر جھُکا کے دِل میں کہا "میرے پاس کچُھ نہیں ہے۔ جو کچُھ تھا وہ حاضر کر دیا میری تلاش تمام ہُوئی۔
طلبِ صادق کی بات تھی کہ مطلُوب موجود ہُوا۔ ورنہ قوسِ قزح کو بھی کسی نے پکڑا تھا"۔
تب بچّوں نے مِل کے گایا "پیدائش کا دن تمھیں مُبارک ہو۔ آج کا دِن تمھیں مُبارک ہو"۔ اُنھوں نے پھر ایک دُوسرے کو دیکھا اور صرف وہ مُسکرایا اور براؤن کے ساتھ گول کمرے میں چلا گیا۔ براؤن نے اُسے جام پیش کیا اور اُس نے یہ کہہ کر رد کر دیا "آج سے اِس سے پینا تمام ہُوا"۔
پھر براؤن نے اُسے سُرخ بالوں والی میم سے ملوایا۔ اُسے دیکھ کے وہ بدکا اور ہاتھ ملا کے پیچھے ہٹ گیا۔ مگر وہ مسرُور تھا۔ جام اُس کے لب تک آیا نہ تھا پھر بھی وہ نشے میں چُور تھا۔
براؤن نے اُسے کپتان راؤ ارشد علی خاں سے ملوایا جو چند مہینے بعد محاذ پر جانے والا تھا۔ اُس سے مل کر وہ بے حد ناخوش ہُوا۔ حسد کا ایک طُوفان تھا جو اندر ہی اندر اُٹھ رہا تھا "ہلو" کہہ کر وہ ریکارڈ

بدلنے کو مُڑ گیا۔ ہاتھ مِلانے کا تکلُّف بھی نہ کیا۔ "یہ وہی ہے" اُس نے سوچا "جو اُس کے ساتھ ہُوا کرتا تھا" پھر بڑی بے رحمی سے جھک کے دل میں کہا "جاؤ اور جاکر واپس نہ آنا"
شُکر ہے کہ براؤن نے اُس کی بد اخلاقی پر دھیان نہ دیا۔ وہ معرُوف تھا ورنہ اُسے آلیتا اور ایک مُصیبت کھڑی ہو جاتی۔
راستے میں اُس نے سوچا، یہ شہر شہروں کا تاج ہے۔ میں اِسے غلط سمجھا تھا۔ گھر میں سجے ہُوئے پھُولوں کے رنگوں کے معنی اِس کی سمجھ میں آئے۔ رنگ گرم اور شوخ تھے۔ اُن کا اثر اِس نے محسُوس کیا۔ چھجے میں کھڑے ہو کر اِس نے سامنے دیکھا۔ سڑکوں پر سنّاٹا تھا۔ مگر دُنیا جاگتی تھی۔ اِرد گرد زندگی جان دار تھی اور رُوح بیدار تھی۔ اِس وقت سے اُس نے اپنے لاچار مریضوں سے محبت کرنا شروع کی۔ نرمی اور رحم کا جذبہ ایک چشمے کی طرح اُس کے دل میں پھُوٹ پڑا، جیسے کسی نے اُس پر سے بند اُٹھا دیا ہو۔ وہ حقیقت کی دُنیا میں آیا اور فریب کے پردے کسی نے دماغ کی کھڑکیوں پر سے ہاتھ بڑھا کے ہٹا دیے۔ تب روشنی کی اُجلی کرن داخل ہوئی۔ اکیلی اور شفّاف کرن۔ نوُر ــــ سماوات کا نوُر، جسے اُس نے تھام لیا اور جس کے لیے عیسیٰؑ سے خُدا نے فرمایا تھا۔ "اِس اکیلی روشنی کو اے عیسیٰؑ تھام لو اور سُولی پر چڑھ جاؤ"۔ اُنھوں نے تھاما اور سُولی کی کلفتوں میں راحت پائی۔ پھر اُس نے

اُنھیں اُٹھالیا۔ شاید اپنے ہاتھوں پر — اور اُس نے بھی اِس
تنہا روشنی کی کرن کو تھام لیا —— اور تب زندگی نے اِس کو
اچنبھے سے دیکھا ۔ ایک نئی راہ پر اِسے گام زن کیا اور
بہالے گئی ۔

بغیر کسی معقول اور مُناسب وجہ کے وہ عورت اُس کے مُستقبل
پر چھاگئی ۔

"جو راہ گیر تھی اور مجھے راہ میں ملی تھی" — پلنگ پر تنہا لیٹے لیٹے
اُس نے چھت کو دیکھا اور سوچنے لگا ۔

اُسے حرارت تھی اور نیلی آنکھوں میں سُرخی کی آمیزش تھی ۔ حسّاس
دِل تھوڑا سا محزون تھا ۔ اُسے کچھ ٹھنڈ لگی تھی اور کچھ لائل پور میں کوٹھی
سجوانے میں گرد کھائی تھی ۔ اب وہ چُپ چاپ اکیلا بیٹھا تھا اور آہستہ
آہستہ چیونگ گم چبا رہا تھا ۔ کل اُس نے ممی کے خط کا جواب دیا تھا لیکن
باوجود کوشش کے تفصیل سے نہ لکھ سکا ۔ اِس میں اُس نے فیصلہ کُن الفاظ
میں شادی نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ خوش ہے
اور مزے میں ہے ۔

اِس وقت اُس کے دل کو چین تھا ۔ تمام رِشتہ داریاں مُنقطع کرکے،
یہ اُس نے خود نہیں کی تھیں ۔ یہ اپنے آپ ہی ٹوٹ گئی تھیں ۔
ذہن ایک تختی تھا جس پر سے پچھلا لکھا ہُوا مِٹ چُکا تھا ۔ وہ چند لڑکیاں
جو کبھی زندگی میں آئی تھیں، اس ایک اکیلی کرن کے داخل ہوتے ہی

آہستہ آہستہ تاریکی میں چھپ گئی تھیں اور اُس کو اُن کے کھوئے جانے کا
کوئی ملال نہ تھا۔ پھر وہ دل میں کہنے لگا "راہ گیروں سے بھی کسی نے دل
لگایا ہوگا۔ ایسا حادثہ بھی کسی کو پیش آیا ہوگا اور یہ بھی خوب ہے کہ
جس طرف دیکھتا ہُوں تُم ہی تُم نظر آتی ہو۔ کچھ میرے ہی ذہن کو
ہوگیا ہے۔ ذرا سا خیال، ذرا سا جلوہ اُس دن دُکان کے آگے جھلک
دکھا کے میری تقدیر بدل گیا۔ ایسا تو کبھی نہ ہُوا ہوگا۔ میں ہی دیوانہ ہوں
اور اب تو یہ ہوگیا ہے کہ جس دن تُمھیں دل سے یاد کرتا ہوں، تُم
مُجھے کوچہ و بازار میں نظر آجاتی ہو۔ دیکھو کل تم مُجھے کتابوں کی دُکان میں
نظر آئی تھیں کیونکہ میں نے تُمھاری تمنّا کی تھی۔ یہ میری ہی طلب
صادق کا کرشمہ ہے ورنہ تُم تو ایسی ہو کہ اب تک سلام دُعا کے سوا
بات بھی نہ کی۔ اچھا تمھاری مرضی۔ نظر آتی رہا کرو۔ یہی کافی ہے۔
اور آج میری طبیعت خراب ہے اور تم مُجھے بہت یاد آ رہی ہو۔
بس ایک ذرا سی قریب ہوتیں۔ تھوڑے سے فاصلے کی بات ہے۔
تھوڑی سی کسک اُس نے دل میں محسُوس کی مگر پھر اُس نے
اُمّیدوں کے چراغ جلائے۔ آج ہفتے کی شام وہ لیٹ کے گزارے
گا۔ کل براؤن کے یہاں جائے گا۔ اور براؤن کے یہاں تو اتوار
کے اتوار میلہ لگتا تھا۔ براؤن کی بیوی چند خواتین کو اکٹھا کرتی اور
اُنھیں سپاہیوں کے لیے سویٹر بُننے کو دیتی۔ ایسے ہی چھوٹے موٹے
کام کرکے خواتین اپنے کو رضاکاروں کی صف میں شامل کرکے سمجھتی

پا رہی تھیں۔ ایک ایک پیالی کافی پر کچھ خوش گپیاں ہوتیں، کچھ گھریلو اُمور پر
تبادلۂ خیالات ہوتا اور اس لڑتی جھگڑتی دُنیا میں یہ لمحے غنیمت اور سکون بخش
ثابت ہوتے۔
زُہرہ کی دیورانی، سُرخ بالوں والی میم نے، باقاعدہ زُہرہ کو بھی ہر اتوار
کو وہاں لے جانا شروع کر دیا تھا، یہ کہہ کر کہ ہندوستانی عورتیں تو بہترین
مشغلہ وقت ضائع کرنا سمجھتی ہیں۔ اور یہ کہ پھر تُمھارے پڑھنے لکھنے کا فائدہ
کیا ہُوا؟ اور تُمھارے اپنے سپاہی بھی تو لڑ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔
ہر اتوار کو تو وہ شاید نہ جاتی۔ مگر وہ جو صُبح صُبح ہر اتوار براؤن کے
یہاں آنے لگا تھا، اُسے دیکھ کے اُس کو خواہ مخواہ ہی گھبراہٹ ہونے
لگتی تھی۔
وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کل براؤن کی بیوی سے کہے گا کہ وہ سب سے تو
ہنس ہنس کے بولتی ہے مُجھ سے کیوں نہیں بولتی۔ اُسی کے سامنے کہے گا۔
وہ اِس وقت اُسے بہت یاد آ رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور
دِھیرے دِھیرے میٹھی میٹھی نیند اس کی آنکھوں میں آنے لگی، جس میں اُمّید
کی شمعیں فروزاں تھیں اور مسرّت کے پھُول کھلتے تھے۔ وہ اِن شمعوں کی
دِھیمی دِھیمی روشنی اور ان پھُولوں کی مہک میں آرام سے سوگیا۔

اور جب تنہائی بُہت محسُوس ہونے لگتی ہے اور حُزن کی نقاب تمھارے
چاروں طرف دبیز ہوجاتی ہے اور دوستی کا لفظ یکسر ذہن سے اوجھل ہوجاتا

ہے، تب تمھیں راہ میں ایک اجنبی ملتا ہے، جس کا تمھیں اِنتظار تھا اور شاید وہ بھی مُنتظِر تھا۔ اور یہ پُوچھنا یا جاننے کی خواہش کرنا کہ تُم اُس کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہو، اِس واقعے کی موت ہے۔

"اور بھلا تُم مجھے کہاں ملے، سرِ راہ۔ میں نے تمھیں دیکھا تھا، جب تُم کرپارام سے نکل رہے تھے اور جب جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ چاہے تُم نے نہ دیکھا ہو۔ اور میں نے تمھاری آواز سُنی تھی جب تُم نے جیری کین پُوچھا تھا۔ اِس آواز کا مُجھے اِنتظار تھا۔ دیر سے آئی پر آئی تو۔ ہمیشہ راہ میں رُک رُک کے میں نے مختلف آوازوں کو سُنا اور غور کیا تھا اور اِن میں تمھاری آواز کو تلاش کیا تھا۔ تُم اب بھی میرے سامنے کھڑے، اپنا مُنہ ذرا سا موڑے، جیری کین مانگ رہے ہو۔ اور میرے آگے مستقبل کے کوئی خوش آیند خواب نہیں۔ اگر یہ آواز پہلے بھی آتی تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اِسی لیے یہ دیر سے آئی۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ کیونکہ عقل اب عُمر کی اُس منزل میں ہے کہ میں نے اُسے سکون سے سُنا اور سمجھا بھی۔ ہمارے اُوپر نہ آسمان ہے اور نہ پیروں تلے زمین۔ ہم مُعلق ہیں۔ مگر تُم ہو۔ یہ خواب نہیں ہے۔ یہ فریب نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے"۔ زُہرہ نے سویرے سویرے اُٹھ کر چائے پیتے ہُوئے سوچا۔

رات بہت بے آرام کٹی تھی اور پچھلے پہر، سحر کے وقت اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کروٹ لیے لیٹا ہے اور بیمار ہے۔ خود اس کی

طبیعت بھی کئی روز سے خراب تھی اور رات نیند نہ ہونے کی وجہ سے سارا جسم ٹوٹ رہا تھا مگر وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی کیونکہ اُسے خواتین کی میٹنگ میں جانا تھا۔

بڑی کسل مندی سے اُس نے بستر چھوڑا اور کپڑے بدلتے بدلتے اُس میں پھُرتی آگئی۔ اُس نے اپنی دیورانی ایما کو نوکر سے کہلوایا کہ وہ اسے ساتھ لے کر جائے۔ لیکن ارشد نے کہا کہ پیدل نہ جاؤ۔ میں برج کھیلنے جا رہا ہُوں۔ تمھیں وہاں چھوڑ دُوں گا۔

وہ سب دس بجے گھر سے نکلے۔ خواتین کی میٹنگ دسؔ سے گیارہ تک ہونی تھی۔ ارشد نے اِن لوگوں کو پھاٹک پر چھوڑا اور ایما سے کہنے لگا: "معاف کرنا۔ میں تم لوگوں کو یہاں اِس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ اندر گیا تو میجر سے ملنا پڑ جائے گا۔ وہ ابھی تیار نہیں ہوگا اور اُس کے اِنتظار میں گیارہ بج جائیں گے۔ خواہ مخواہ میرا پروگرام خراب ہوگا"۔ وہ ہنسا اور چل دیا۔

میم کے بال دُھوپ میں زیادہ سُرخ نظر آ رہے تھے۔ وہ زُہرہ سے گردن لمبی تھی اور زُہرہ اُس کے پہلو میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ براؤن کے باغ میں سویٹ پی اور ڈیلیا کے پھُول کھلے ہُوئے تھے۔ برآمدے کے باہر سُرخ اینٹ کی فُٹ پیری پر سیوتی کے سفید پھُولوں کی پتیاں بکھری ہُوئی تھیں۔

تب ایڈورڈ نے نشست کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ اُٹھا کے اُسے

آتے دیکھا اور جلدی جلدی ٹائی پہننے لگا۔ براؤن نے اُس کے چہرے پر مسرت کے سُرخ پھول بلتے دیکھے تو چونکا اور اپنا شک مٹانے کو اخبار پڑھنے لگا ـــــ پہلے ایما اندر داخل ہوئی۔ ایڈورڈ کھڑا ہُوا اور پھر جلدی سے بیٹھ گیا۔ براؤن نے دیکھا کہ جب وہ اندر آئی تو وہ کھڑا نہیں ہُوا البتہ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ براؤن اخبار سمیٹ کے جانے لگا کیونکہ وہ ڈریسنگ گاؤن میں تھا۔ گیلری میں جاکر اُس نے سوچا "مگر ان میں سے کون سی ہے! شاید سُرخ بالوں والی" ـــــ وہ مُسکرایا اور خاموشی سے کپڑے بدلنے لگا۔

اور آج اُس کے سامنے اس نے جولیٹ سے کہا "یہ تمھاری دوست سب سے تو باتیں کرتی ہیں، مُجھ سے کیوں نہیں کرتیں؟"

وہ گھبرائی اور لرزتی ہُوئی آواز میں ٹھہر ٹھہر کے اُس سے باتیں کرنے لگی۔ پھر کچھ اور خواتین آئیں اور وہ اُن کے لیے جگہ چھوڑ کے کونے میں چمڑے کی مُنڈھیا پر بیٹھ گیا اور چُپکے چُپکے اُسے دیکھتا رہا۔ اِتنے لوگوں میں صرف وہ تھی وہاں جسے وہ دیکھ رہا تھا۔ اتنی آوازوں میں صرف اُس کی آواز تھی جسے وہ سُن رہا تھا۔

ایک گھنٹا وہ جما بیٹھا رہا۔ پھر براؤن کو دیکھ کے اُس نے سوچا "شکر ہے کہ ایک گھنٹا تم نے کپڑے بدلنے میں صرف کیا ورنہ مُجھے اُٹھنا پڑتا۔"

یہ مہینا نسبتًا اور مہینوں سے خُشک تر تھا۔ اُس نے شمپا کو جگایا:

"اُٹھو نا شمپا، بھور ہونے کو ہے۔ اُٹھو نا رانی۔"

شمپا نے کسمسا کے آنکھیں کھولیں۔ "ابھی سے کیوں اُٹھاتے ہو۔ ابھی تو بہت رات ہے۔"

اِس پر وہ کہنے لگا: "رات کہاں ہے۔ یہ کرن دیکھو۔ تمھیں نیند میں دِکھائی نہیں دیتی۔ یہ تمھیں جگاتی ہے۔ یہ تمھارے بالوں پر ہے۔ جب آنکھوں پر پڑے گی تب جگو گی۔ اب اُٹھ بھی چُکو۔"

شمپا ذرا سی اُٹھی۔ اُس کی کاجل ایسی آنکھیں نیندا سی تھیں اور بال پریشان تھے۔ اُس نے ایک ٹک جھک کے شمپا کی آنکھوں اور بکھرے ہُوئے بالوں کو دیکھا اور اُسے لپٹا لیا۔ وہ سوچنے لگا "یہ پہلی بار اِس رُوپ میں آئی ہے جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ یہ بالکل ویسی ہی لگ رہی ہے۔ اچھا کیا جو میں نے اِسے جگا دیا۔ میں اِسے روز اِسی وقت جگا دیا کروں گا۔"

پھر اُس نے شمپا سے کہا "پتا ہے، میں نے صُبح ہوتے کیا خواب دیکھا۔"

شمپا نے نیند کی ماتی آنکھیں بند کیں اور کہنے لگی: "کیا دیکھا؟"
ماضی کے طالب علم نے جُھک کے اُس کی آنکھوں پر پیار کیا اور کہنے لگا: "شمپا رانی! آنکھیں کھولو - میری طرف دیکھو تو میں بتلاؤں۔ اِن موندی ہُوئی آنکھوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے تم سُن ہی نہیں رہی ہو۔"

شمپا اِس پر ذرا سے طنز سے مُسکرائی اور اُسے دیکھنے لگی -
وہ کہنے لگا: "میں نے خواب میں پچھّم دیکھا - چاروں گھونٹ دُھوپ پھیلی تھی اور دُھوپ میں پُھول کِھلے تھے - اِن پھُولوں پر کوڑھی لیٹے تھے - ایک گورا گورا شخص اِن پر جُھکا تھا - پر پھر میں نے دیکھا کہ اُس کا دِل جو آبگینہ تھا، گر کے چُور چُور ہُوا - میں نے یہ دیکھا شمپا - بشارت دی گئی کہ وہ پچھّم سے آتا ہے۔"

"یہ تُم کوئی کویتا کہہ رہے ہو؟ یہ تُم پر لمبی ڈاڑھی والے کا اثر ہے جو ڈاڑھی بڑھا کے کویتا کہتا تھا۔"
پھر وہ اُٹھ کے بیٹھی - اُس نے ایک ذرا غور سے اسے دیکھا اور آنکھوں میں آنسُو بھر کے کہنے لگی: "اے! تُم جوزف کی سی باتیں نہ کرو - کُچھ نہیں - کوئی نہیں آتا - اور پچھّم میں کوڑھ کہاں - یہ تو یہیں پر ہے - ہم غریب ہیں نا اور گندگی میں رہتے ہیں - دھان کے کھیتوں میں - پانی میں ہمارے پاؤں سڑتے ہیں نا - وہاں تو سُنا ہے زمین خشک ہوتی ہے - بِنا پانی منوں اناج اُگتا ہے - وہ بڑے خوشحال لوگ ہیں - یہ

سب تمہارا وہم ہے۔"
ماضی کے طالب علم نے توقُّف کیا اور مُنتظر رہا - اُوپر سے بدلی گزر گئی اور پیلی پیلی دُھوپ پھیل گئی - تب شمپا کھڑی ہوئی -

"اِدھر کئی دن سے تم نہ راہ میں ملیں نہ براؤن کے یہاں نظر آئیں تُم اپنے یہاں مجھے بُلاؤ، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا - مگر آج مجھے وحشت بہت ہوتی ہے - اِس لیے میں براؤن کے یہاں جاؤں گا مگر براؤن سے کیسے پُوچھوں گا کہ تم کیسی ہو اور کیوں نہ آئیں؟
میں کسی سے کُچھ بھی نہیں کہہ سکتا، کُچھ بھی نہیں پُوچھ سکتا - اپنا بوجھ اپنے دل کی ناتوانی کے باوجود اس پر اُٹھائے پھرتا ہوں - تمہارا کیا ہے - تمہارے بچّے ہیں - گھر ہے - فُرصت کے اوقات ہی میں تو تُم مجھے یاد کرتی ہوگی - اور میرا یہ ہے کہ اِنتہائی مصرُوفیت میں، اہم ترین آپریشن کرتے وقت تو تُم اَور زیادہ ہی یاد آتی ہو - وہ شگاف جو میں کسی کے جسم میں لگاتا ہوں اُس میں سے بھی تمہاری آنکھیں جھانکتی ہیں - مگر میں تُم سے یہ سب کہہ تھوڑی سکتا ہوں - تمہارے سامنے تو میری زبان ہی نہیں کھلتی -

"اور اِس حادثہ کو محبت کہنا تو اس کی توہین ہے - محبت تو بہت پُرانی اور بہت عام سی بات ہے - کیتھرین سے مجھے محبت تھی - انیتا سے مجھے محبت تھی - اپنے گھوڑے اور بیٹے لڑکر احمد سے مجھے محبت

تھی۔ یہ تو دماغی فتور ہوا نا۔ یہ دل و جسم سے پرے ہے۔ دل تو اس کا بار اٹھانے میں ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ وہ اس کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہے۔ وہ خوش ہوا کہ اس سے دست بردار ہوا اور اس نے اپنی ذمہ داری ذہن کو سونپ دی۔ میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟ جانِ من، آرامِ دل، یہ تمام تو محبت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ تم تو شخصیت ہو۔ میرے پاس تمھارے لیے کوئی القاب نہیں۔ محبت کے آداب ہوتے ہیں۔ اِس کے تو کوئی آداب ہی نہیں۔ جب ہی تو میں تمھارے لیے کھڑا نہیں ہوتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ خود میری رُوح نکل کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔ کوئی خود اپنا بھی سواگت کرتا ہے؟

براؤن کے یہاں آکر اُسے معلوم ہُوا کہ وہ کئی دن سے بیمار ہے۔ اُسے یرقان ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال جانے والی تھی۔ دراصل سُرخ بالوں والی، جولیٹ کو بتا رہی تھی۔ ورنہ اُسے تو کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔

وہ رنجیدہ ہُوا۔ یہاں بہت سے لوگ تھے۔ مگر کمرہ اسے خالی خالی لگا۔ جیسے کچھ تُتلیاں چل پھر رہی ہوں —— یہاں کونے میں آرام سے کافی پیتے پیتے اس پر وحشت کا دورہ پڑا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

براؤن نے پُوچھا "کہاں چلے"؟

"مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

براؤن اُسے حیرت سے دیکھتا رہا اور وہ چلا گیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ سی ایم ایچ کی طرف بڑھ گیا۔ داخل ہُوئی یا نہیں؟ ایسی کوئی خبر

اُسے نہ تھی۔ اِس وقت تو وہ دل کی آواز پر چل رہا تھا اور اُس کے دل کی آواز بھی کچھ ایسی ہی ہوتی تھی۔ پھاٹک پر اُس نے اُسے آتے دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ بے حد خوش ہو کے اُس نے جلدی سے سوچا، "بھلا میرا دل کبھی مجھ سے غلط کہے۔"

یک لخت اُس نے بریک پہ پیر مارا اور گاڑی روک لی۔ کھڑکی میں سے مُنہ نکال کے وہ بات پُوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے۔ میں نے سُنا تم بیمار ہو؟" یہ کہہ کر اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی اور تو اُس کے ساتھ نہیں۔ یہاں کوئی نہ تھا وہ اکیلی تھی۔ اُس کے دل کو اطمینان ہُوا۔

وہ رُکی۔ اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پریشان ہو کر سوچنے لگی "نجانے اِس نے میرے متعلق کیا پُوچھا ہو گا۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہُوا کہ میں بیمار ہُوں؟"

"وہاں لوگ ذکر کر رہے تھے، اور یہ کہ تُم ہسپتال جانے والی ہو۔"

زُہرہ کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ "مجھے یرقان ہو گیا ہے۔"

"مگر ابھی چند دن پہلے تو تُم اچھی تھیں۔ یہ ایکدم سے کیسے ہو گیا؟" اُس نے پُوچھا۔

وہ دھیرے سے بولی: "کافی دن سے میری طبیعت خراب تھی۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔"

صحت بھی ایسی چیز ہے جس پہ دھیان نہ دیا جائے۔ پہلے کیوں

"اچھا، یہ بتاؤ اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟"
"آج میری طبیعت بہتر ہے۔" زہرہ نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ کہنے لگا: وہ اِس لیے کہ میں تمھارے قریب ہوں۔ تم مجھے اپنے سے بہت دُور رکھتی ہو۔ ایک بات بتاؤں تمھیں؟ میں تمھاری صحت و مسرت ہوں۔"

وہ اُس کے اِتنے اعتماد سے کہنے پر ہنس پڑی۔ "اب تم مجھ سے ایسی دیوانی باتیں کرنے لگے۔ تم مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ میں تمھاری کوئی نہیں ہوتی۔"

اِس بات پر وہ بجھتا گیا اور سوچنے لگا۔ "اِسے خُوب معلوم ہے کہ یہ میری سب کوئی ہوتی ہے۔ اِس سے زیادہ میرا کوئی نہیں۔ مگر مُجھے جلا کے یہ خوش ہوتی ہے۔ مُجھے دیوانہ سمجھتی ہے۔ اب اِسے کون بتائے کہ انگریز قوم کا یہ فرد نہ تو بے وقوف ہے نہ تاجر۔ خاص کر دِلوں کی تجارت کا اِسے کوئی شوق نہیں، مگر اس کے باوجُود وہ دل کا بیوپار کر بیٹھا۔

اُس کے دل میں وہم کا ایک ہول اُٹھا اور گہری گہری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ دل میں دُعا مانگنے لگا "خُدا کرے یہ جلدی سے اچھی ہو جائے۔ اِسے کیا پتا موت میرے اور اُس کے درمیان بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میں اپنی زندگی میں اِسے مرنے نہیں دُوں گا۔ مانا کہ یہ بڑی خود غرضی ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔

پیچھے سے کہنے لگی "تمھیں کیا معلوم دِل کیا شے ہے۔"

شام کو وہ ذرا دیر سے آیا، اِس خیال سے کہ کہیں ارشد سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ وہ بہت بن ٹھن کے آیا تھا جیسے ہسپتال نہیں کسی بارات میں آیا ہو۔ مُدّت بعد اُس کے کاج میں ایک کلی بھی لگی تھی۔
زُہرہ کو وہ آج کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگا۔
اُس نے آتے ہی پُوچھا "وہ آیا تھا؟"
وہ رنجیدگی سے کہنے لگی: "نہیں۔ ایما اور بچے آئے تھے۔"
اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ پُوچھنے لگا: "کیوں؟ کہیں پینے بیٹھ گیا تھا؟"
اِس پر اُس نے چڑ کے کہا "مجھے کیا معلوم۔ تم مجھ سے ایسے سوال کیوں کرتے ہو؟ اِتنا تو نہیں پیتا کہ آنے جانے کا ہوش نہ رہے۔"
وہ مُسکرایا اور کہنے لگا: "ہوں۔ اِتنا نہیں پیتا۔ کیوں نہیں پیتا۔ میں نے اُسے خود شیرل کی سالگرہ پر براؤن کے ساتھ پیگ پر پیگ چڑھاتے دیکھا تھا۔"
"دیکھا ہوگا۔ مگر تم سے کیا مطلب؟" وہ کہنے لگی۔
اِس پر وہ انتہائی دلکش ہنسی ہنسا اور کہنے لگا: "اور کس سے ہے؟"
اِس پر وہ بڑی لجاجت سے کہنے لگی: "ایڈورڈ، جانے دو۔"
وہ ہنسا اور پلنگ کے برابر کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

ہماری پوری زندگی ہی خود غرضی پر مبنی ہے۔ ہم سب کچھ اپنے ہی
لیے تو چاہتے ہیں۔"

پھر وہ بڑی فکر سے کہنے لگا: "تم اب سو جاؤ۔ کہیں میں تمھیں
اس طرح بٹھا کے زیادہ بیمار نہ کر دوں۔"

وہ کہنے لگی: "تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ۔ چلے جانا۔ مجھے تسلی رہتی
ہے جب تم ہوتے ہو۔"

اس پر وہ ہنسا اور کہنے لگا: "ہوں، تمھاری تسلی کے لیے میں
بیٹھا رہوں۔ تاکہ تم سو جاؤ اور میں جاگتا رہوں۔ میں تمھارا پہرے دار
ہوں۔"

زہرہ نے اُسے ہنستے ہوئے دیکھ کے سوچا "ہنستے ہوئے اِس کے
مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ سفید چمیلی کے حیات بخش پھول۔ یہ یوں بھی
اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ پر ہنستا ہوا تو ایسا لگتا ہے جیسے حیات
کا فرشتہ صحت کے موتی بکھیر رہا ہو۔ عجیب دلکش ہنسی ہے اِس کی
کاش یہ عمر بھر یونہی بیٹھا میرے سامنے ہنستا رہے۔"

پر وہ کہنے لگی "اچھا، تو جاؤ۔ تمھیں بہت صبح جانا ہوتا ہے۔
پھر فاصلہ بھی تو بہت ہے اور دن بھر میں تھک بھی جاتے ہو گے۔"

اِس پر وہ چڑ کر کہنے لگا: "تم میری فکر مت کرو۔ میں اپنی دیکھ بھال
اچھی طرح کرتا ہوں۔"

زہرہ نے مزید ہمدردی سے کہا: "مگر ایڈورڈ، تمھارا اِس شہر

میں کوئی نہیں ہے۔ تمھیں تنہائی بہت کھلتی ہو گی۔"

اِس پر وہ بہت جھنجلایا اور کہنے لگا: "تم ایڈورڈ کو اُس کے حال
پر چھوڑ دو۔ میں نے تپسیا کی، گیان کیا اور کب کا نروان حاصل کیا۔
تازہ تازہ ٹھنڈی ہوا جو چھاؤنی سے آتی ہے اُس پر جیتا ہوں اور
قطعی چین سے ہوں۔ اب تھوڑی دیر میں تم اور مجھ پر ترس کھاؤ گی
اور اماں بن کے کہو گی 'تم بیچارے جو اکیلے ہو تو شادی کر لو'۔ مجھے
ایسی باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ تمھیں ضرورت نہیں مجھ پہ ترس کھانے
کی اور نصیحت کرنے کی۔ میں بالکل آرام سے ہوں۔ مجھے کوئی فکر نہیں۔
تم اپنی فکر کیا کرو۔ بیمار پڑی ہو اور جی گھرداری اور بچوں میں پڑا ہے۔
ایسے خاک اچھی ہو گی۔"

وہ کہنے لگی: "تم مجھ سے ایسی جلی جلی باتیں ضرور کرنا۔ میں تم پر ترس
کھا رہی ہوں یا خیال کر رہی ہوں۔"

اِس پر وہ اور جل کر کہنے لگا: "تم بھی تو مجھ سے ایسی باتیں کرتی ہو۔
میں ابھی دا موں تمھارا بدلہ چکاتا ہوں۔ میں کوئی بچہ ہوں جو کوئی میرا
خیال کرے۔ کیوں، میں اپنا خیال خود نہیں کر سکتا؟"

وہ بُرا مان کے بولی "ہاں، چاہے کسی اور کا بدلہ نہ چکاؤ۔"

"بالکل۔ کسی اور کا بدلہ چکاؤں یا نہ چکاؤں۔ اوروں سے میرا کیا
واسطہ۔ تمھاری بات اور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا اور وہ حیات اور تسکین کے موتی چنتی رہی

اور صحت باقی رہی۔ ہنسنے کے باوجود اُس کے چہرے پر گردِ حزن تھی۔ وہ یہ محسوس کر کے اور محظوظ ہوئی کہ اب تک وہ اُس کی اِس بات پر جل رہا تھا کہ میں تمہاری کوئی نہیں ہوتی۔ وہ سوچنے لگی "یہ جلتا ہُوا بھی اچھا لگتا ہے۔" اُس نے اپنی بات دل میں دُہرائی اور دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگی۔ "اور اب یہ کئی دن تک اِس بات کے بدلے چُکائے گا۔ ایسا کرنا بہت ہی اچھا، بہت ہی عزیز لگتا ہے۔"

وہ اُس کے من کی بات پا گیا اور بڑے اطمینان سے ہنسنے لگا۔

وہ اُسے یُوں ہنستے دیکھ کے بُرا مان گئی اور کہنے لگی: "پہلے تم مجھ پر ہنستے ہو، میری نقلیں کرتے ہو۔ پھر بدلے چُکاتے ہو۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟"

وہ کہنے لگا: "ہُوں۔ میں تمہاری نقلیں کرتا ہُوں۔"

اُس کی طرف دیکھ کے اُس نے گہری سی ایک اور 'ہُوں' کی اور ایسے مُسکرایا جیسے کوئی بڑا کسی بچّے کی بات پر مُسکراتا ہے۔ پھر وہ پلنگ کے قریب آیا، غور سے اُسے دیکھا اور خُدا حافظ کہہ کے چل دیا۔ لیکن دروازے پر تھم کے اُس نے کہا "میں سویرے آؤں گا تمہارے پاس ہسپتال جانے سے پہلے۔"

زُہرہ اُس سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ اِتنی دُور سے آ کر فضول اپنے آپ کو کیوں تھکاتے ہو۔ لیکن اِس سے وہ خفا ہوتا۔ پھر اُس کے آنے کی خوشی کے خیال سے بھی وہ اُسے منع نہ کر سکی۔

اور جب وہ نکل رہا تھا تو براؤن نے ہسپتال کے سامنے سے گزرتے ہُوئے موٹر ذرا دھیمی کی اور پھر تیزی سے نکل گیا تاکہ ایڈورڈ اُسے نہ دیکھ سکے۔ گھر جاتے ہُوئے وہ سُرخ مُونچھوں تلے مُسکرایا۔

"اب میں سمجھا، یہ کون تھی۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" پھر وہ رنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔ "مگر یہ بُرا ہُوا۔ یہ تمہاری فنا ہے۔ یہ بھی سوچا ہے؟ کیا تم جیسے پیارے آدمی کا یہی انجام ہونا تھا؟ اور یہ ہماری دوستی کے درمیان پہلی بات ہے، جس کے بارے میں مَیں تمہیں چھیڑ نہیں سکتا بلکہ یہ ظاہر بھی نہیں کر سکتا کہ میں جانتا ہُوں۔"

وہ گاف روڈ کے ہرے بھرے راستے اطمینان سے طے کرتا ہُوا علی الصباح چھاؤنی کی طرف بڑھا۔ برامدے میں پہنچا تو کمرے میں باتوں کی آواز سُنائی دی۔ احتیاطاً اُس نے دروازے کے شیشوں میں سے جھانکا۔ زُہرہ کی نگاہیں شیشوں کی طرف تھیں۔ اُس نے صُبح کی چمکتی ہُوئی روشنی میں ایڈورڈ کی آنکھیں دیکھیں جو معمُول سے زیادہ نیلی ہو رہی تھیں۔ اندر ارشد تھا۔ ایڈورڈ تیزی سے اپنی موٹر کی طرف بڑھ گیا۔

یک لخت باتیں کرتے کرتے اُس کی آواز ڈُوب گئی۔ اُس نے چند لمحوں کے لیے اپنی بیمار آنکھیں بند کرلیں اور آج پہلی بار محسُوس کیا کہ لیٹے لیٹے اُس کا دل بھی کچھ کمزور ہوگیا ہے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر سرہانے کی میز پر سے گلاس اُٹھایا اور رات کے رکھے ہُوئے بچے پانی کے دو گھونٹ بھرے۔ آہستہ آہستہ اُس کا دل اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ تب وہ ذرا سا اُٹھ کے مسہری سے ٹیک کے بیٹھی اور پھر نقاہت سے مُسکرائی، یہ محسُوس کرکے کہ وہ جلتا بُجھتا جا رہا ہوگا۔ مگر پھر اُس کی مایُوسی کا خیال کرکے اُس کے چہرے پر دُھواں سا

بکھر گیا۔

اور اب وہ مرتا کھپتا شدید بوریت کے عالم میں اپنے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ موٹر کے اُترے ہُوئے شیشوں میں سے آتی ہُوئی خنکی اُسے ناگوار لگی۔ اُس نے شیشے چڑھا لیے اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا "ہاں، وہ جب چاہے آسکتا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں۔"

مریضوں پر وہ آج معمُول سے زیادہ ہی مہربان تھا اور بڑی محبّت سے اُن کی مزاج پُرسی کر رہا تھا۔ اُس نے نرس سے ایک مریض کی پٹی کھلوائی اور اُس کے اچھے ہوتے ہُوئے زخم کو ذرا چھُو کر دیکھا تب پہلی بار کسی مریض نے محسُوس کیا کہ اُس کے ہاتھ سرد تھے۔ مریض نے زخم پر اُس کے سرد ہاتھ کی ٹھنڈک محسُوس کرکے یُونہی ذرا سی پہلو کو نادانستہ طور پر سکیڑا تو وہ سفید دانت نکال کے مُسکرایا اور سوچنے لگا۔ "علاج مُعالجے کے علاوہ، ان کو تمھاری شفقت، توجّہ، دلداری، تمھارے ہاتھوں کی نرمی اور تمھاری طبیعت کی نرمی کی بھی حاجت ہے، اور ان میں خفیف سی کمی بھی ہوگی تو یہ اُسے محسُوس کریں گے۔ کیونکہ تکلیف نے اُن کے دل بے حد حسّاس اور نازک بنا دیے ہیں۔"

مارے جلاپے کے وہ آج شام زُہرہ کے پاس نہیں گیا اور گھر میں یُوں موسیقی سُننے اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصرُوف رہا جیسے وہ اُسے دکھا رہا ہو کہ دیکھو "مجھے کوئی پروا نہیں۔ میرا اپنے گھر میں جی لگا ہُوا ہے۔ اب تم اُس سے اچھی طرح ملو۔" حالانکہ اِس شام اُس کا جی

کئی بار اُس کے پاس جانے کو چاہا اور یہ کہ "پتا نہیں وہ کیسی ہے؟"
اور زُہرہ نے اِس شام اُس کا اِنتظار کرتے کرتے مُسکرا کے سوچا "گویا یہ بدلہ چُکا رہا ہے۔ اُسے وہاں اپنے گھر میں، جو نہیں معلوم کِس جگہ ہے اور کیسا ہے، خُوب خبر ہے کہ میں اُس کے اِنتظار میں ہُوں اور اُس کے نہ آنے پر کُڑھ رہی ہُوں۔ اچھا۔"

دُوسرے دِن صُبح سویرے اُس کے دل نے کہا "اب وہ روز روز اُسے دیکھنے تھوڑی آئے گا۔ اُسے اُس کی پروا تھوڑی ہے۔ اِس لیے میں جاؤں گا۔"

زُہرہ نے دیکھا اُس کا چہرہ لمبا ہو رہا تھا۔ وہ نرمی سے اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اُسے معلُوم تھا وہ رُوٹھا ہُوا ہے۔ پھر وہ خدا حافظ کہنے لگا۔

زُہرہ نے بڑی اِلتجا سے کہا "شام کو آؤ گے نا؟"

وہ مُسکرایا اور جھٹ کُرسی پر بیٹھ گیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ مجھے سمجھتی ہے۔ یہ فوراً سمجھ گئی کہ میں خفا تھا اور اُس کا بدلہ چُکا رہا تھا۔ اور اب یہ سیدھی ہو رہی ہے۔ ورنہ یہ پھر مجھے سُلگاتی۔ اور اِس ہم آہنگی ہی کو تو جی ڈھُونڈتا اور مانگتا ہے — چاہنے والے تو بہت مِلتے ہیں پر سمجھنے والا کہاں مِلتا ہے۔ چراغ لے کے ڈھُونڈتے پھرو۔"

وہ ایک ٹک بڑی سادگی سے مُسکرایا اور کہنے لگا: "شام کو آؤں گا"

کہنا تو وہ بہت کچھ چاہتا تھا پر سدا اُس کے سامنے زبان نے ساتھ دینے سے اِنکار کیا۔

اور زُہرہ نے اُسے یُوں مُسکراتے دیکھ کر جی میں سوچا "جو میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو سب کی سب اِس ایک مُسکراہٹ پر نذر کر دیتی۔ جان کی بھی کوئی قیمت ہے۔"

"اور آج تم مجھے راہ میں ایسے مِلیں کہ دیکھ کے مُنہ موڑ لیا۔" وہ رنجیدہ ہُوا۔ اور دل میں کہنے لگا "یہ بات نہیں ہے۔ تم یُوں مجھے اپنے ذہن سے ہٹانا چاہتی ہو کیونکہ میں تمھارے ذہن میں موجُود ہُوں۔ تم مُجھ سے کنارہ کر کے اپنے خیال میں میرا دل اپنے سے بُرا کر رہی ہو تاکہ میں تمھیں بھُول جاؤں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یقین کرو کہ ایسا میں کب کا کر چکا ہوتا۔ میں خُود تم سے نجانے کتنی بار ترکِ تعلق کی کوشش کر چکا ہُوں۔"

پھر اُس نے بڑی کینہ پروری سے فیصلہ کیا "اب میں تمھارے بدلے اچھی طرح چُکاؤں گا۔" اور پُوری چار اتواریں وہ براؤن کے یہاں نہ گیا۔

اور زُہرہ نے جھنجھلا کے دروازے کی طرف دیکھتے ہُوئے سوچا۔ "یہ سراسر زیادتی ہے بلکہ بے ایمانی۔ یہ بدلہ بہت مہنگا رہا۔ اُس نے دِل کو خُون کے آنسُو رُلا دیے۔ تُم نے غالباً مُعاف کرنے کی عادت نہیں سیکھی۔ ویسے میری بھی بدتمیزی تھی۔ میں ہُوں بھی ایسے ہی سلوک کی مُستحق۔ مگر میں بھی کیا کروں۔ یہ بات میں محسُوس کرتی ہوں کہ بہت بُری

ہوں۔ مگر میں نے خود تو کی نہیں۔ میں نے کب تمھاری تمنا کی اور اب لاکھ کوشش کرتی ہوں پر تم سے جان نہیں چھوٹتی۔ اب میری توبہ جو تم سے یوں پیش آؤں اور ترکِ تعلق کی کوشش کروں۔ پتا نہیں کون گھڑی تھی کہ میں اِس گھر میں آئی تھی۔ جیسے تم ہی سے ملنے آئی ہوں اور تم میرے منتظر ہو۔ مجھے معلوم ہوتا کہ جی یوں اذیت اُٹھائے گا تو بخدا یہاں قدم نہ رکھتی۔"

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ آگیا۔ مُسکراتا ہُوا، مُطمئن۔ اب اُس کے دِل کو چین تھا۔ اُسے دیکھ کر وہ مُسکرائی اور سلام دُعا کا اِنتظار کیے بغیر اُس سے بڑی نرمی سے، باتیں کرنے لگی:۔

"ہُوں" ایڈورڈ نے دِل میں کہا۔ اب تم سیدھی ہوگئیں اور مجھے اُمید ہے کہ عرصے تک ٹھیک رہوگی۔"

ارشد کسی وجہ سے محاذ پر نہ جاسکا۔

ایڈورڈ نے سوچا" اچھا ہُوا کہ تم نہ گئے۔ اگر تم مر جاتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ فضُول میں وہ مُصیبت میں پڑتی۔ اِس صُورت میں تمھارے بچے اُس کے لیے پریشانی کا باعث ہوتے اور معلُوم نہیں اس کی زندگی میں کتنی اُلجھنیں کھڑی ہوجاتیں۔ مانا کہ تم رقیب ہو مگر اُس کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے تم بھی عزیز ہو۔ پھر تمھارا کیا قصُور۔ یہ تو بنانے والے نے، جو بناتے وقت کسی سے مشورہ نہیں لیتا، پہلے سے لکھ دیا تھا۔ پھر بھی میں اُس دینے والے کا شکر گزار

ہُوں جس نے دیا تو قبضے کی شرط نہ رکھی۔ دل و دماغ اور رُوح میری ہے۔ باقی تم رکھو جس کا تم نے سودا کیا تھا اور باقاعدہ لکھا پڑھی کی تھی۔ میں نے تو بغیر کسی عہد و پیمان کے مُفت دیا اور وہ شے اُس کے عوض پائی جس کے کارن سُولی پر چڑھ سکتا ہُوں۔ میں سُولی پر ہی تو ہُوں۔ تم سٹیج پر بیٹھو۔ میرا کیا ہے۔ میں بھکاری ہُوں۔ تم تاجر ہو۔

آفسوس وُہی ہُوا جس کا اندیشہ تھا" لارڈ ہمفری نے سر پکڑ لیا اور سکتے کے عالم میں یہ خبر پڑھی:۔

"ہندوستان آزاد ہوگیا۔ بلکہ دو حصّوں میں بٹ گیا۔ یہ فتح ہمیں بڑی مہنگی پڑی۔ ایک طرف ہم نے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے دُوسری طرف سے ہم نے اپنا جھنڈا اُکھاڑ لیا۔ یعنی بغیر جنگ کے ہار گئے۔ صد افسوس"

اُنھوں نے اپنے سرسبز اور کُشادہ باغ میں ٹہلتے ہُوئے شدید قلق سے سوچا۔ پھر یک لخت ان کا دل ڈُوبنے لگا۔ اُنھوں نے ایک لحظے کو دِل تھام لیا اور آہستہ سے برآمدے میں آگئے۔ ذرا دِقت سے آرام کُرسی پر بیٹھے اور دل میں کہا "میں تھک گیا ہُوں"۔ اور پھر کُچھ ایسا ہُوا کہ اُنھوں نے دل کی ہلچل بڑی شِدّت سے محسُوس کی اور اب وہ صاحبِ فراش تھے۔ اِس وقت اُنھیں معلوم ہُوا کہ وہ اِس مُلک سے جانا نہ چاہتے تھے۔

یہ زرخیز زمین، لہلہاتے کھیت، بل کھاتے دریا، سربفلک پہاڑ، برہنہ پاکستان اور یہ بے معنی چھوٹے چھوٹے تہوار، یہ سب اُن کی رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے۔ یہ سارا ایس منظر جو اُن کے چاروں طرف بکھرا ہُوا تھا اُن سے مُنسلک اور وابستہ ہو چکا تھا۔ اِس کے باوجود وہ شدید تذبذب میں تھے۔ یہ آزادی اُن کی توہین تھی۔ یہ مُلک اُن سے چھین لیا گیا تھا۔ اُن کی قوّتِ مدافعت سلب ہو چکی تھی۔ چالیس کروڑ انسانوں کی مُتحدہ آواز کے آگے اُن کی اجنبی آواز دب گئی تھی۔

لیٹے لیٹے اُنھوں نے کھڑکی کے شیشوں میں سے باہر دیکھا۔ درخت جھُوم رہے تھے، پھُول کھل رہے تھے۔ اُنھوں نے سوچا یہ مُلک اُن کا بھی ہے۔ اُنھوں نے اِسے اپنے ہاتھوں سے سنوارا تھا۔ ایک مشاق مشاطہ کی طرح اِسے سجایا تھا اور زندگی کے بہترین سال بڑے کرّوفر سے گزارے تھے۔

یک لخت اُن کی نظروں میں کشمیر اور شملے کا منظر گھوم گیا۔ یہی تو اُن کا ماضی تھا اور انگلستان میں جس گھر سے اُن کا ماضی وابستہ تھا، وہ تو کبھی کا پیٹر نے کرائے پر دے دیا تھا اور لڑکپن میں جن گلیوں میں وہ گھومے تھے اُن میں قیامت مچی تھی۔ مورز کے جنگلوں میں آگ لگی تھی۔ وہ نہیں جائیں گے، اُنھوں نے فیصلہ کیا۔

مگر ایک آواز اُن کے اندر سے بلند ہُوئی۔ "وہ تمھیں نکال رہے

ہیں اور تُم رہنا چاہتے ہو۔ یہ رہنا بڑی ذلّت کا ہے۔"

ایک وجہ ہوتی تو وہ بتاتے کہ وہ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں۔ اُن کا پرنس آف ویلز بھی تو یہیں رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کاش وہ اپنے کو سمجھا سکتے۔ اور آج اُن کے ہچکولے کھاتے اور گھبرائے ہُوئے دل نے محسُوس کیا کہ اُن کو اپنے اِس لڑکے سے جس کے طریقے اُن کی قوم کی روایات کے خلاف تھے اور جس پر وہ مُعترض رہتے تھے، اُنھیں اُس سے شدید محبت تھی، اپنے اُس لڑکے سے زیادہ جو بہت معقُول قوم پرست انگریز تھا۔

وہ اُٹھے اور مُمانعت کے باوجود اِس اذیّت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے پے درپے کئی جام چڑھا لیے۔ پھر اُنھوں نے بہت ناسمجھی سے ضِد کی "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا"۔ یہ ضِد اُنھوں نے ایڈورڈ کی طرح کی اور رہ پڑے۔ یہ مُلک اُن کا محبُوب تھا۔

اور یہاں اُسے تار ملا اور وہ "میرا باپ" کہتا ہُوا لپکا۔ مگر اُسے اِتنا شدید قلق نہیں ہُوا۔ یہ وہ تھا جس نے اپنے نوکر اور اپنے گھوڑے تک کے مرنے کا غم بڑی شدّومد سے منایا تھا۔ کُچھ دِن سے تو وہ اپنے کو اپنے آپ سے بھی اجنبی اور بے نیاز پاتا تھا۔

اُس کا باپ اس وقت بھی بڑی شان سے تابُوت میں لیٹا اُس کا مُنتظر تھا۔ جھک کے اُس نے اپنے باپ کو دیکھا اور شدّتِ جذبات سے

تابُوت کے پاس کھڑے ہوکر اُس نے بے اختیار
اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ تُم میرے پاس ہوتیں اور اِس منظر کو دیکھتیں۔
تمنّا کی: "کاش اِس وقت میرے باپ کو دیکھتیں جو بُرا آدمی نہ تھا۔ مگر ایسا
یہ منظر جو میرا اپنا ہے۔
فقط تمنّا کی بات ہے۔"
نہیں ہے۔ یہ سوگوار سا، آنکھوں میں غم کی آمیزش اور
سوگ کے سیاہ سُوٹ میں
تیرتے ہُوئے سُرخ ڈورے۔ وہ بہت خوبصورت، بہت کم عمر اور ذمّہ دار
لگ رہا تھا۔ بغیر اُلجھے ہُوئے اُس نے تمام رسُومات بڑے سلیقے سے
ادا کیں اور قبرستان میں اپنی ماں کو سہارا دیے رہا۔ اُس نے نہ صرف
اپنے حصّے کی بلکہ پیٹر کے حصّے کی بھی مٹّی اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ
پر ڈالی۔

تب پادری نے کہا:-
Ashes to Ashes, Dust to Dust۔

آخری رسُومات کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہوکر اُس نے چُپکے سے
کہا "تم نے دیکھا، ہر جسدِ خاکی اِسی طرح خاک کی نذر ہوجاتا ہے۔ یہاں
سفر ختم ہوجاتا ہے۔ ہم بڑی دُور سے مسافت طے کرکے آتے ہیں،
جیسے بڑے پالے ماریں گے۔ اور یہاں آکے ڈھیر ہوجاتے ہیں۔
میں، تُم اور سب اِسی خاک کی نذر ہوجائیں گے۔ مگر میں تُم سے پہلے
مرنا چاہتا ہُوں تاکہ تنہائی کی سُولی پر نہ لٹکا یا جاؤں اور اپنے خُدا سے
دُعا کرتا ہوں کہ اے خُدا، مجھے پہلے بُلائیو۔"

باپ کو سپُردِ خاک کرکے وہ پلٹا تو اُس نے دیکھا کہ وہ منظر چند لمحوں
میں بدل گیا تھا — پیلی محرابوں والی کوٹھی پر سے دُھوپ سرک رہی
تھی۔ سُورج نے جاتے جاتے ٹھٹک کے اِس گھر کو اور اِس کے
مکینوں کو دیکھا اور سُرخ سمندر میں ڈُبکی مار گیا — باغ میں خزاں رسیدہ
پتّوں کا انبار لگا ہُوا تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سوگواری تھی۔ ایک لحظہ
ٹھہر کر اُس نے اِس منظر کو دیکھا، خالی خالی نظریں دوڑائیں، توازن میں
خفیف سی لرزش محسُوس کی تو تھم کر اُسے دُرست کیا اور پھر بڑے
اِعتماد سے اندر چلا گیا۔

اور اب وہ اپنی ماں کو سوار کروا رہا تھا۔ ماں نے حسرت سے
بیٹے کو دیکھا اور سوچنے لگی "کاش یہ میرے ساتھ چلتا۔ یہ یہاں اکیلا
رہ جائے گا اور یہاں اِتنی گڑبڑ ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میری قسمت
میں یہی لکھا تھا اور میں برسوں اِس کی صُورت کو ترستی رہی اور اب
میں پیٹر کے پاس چلی ہُوں تو یہ یہاں رہا جاتا ہے۔ مگر اِسے تو کسی
بات کی پرواہی نہیں۔ نہ وطن کا کوئی خیال نہ بھائی کو دیکھنے کی
تمنّا اور نہ میرے جانے کا ملال۔ پتا نہیں اِسے کیا ہوگیا ہے۔
ایسا تو یہ نہ تھا۔"

تب اُنھوں نے اُس سے کہا "اُمید ہے تُم پابندی سے خط
لکھتے رہوگے اور اپنا خیال رکھوگے۔"
اُس نے وعدہ کیا اور ہاتھ ہِلا ہِلا کے اُنھیں خدا حافظ کہتا رہا۔

اور ماں نے اپنے کیبن میں آکر رُومال سے آنکھیں خُشک کیں اور
اور بستر پہ بیٹھ کے سوچنے لگیں: "ہم اپنی جڑیں پُورے طور پہ اُکھاڑ
نہ پائے۔ یہ جڑیں محض سو برس میں مضبُوط نہیں ہُوئی تھیں، یہ تو
شاہ جہاں کے وقت سے چلی آ رہی ہیں، جب ڈاکٹر باٹن کے علاج
سے اُس کی بیٹی رُوبصحت ہُوئی تھی — میں بھی اپنی ایک جڑ چھوڑ کے
جا رہی ہوں۔ اے خُدا تُو اِس کی حفاظت کیجیو۔ یہ میرا متاعِ عزیز
ہے۔ تُو اسے اپنی حفاظت میں رکھیو۔"

اور واپس آکے اُس کی آنکھوں نے جو تماشا دیکھا اُس سے
اسے اپنے باپ کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔ "یہ آزادی کے
بعد ایک دُوسرے کا خُون بہائیں گے اور سر پھوڑیں گے۔"
بارہا اُس نے ہسپتال اور چھاوُنی جاتے ہُوئے دل میں کہا۔
اِے لوگو! کیوں لڑتے ہو؟ یہ داغ اپنی تاریخ پہ کیوں لگاتے ہو؟
کچھ تو شرم کرو۔ جس قوم سے تُم نے اپنا مُلک واپس لیا تھا اور
آزادی حاصل کی تھی، وہ تمھیں باہم دست و گریباں دیکھ کر خوش ہوتی
ہے۔ اور ایک ہاتھ ہے جو لکھ رہا ہے اور وہ مُؤرّخ کا ہاتھ ہے۔
اے لوگو! اُس سے پناہ مانگو۔ آیندہ نسلیں تُمھارے کرتُوتوں کی وجہ
سے سر نہ اُٹھا سکیں گی۔"
مگر لوگوں نے اُس کی آواز نہ سُنی جو غیر تھا اور محض ایک امن پسند
مُعالج تھا۔ وہ لوگوں کو زخمی ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا جبکہ وہ اُن کی
صحت کے لیے کوشاں تھا۔
اور اِس قیامت میں بھی وہ اُس کی خیر خیریت لینے براوُن کے
کے یہاں جاتا۔ اُس کے یہاں ٹیلیفون نہ تھا اور ہوتا بھی تو بھلا میں

کس سے اور کن الفاظ میں اِس کی خیریت پُوچھتا؟" مگر خُدا اُس کی حفاظت کر رہا تھا اور براؤن اِس خُوب صُورتی سے اُسے اس کی خیریت بتاتا کہ اُسے اِحساس تک نہ ہوتا۔

وہ اِن دنوں گھر پہ ہی تھی اور کتنے ہی دِن ہو گئے تھے کہ وہ اُس سے نہیں ملا تھا۔ تب اُس نے پہلی بار بغیر القاب و آداب کے اُسے خط لکھا:

"مجھ سے زیادہ بھی کوئی احمق ہوگا جسے اِس قیامت میں بھی یہ خیال رہتا ہے کہ شاید تم نظر آجاؤ۔ میں خیریت سے ہُوں۔" 'ایڈورڈ'

خط کی یہ چند سطور اُس نے بار بار پڑھیں اور دِل میں کہنے لگا:

"تمھیں کیا معلوم یہ چند الفاظ میں نے اپنے خونِ جگر سے لکھے ہیں۔ اور اِن دنوں مَیں وحشت کی کن منزلوں میں پہنچ چکا ہوں۔ مگر تم مُنہ چھپائے بیٹھی ہو۔"

آج وہ براؤن کے یہاں آئی اور ایڈورڈ اُسے دیکھ کے بہت خُوش ہُوا۔ کتنی باتیں وہ اُس سے کہنا چاہتا تھا مگر زبان نے کبھی ایسی جُراُت کی جو آج کرتی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ یہیں اُس کے سامنے بیٹھا رہے۔ پر یہ اُس کا اپنا گھر تو نہ تھا۔ واپس جاتے ہُوئے اس نے سوچا "تم میرے گھر آؤ، ایسے میرے نصیب کہاں۔ اور یہ تو خُدا سے بہت زیادہ مانگنے والی بات ہُوئی۔"

واپسی پہ اُس نے کولتار کی سڑک پر دو اِنسانوں کو خاک و خُوں میں

غلطاں دیکھا اور وہ سوچنے لگا: "خُون کی ارزانی اور فراوانی سے لگتا ہے جیسے یہ اِنسان کا خُون ہی نہ ہو۔ دُکھوں کی کمی ہے جو یہ اور دُکھ کا باعث ہو رہے ہیں۔ خُدا اپنے بندوں کو کتنی آزمائش میں ڈالے مگر اُسے اِن میں میل اور محبت ہی پسند ہے کیونکہ وہ سب اُس کی تخلیق ہیں اور اُسے اپنی تمام مخلوق سے یکساں محبت ہے ورنہ وہ یُوں میرے کام نہ آتا اور وہ آج بھی مجھے نظر نہ آتی۔ خُدا محبت ہے۔"

وہ اِن لوگوں سے رُوٹھ گیا تھا اور صدمے سے نِڈھال ہو کر لیٹا ہُوا تھا۔ وہ ٹھنڈی سی سانس لے کر دھیرے سے کہنے لگا: "کون کس کی چارہ گری کرے۔ دُکھ کی اِفراط ہے۔ مُعالج بھی دُکھیوں اور دُکھ دینے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ اے خُدا، رحم کر اور اِنھیں عقل دے۔ یہ بہت بے وقُوف ہیں، جھنجھلائے ہُوئے ہیں اور غُلامی کی محرُومیوں کا غُصّہ ایک دُوسرے پر نکال رہے ہیں۔"

پھر اُس نے خان سے چائے منگوائی اور پینے لگا۔ خان گُم سُم تھا اور آج کل گھر میں بند تھا۔ ایڈورڈ بھی اُسے گھر سے باہر نہیں بھیجتا تھا اور آج کل بند ڈبّوں کی چیزوں پر گُزر کر رہا تھا۔

خُدا اس کی حفاظت کرتا رہا۔ شاید یہ ایک ضعیف دل سے نکلی ہُوئی دُعا کی وجہ تھی، جو ماں کا دل تھا۔ یا شاید اِن مرنے مارنے والوں کا دل اُس کی قوم کی طرف سے صاف ہو چُکا تھا اور وہ محض آپس میں ناخُوش تھے۔ یا بقول اُس کے اپنی غُلامی کی محرُومیوں کا غُصّہ ایک

دُوسرے پر نکال رہے تھے ۔

گندھ راج، کنولوں، گل مہر اور کوڑھ کے کھلتے ہوئے پھولوں کے
شہر ڈھاکے میں جب کیتھولک مشنری نے اِس بیماری کا ہسپتال کھولا
تو ماضی کا طالب علم گوتم بُدھ سے جا ملا ۔ وہ مُنتظر ہی رہا ۔ ہسپتال کا
نہیں بلکہ اُس مخصوص شخص کا، جس کی بشارت فرانسس نے جوزف کو
دی تھی اور خود اُس کے دل نے اپنے آپ کو دی تھی ۔ وہ نجانے
کب سے آ رہا تھا، وہ جس کے مُتعلق انھیں اور خود بُدھی کو قطعی یقین تھا
کہ وہ ضرور آئے گا ۔ لیکن وہ گھڑی مُقرر تھی جس میں وہ آنے والا تھا،
جس کے ہاتھوں میں مسیحائی تھی، شفا کی صحت بخش گرمی تھی ۔ اِن ہاتھوں
میں بُدھی شمپا کو سونپنا چاہتا تھا ۔

اُس نے شمپا سے کہا تھا "میرے جانے سے جی نہ چھوڑنا اور
مت جا، کہاں ہوں شمپا رانی ۔ میرا جسم بیمار ہے مگر میری رُوح صحت مند
ہو چکی ہے ۔ وہ آئے گا اور تجھے صحت ہوگی ۔ شمپا، میری رُوح اُس کی
مُنتظر رہے گی اور تیرے پاس اُس وقت تک آتی رہے گی جب تک
وہ تجھے اُس کے سپُرد نہ کر دے ۔" رہ رہ کے اُس کا جی یہی کہتا تھا
"وہ آئے گا ۔" اُمید نہ ہو تو آدمی جیئے کیوں اور مرے کیوں ۔ شمپا
ابھی چل پھر سکتی تھی ۔ وہ چاہتی تو بھیک مانگتی بڑے آرام
سے ڈھاکہ جا کے ہسپتال میں داخل ہو جاتی ۔ مگر آس پاس کے

لوگوں نے، جو ڈھاکہ آتے جاتے رہتے تھے، اُس کے سامنے ہسپتال
کا بڑا بھیانک نقشہ کھینچا تھا ۔

وہ کہنے لگی: "باپ رے باپ ۔ کون جائے ۔ اپنی باڑی (گھر)
ہی میں کیوں نہ مر جائے جو وہاں جا کے دھکّے کھائے ۔"

تھوڑا بہت مُبالغہ ضرور ہوگا مگر بہت حد تک اصلیت بھی تھی ۔
اِس میں شک نہیں کہ ہسپتال نیک جذبے کے تحت کھولا گیا تھا،
ایسے کاموں میں ہمیشہ بھلائی ہی کا خیال ہوتا ہے، مگر پھر کچھ ایسا
ہوتا ہے کہ کام کرنے والوں کو سسکتے کراہتے انسانوں کو دیکھتے
دیکھتے بیزاری سی ہو جاتی ہے ۔ اور پھر یہ تو باہر کے لوگ تھے ۔
جنھیں ہر گھڑی اپنی قربانی کا احساس تھا ۔ اور یہاں کے لوگوں کی
لاپروائی اور بے حسی پر شدید غُصّہ اور نفرت بھی تھی، جیسے وہ نہ اِن
کے ہم وطن تھے اور نہ یہ اُن کی سرزمین تھی بلکہ ساری ذمّہ داری اِن
غیر مُلکی راہبوں اور راہباؤں ہی کی تھی ۔

وہ سب اِس ہسپتال میں بند تھے اور اُنھوں نے اِن کوڑھیوں
کی خاطر دُنیا تج رکھی تھی ۔ اِس پر بعض کُڑھتے جھنجھلاتے اور سارا
غُصّہ اِن بیماروں پر اُتارتے اور بعض آپس میں چُہلیں کر کے اور
مُعاشقے کر کے غم غلط کرتے ۔ اکثر نوجوان راہب اور راہبائیں بہت
سخت گیر اور بے رحم تھیں جیسے وہ اپنی جوانی کی بربادی کا انتقام
اِن سے لے رہی ہوں ۔ پھر بھی بعض مریضوں کو سڑکوں پر

گھسیٹنے اور بارش میں بھیک مانگنے کی نسبت یہ مقام محفوظ لگتا۔ بیماری
اور افلاس نے انھیں صابر بنا دیا تھا۔ وہ بلا مُشقّت دو وقت کی اُلٹی
سیدھی روٹی اور تھوڑا بہت علاج مُعالجہ ہی غنیمت سمجھتے اور چُپکے
سے سب کچھ سہہ جاتے۔ مگر شمیا کی بات دُوسری تھی۔ بقول لوکو کے
بُدھی نے اُس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

جواں سال راہبہ، سسٹر روتھ، ایک مریض کے سر پہ کھڑی
کہہ رہی تھی "ہر بات میں نخرہ ہے۔ ہم باہر سے آ کر تمھاری خِدمت
کر رہے ہیں۔ تمھارے ہم وطن تو تُم سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔
کوئی تُمھارا اپنا بھی تمھیں اِس ہسپتال میں ہماری طرح کام کرتا نظر
آتا ہے؟ اُن کے پاس اِتنا دِل گُردہ ہے کہ اِس بیماری میں تُمھارے
پاس آ کے رہیں اور دُنیا سے الگ تھلگ ہو جائیں؟ اِس کو بھی چھوڑو،
کوئی چار پیسے ہسپتال کے لیے بھی نہیں دیتا۔ لیکن تُم پھر بھی چِلّاتے ہو۔
تمھیں تو زہر کا ٹیکا لگا دینا چاہیے تاکہ ہم تُم سے نجات پا جائیں اور تُم
اپنی بیماری سے۔"

برادر ووڈ نے اِسلام کے ایک طمانچہ لگایا کیونکہ وہ انجکشن نہیں
لگوا رہا تھا اور کہنے لگا: "تمھارے یہاں بھی تو لوگ ڈاکٹر بن رہے ہیں۔
کیوں نہیں کوئی کوڑھ کی سرجری سیکھ کے یہاں آ جاتا۔ بہت مُشکل
ہے ایسا کرنا۔ بس آزادی کا شوق تھا۔ رنگ رلیاں منانے کے لیے

آئے نہ کوئی اور ہماری طرح کام کرے۔"

بات یہ تھی کہ اُنھوں نے ہسپتال کے لیے چندہ جمع کرنے کی
بہت کوشش کی تھی مگر معلوم نہیں کیوں کسی کا دل نہیں پسیجا۔ پھُوٹی
کوڑی تک اُنھیں نہ ملی۔ اِس کے علاوہ ہسپتال کے لیے اُنھیں کوئی
مدد جن بھی نہیں مل رہا تھا۔ خُود اُن کی قوم کا بھی کوئی سرجن اب یہاں آنے
پر راضی نہ تھا۔ مشنریاں یہاں سے اُکھڑ رہی تھیں اور ولایت سے
چندے آنا بھی کم ہو گئے تھے۔ بار بار لکھنے پر بھی وہاں سے یہی جواب
آتا "بقیہ خرچہ وہیں سے چندہ اکٹھا کر کے چلاؤ۔ ہم مزید ایک پیسہ
نہیں بھیج سکتے۔ اُن کی حکومت سے اپیل کرو۔ لوگوں کو توجّہ دلاؤ۔
جنگ اور ہندوستان کی آزادی نے ہماری جڑیں ہلا دی ہیں۔ ہم
اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔"

دراصل وہ یہ ہسپتال قائم کر کے پچھتا رہے تھے۔ چنانچہ سسٹر روتھ
نے فرخندہ کی کھانا کم ملنے کی شکایت پر اُلجھ کے کہا۔ "ہم سے کیا کہہ
رہی ہو۔ اپنے یہاں کے بڑے بڑے آدمیوں کی موٹی موٹی بیویوں
سے کہو جو اِتنا زیور بنواتی ہیں اور اِتنا کپڑا خریدتی ہیں۔ کچھ کپڑے اور
پیسہ تُم لوگوں کو بھی بھیجا کریں۔ اِسلام میں تو زکوٰۃ اور خیرات پر بہت
زور دیا گیا ہے۔"

تب اِسلام نے صِدق دِل سے دُعا مانگی، کیونکہ مہینوں سے
اُس نے مچھلی کی خوشبو بھی نہ سُونگھی تھی اور رُوکھے چاول کھا کھا کے

وہ سخت اوبھ گیا تھا کہ:

"اے خُدا! اِس ہسپتال میں کوئی رحم دل انسان بھیج اور بیماری کی سختی کم کر۔"

اُسے یقین تھا کہ اُس کی دُعا ضرور قبول ہوگی کیونکہ اُس نے اپنے گاؤں کے مولوی صاحب سے سُن رکھا تھا کہ خُدا لاچاروں اور بیماروں کی دُعا جلد سُنتا ہے حالانکہ وہ ہسپتال میں آنے سے پہلے یہ دیکھ آیا تھا کہ جسے دیا گیا تھا اسے اَور دیا جا رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی نا اُمید نہ ہُوا تھا۔ اُس نے سوچا "خُدا کے خزانوں میں کمی تھوڑی ہے انسانوں کا دریا ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کسی کو تو اچھا دل بھی عطا کیا گیا ہوگا اور کیا پتا وہ اِدھر ہی بھیج دیا جائے"۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن ہُوا۔

شمیا بھلا اِن حالات میں کہاں آتی۔ وہ بُھوکا مرنا گوارا کرتی تھی مگر نفرت کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اتنے ناز بُدھی نے اُس کے اُٹھائے تھے کہ وہ بڑی تیکھی طبیعت کی ہو گئی تھی۔ بُدھی کے مرنے کے بعد اُس کی نظر میں موت کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی اور تکلیف تو اس مرض میں کوئی ایسی ہوتی ہی نہ تھی کہ دوڑو پکڑو ہوتی۔ بس اعصاب بتدریج مفلوج ہوتے رہتے اور ایک وقت آتا کہ اِس کی فکر بھی نہ رہتی۔ کیونکہ جب دماغ بے کار ہو جاتا تو سوچتا کون!

جاڑا اپنے شباب پر تھا اور اِس کڑکڑاتی سردی نے بچھڑے ہوئے لندن کی یاد دلا دی۔ اُس نے سوچا "پیٹر اور اُس کی بیوی ممی کے ساتھ کرسمس منائیں گے اور یوں ممی کو میری ڈیڈی کی اور ہندوستان کی یاد شاید کم آئے"۔

اُس نے کرسمس کے کارڈوں پر پیٹر، اُس کی بیوی اور خاص کر ممی کو محبت بھرے جُملے لکھتے ہُوئے سوچا "شاید ممی کو تنہائی اور محرومی کا احساس کچھ کم ہو۔ خُدا کرے ایسا ہی ہو"۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا کرسمس تھا اور یہاں خاصی گھما گھمی تھی۔ اُس نے کرسمس کی تیاریاں دیکھیں تو حیران ہو کے سوچنے لگا۔ "ابھی چند مہینے پہلے اِس زمین پر خون برسا تھا۔ بھرے پُرے شہروں کا امن و امان درہم برہم ہُوا تھا اور اب یہ اُس سے اِس طرح بے نیاز جیسے یہ کسی اَور مُلک کی بات ہو، شادمانیوں میں مصروف ہیں ۔ انسان بھی بڑا بے حس ہے۔ مانا کہ کرسمس عیسائیوں کا تہوار ہے مگر یہ عیسائی بھی تو اِسی زمین پہ رہ رہے ہیں۔ اور یہ جو اتنا پیسہ فضول ضائع کرنے کی فکر میں ہیں تو اُن لوگوں کی مدد کریں جو کیمپوں میں پڑے

سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ اُنھیں خوف نہیں آرہا ہے لاشوں پر
چراغ روشن کرتے؟ شاید میں ہی زیادہ محسوس کرتا ہُوں۔"
براؤن کے یہاں کرسمس پر اتنی گہما گہمی دیکھ کے اُسے سخت کوفت
ہُوئی اور کرسمس ٹری پر بے شمار چھوٹے چھوٹے رنگین بلب جلتے دیکھ کر
اُس نے شرم سے سر جُھکا لیا۔

اب کے کرسمس پر زہرہ کے براؤن کے ہاں نہ آنے سے اُسے
سکون سا ہُوا حالانکہ اُسے نہ دیکھنے کا رنج اپنی جگہ پر تھا۔ اُسے ایسا
لگا جیسے اِس مُعاملے میں وہ بھی اُس کی ہم خیال ہو۔ لیکن سُرخ بالوں
والی میم اور اُس کے میاں کو دیکھ کر اُس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ
بھی آجائے۔ پھر اُس کا جی بدحال لوگوں کے لیے کُڑھنے لگا اور
براؤن کی طرف سے بُرا ہُوا۔

"یہ براؤن بھی بڑا سخت دل ہے۔ کیا ضرورت تھی اِس سب کی۔
اِسے کچھ احساس چاہیے۔ جیسے یہ یہاں رہ ہی نہ رہا ہو۔ اِس پیسے
کے کچھ گرم کپڑے اس نے کیمپوں میں بھجوا دیے ہوتے۔ کچھ میرے
ہسپتال کو دے دیے ہوتے۔ مگر اس سے کون کہے۔ ابھی میرا مذاق
اُڑانے لگے گا اور کہے گا کہ سینٹ انتھونی کے تمھیں تو سچے جانشین
ہو۔ یا یہ کہ تم دہریہ ہو۔ کرسمس کے بھی خلاف ہو گئے ہو۔ یہی تو
بات ہے براؤن میں۔ وہ بات نہیں سمجھتا۔ بس رائے قائم کر لیتا
ہے۔ اُونہہ۔"

کرسمس ٹری میں لٹکتے ہُوئے تحفوں کے گرد گاتے اور پُھدکتے ہُوئے
بچّوں کو دیکھ کر وہ رنجیدہ ہُوا اور اُس کی نظروں میں مُہاجر کیمپوں کے
نیم برہنہ فاقہ زدہ بچّے گھوم گئے، جہاں ایک بار وہ کچھ دوائیں اور
کمبل دینے گیا تھا۔ یہ مدد اُس نے اپنی اور اپنے ہسپتال کے
ڈاکٹروں کی طرف سے دی تھی۔

براؤن نے اُس سے پُوچھا "کیا بات ہے۔ تُم چُپ ہو آج
بُہت۔"

اِتنی بات پر وہ براؤن سے لڑ پڑا۔ "میں بچّہ تو نہیں ہُوں جو
شیرل اور ہیری کے ساتھ کُودنے لگوں۔ تماشا دیکھ رہا ہُوں۔"

براؤن پُوچھنے لگا: "آج بھی نہیں پیو گے؟ قسم کھالی ہے؟"

"کیوں۔ آج تو اور بھی نہیں پینا چاہیے۔ عیسیٰؑ کی پیدائش کا
مُقدّس دن ہے اور بائیبل میں اُس نے منع کیا ہے پینے کو۔" اُس نے
جل کے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"براؤن نے اِس پر کہا "مگر آج تو پوپ بھی پی لیتا ہو گا۔"

"خیر، پوپ تو نہاتا بھی ہو گا شراب میں۔" اُس نے چڑ کر کہا۔

براؤن بولا "تو ہنسو بولو۔"

وہ بے بسی سے کہنے لگا: "کس سے ہنسوں بولوں؟"

اس پر براؤن نے اُسے ایک ٹک دیکھا۔ اپنی مُونچھوں تلے
مُسکرایا اور انور کے پاس جا کے دھیرے سے کہنے لگا: "ارشد گیا ہُوا

ہے۔ زُہرہ اکیلی ہوگی۔ اُسے جا کے لے آؤ۔ کم از کم ہمیں آ کے مُبارکباد ہی دیدے۔

پھر وہ اُس کے پاس آ کے کہنے لگا "ڈانس کر لو"

"میرا دل نہیں چاہ رہا ہے" وہ کھُرتے پن سے بولا۔

براؤن کہنے لگا: "پتا نہیں تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ ڈانس کرنا تُم نے چھوڑ دیا، پینا تُم نے ترک کر دیا۔ اچھے عیسائی بھی نہیں ہو ورنہ کہتا کہ پادری بن جاؤ۔"

وہ قطعی خفا ہو گیا۔ "براؤن، ہر وقت میرے پیچھے نہ پڑے رہا کرو۔ تُم اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"اچھا، چھوڑ دیا" براؤن نے کہا۔ اور سوچنے لگا:

"یہ بات نہیں ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے اِس لیے تُم بور ہو رہے ہو اور مجھ پر غصّہ اُتار رہے ہو۔ اِس میں میری کیا خطا۔ اُسے اپنی قوم کی بربادی کا غم کھائے جا رہا ہے۔ وہ مرنے والوں، زخمیوں اور خانماں برباد ہونے والوں کا سوگ منا رہی ہے تو میں کیا کروں اور اب میں نے اُسے پھر بُلوایا ہے۔ محض تمھاری خاطر۔ مگر تُم میرے شکر گزار تھوڑی ہو گے۔ اِسی طرح لڑے جاؤ گے۔ تمھیں یہ بھی خبر نہیں کہ کوئی اُسے لینے گیا ہے۔" وہ مُسکرایا اُس کی طرف دیکھ کے۔ اور ناچنے میں محو ہو گیا۔

براؤن کے یوُں مُسکرانے پر وہ اَور جلا، حسرت سے دروازے میں

تاکتی ہوئی مسل ٹو کو دیکھا اور سوچنے لگا "خوش بخت اِس کے نیچے اُس شخص کو پیار کیا کرتے ہیں جو انھیں محبوب ہوتا ہے۔"

"تب وہ اور ارشد داخل ہُوئے مگر ارشد کو میس کی دعوت میں جانا تھا۔ وہ اندر آئی تو براؤن نے ایڈورڈ کے چہرے کی طرف دیکھا اور اُس کا رنگ بدلتا دیکھ کے مُنہ پھیر کر مُسکرایا۔ ارشد کو دیکھ کر ایڈورڈ کے چہرے پر دُھوئیں کا ایک بادل آیا اور گزر گیا۔ پیشتر اِس کے کہ ارشد سے ہاتھ ملانا پڑتا وہ یہ کہتا ہُوا کہ اُسے ہسپتال فون کرنا ہے گیلری کی طرف بڑھ گیا اور اُس وقت تک وہاں بیٹھا رہا جب تک کہ ارشد واپس نہ چلا گیا۔

براؤن نے بیرے سے کہا "ڈاکٹر صاحب کو بُلا لاؤ۔ میرا نام نہ لینا۔ کہنا کپتان روبرٹ یاد کرتے ہیں۔"

وہ آیا تو براؤن نے شرارت سے پُوچھا "کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ مُسکرا کر بولا۔ "کہیں نہیں۔ دو چار ضروری فون کر رہا تھا۔"

وہ اب نسبتاً خوش تھا اور اُس کا دُکھیوں کے دُکھوں کی طرف سے دھیان ہٹا ہُوا تھا۔ براؤن نے خوش ہو کر سوچا "شکر ہے۔ یہ خوش تو ہُوا۔ یہ ہنستا ہُوا اچھا لگتا ہے۔"

رات کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی اور ارشد کو ساری رات میس میں گزارنا تھی۔ انور نے کہا کہ میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔ لیکن براؤن نے کہا "تُم دوبارہ تکلیف نہ کرو۔ میرا ڈرائیور اس کو تمھاری گاڑی میں چھوڑ آئے گا۔ وہ بہت اچھا ڈرائیور

ہے۔ بڑی احتیاط سے گاڑی چلاتا ہے۔"

ایڈورڈ نے حسرت سے سوچا۔ "میں بھی چھوڑ سکتا تھا۔ مگر میری یہ قسمت کہاں۔ مجھ سے اچھا تو ڈرائیور ہی ہے۔ پھر بھی میں اپنے خدا کا شکرگزار ہوں جس نے مجھے کچھ لمحات دیئے تو۔ اگر وہ یہ بھی نہ دیتا تو میں کیا کر لیتا۔ بہرحال خدا سخی ہے۔"

اور وہ خود بھی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مگر براؤن نے اُسے روک لیا۔ یہ سوچ کر کہ گھر میں اکیلا کڑھے گا۔ براؤن کے حساب سے ابھی رات بہت باقی تھی۔

اور وہ مصلحتاً یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ کہیں براؤن اور اُس کے مہمان یہ نہ سمجھیں کہ وہ محض اُسی کی وجہ سے ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر وہ اُسے موٹر تک چھوڑنے گیا۔ برآمدے کے نیچے، سُرخ اینٹ کی روش پر سفید پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ براؤن نے اُسے مسل ٹو کے نیچے سے ذرا جھک کے گزرتے دیکھا۔ اِس بار اُس نے مسل ٹو کی طرف دھیان نہیں دیا اور باہر برآمدے میں جا کر نیچے اُترنے لگا۔ یہاں رات کی رانی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ تب اُس نے بے خیالی میں اپنے ہاتھوں سے اُس کی پیشانی پر سے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں آہستہ سے ہٹا دیں۔

ڈرائیور نے موٹر گرم کی۔ اُس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور چُپ چاپ اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ اور جب گرد راہ بیٹھ گئی تو وہ ایک نظر شاہ راہ پر ڈال کر، جس میں ہزار غم پنہاں تھے، مسل ٹو سے ٹکراتا ہُوا اندر آ کے مجمع میں تنہا بیٹھ گیا۔

اور یہاں ہسپتال میں دُنیا سے غیر مُتعلق راہبوں اور راہباؤں نے بڑی دُھوم دھام سے کرسمس منایا۔ اِس دن مریضوں کو بڑے زوردار طریقے سے انجیلِ مُقدّس سُنائی گئی جس سے مرنے والوں کو مرنے میں آسانی رہی اور زِندوں کو موت کے لیے تیار ہونے میں مدد ملی۔

اِس دن تمام راہبوں اور راہباؤں کا مُوڈ بہت اچھا رہا مگر باوجُود اِتنی خوشی اور ہنگامے کے مریض اِس دن کُچھ زیادہ ہی اُداس رہے۔ فرخندہ نے کئی بار ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھریں۔ اپنے چاروں طرف تندرست، خوش باش، جسم چلتے پھرتے قہقہے لگاتے دیکھ کے خوش ہونے کے بجائے وہ بہت رنجیدہ ہُوئی۔ مریضوں میں کِتنے ہی عیسائی بھی تھے مگر وہ سب ایک جیسا محسُوس کر رہے تھے۔ اِس وقت اُن میں اپنی بے بسی اور بیماری کا اِحساس بہت بڑھ گیا تھا۔ اور اِس دِن کرسمس کی رات کو تین مریضوں نے خود کُشی کی۔

اُن کے مُردے اُٹھتے دیکھ کے فرخندہ نے دُعا کی۔ "اللہ صاحب، کوئی نیک دل اور ہم سے محبت کرنے والا ڈاکٹر بھیج دے۔" اُس نے سُنا تھا کہ ابھی آپریشن کرنے والا ڈاکٹر نہیں ملا ہے۔ اُس کا اشارہ اِسی طرف تھا۔ "مگر کون کسی کا دِلدار ہوتا ہے۔" اُس نے مایُوسی سے سوچا اور مزید بیمار ہو گئی۔ ہر بار جب نیا فادر آتا تو اُسے بڑی آس بندھتی۔

مگر پھر چار دن ہی میں اِس فادر کا رویّہ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیتا اور وہ اِس کا دُکھڑا رونے لگتی۔

فرخندہ کچھ اِس مزاج کی مریض تھی جو تصوّرات اور مُعجزات کی دُنیا میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے پاس والے پلنگ کی مریضہ، روشن، سے کہتی "کیا معلوم، اب جو آپریشن کرنے والا نیا فادر آئے وہ اِن سب سے اچھا ہو۔ دُنیا میں مُعجزے بھی تو ہوتے ہیں"۔ فرخندہ پھر بھی آرام سے تھی۔ اُسے پلنگ تو مل گیا تھا۔ کتنے ہی مریض زمین پر لیٹے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو کچھ دے نہ سکتے تھے۔

روشن فرخندہ کے دُکھڑے سُن کر کہتی "پھر کندہ، شُکر کرو علاج تو ہو رہا ہے۔ سر پر چھت تو ہے۔ یہ باہر کے لوگ ہو کے اتنا بھی کر رہے ہیں۔ آگے ہمارے لوگوں کا تو یہ حال تھا کہ ہم سڑک پر بھیک مانگتے تھے۔ ہمیں لوگ دُھتکارتے تھے۔ کوئی کوڑی تک نہیں دیتا تھا۔ زیادہ مُحبت نہ کیا کرو سسٹر سے۔ کسی دن مار بیٹھے گی یا نکال دے گی"۔

یہ روشن اپنے کو ذرا لکھا پڑھا سمجھتی تھی۔ اچھے زمانے میں جب یہ تندرست تھی، اِس نے بڑے آدمیوں کے یہاں آیاگیری کی تھی اور اپنے کو بہت ثقہ اور مُعتبر خیال کرتی تھی۔ مگر فرخندہ اِس کی باتوں پر کان نہ دھرتی۔ وہ ہر نئے راہب کو دیکھ کے بڑے تپک کے سلام کرتی۔ اور اُس کی دلداری پہ آس لگا کر بیٹھ جاتی۔ مگر پھر اِتنی ہی جلدی رُوٹھ بھی

جاتی۔

"کوڑھیوں کی آس ہی کیا۔ آس رہ جاتی ہے خود چل دیتے ہیں"۔

روشن نے ٹھنڈی سانس بھر کے سوچا اور چند دن بعد خود چل دی۔

مگر فرخندہ نے تو جیسے اُس نیک دل کے آنے کے مُعجزے پر یقین کر لیا تھا۔ وہ جیسے جا رہی تھی اور اسی طرح سسٹر روتھ سے مُحبت کیے جاتی تھی۔ روشن کی جگہ اب وہ شامو سے اُن کا دُکھڑا روتی اور کہتی "جب کوئی ہم سے مُحبت کرنے والا فادر آئے گا تو میں اِس کمبخت سسٹر روتھ کی شکایت کروں گی۔ پھر اِسے معلوم ہوگا"۔

شامو کو اُس کی اِس بات پر ہنسی آجاتی۔ وہ کہتی "کوڑھیوں سے بھی کسی نے مُحبت کی ہوگی"۔

اِس بات پر فرخندہ غُصّے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور کہتی "کیوں ہم اُس کے بنائے ہُوئے بندے نہیں ہیں؟ کوڑھ بھیجنے والا بھی وہی ہے۔ تُم کیا جانو"۔

شامو اُس کی دلیلوں کے آگے کھیس اوڑھ کے چُپ پڑ جاتی اور سوچتی "کون اِس کے مُنہ لگے۔ فضُول کسی دن سسٹر اِس کی بے عزّتی کرے گی"۔

فرخندہ گھنٹوں بُڑبُڑ کرتی رہتی "ہُونہہ۔ ہنستی ہیں۔ دُنیا میں نیک بندے بھی ہیں۔ ہر سینے میں ایک سا دِل تھوڑی ہوتا ہے۔ جگہ جگہ بھالو آدمی ہوتا ہے۔ جب خدا صاب چاہتا ہے تو بھالو آدمی بھیج

دیتا ہے۔ ہر مذہب میں بھالو آدمی ہوتا ہے۔ ہندو لوگ میں گوتم بُودھ بھالو آدمی تھا۔ اُس کا سکول اِدھر کرنا فلی میں چالو رہتا۔ ہندو ہونے سے کیا بھالو تو تھا۔ خُدا صاب اُس کو اچھار کھنے سکے گا۔ کوئی کوئی اِتنا ایک ڈاڑھی والے مولوی سے بھی اچھار کھنے سکے گا۔ اِدھر بھی آنے سکے گا' بھالو آدمی۔ عیسائی لوگ کے اندر خُدا صاب اُسے بولے گا جاؤ بیٹا بیمار کو دیکھو ہم تمھیں اچھار کھنے سکے گا۔"

یہ شامو بہار کی تھی۔ اِسے سمجھانے کو فرخندہ کو اُردو بولنا پڑتی تاکہ وہ بھالو آدمی کے آنے پر یقین کرے اور اُس کے اِنتظار میں لگ جائے۔

"لعنت ہو مجھ پر۔ میں بھی کس بکھیڑے میں پھنس گیا۔"

یہ مارچ کا مہینا تھا اور اتنے اچھے موسم میں جبکہ اُس کے چاروں طرف پھول ہی پھول تھے اور جنگلے پر چڑھی ہوئی زرد چمیلی کے پھولوں میں ہر صبح چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ وہ اِن سب سے بے نیاز اپنے آپ پر بڑی تلخی سے لعنت بھیج رہا تھا۔

"لعنت ہو مجھ پر۔ جب تم گئی تھیں تو مجھے جینے کا کوئی طَور بھی سکھا گئی ہوتیں۔ کوئی راہ تو سجھائی ہوتی۔ یہ زندگی کیسے گزرے گی۔ دراصل یہ زندگی تو مدت سے پرائی تھی۔ اب مجھے اِس کی پروا نہیں اور دِل تو کب کا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اِن کوچہ و بازار میں بکھر گیا، جن پر سے تم گزرا کرتی تھیں۔ اب تم ایبٹ آباد جا کے بیٹھ گئیں۔ کیونکہ

تمھارے میاں کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ پھر چھ مہینے بعد تم اسکردو جانے والی ہو۔ میں کہاں تک اور کب تک تمھارا پیچھا کرتا رہوں۔ میں ہی احمق تھا جو چند لمحوں پر تکیہ کر بیٹھا۔ قوسِ قزح کو بھی کسی نے پکڑا ہے۔"

اُس نے ہر طرح جینے کی کوشش کی مگر وہ اُلجھتا ہی رہا۔ ایک بار پھر اُس نے پینے کی کوشش کی، مگر اِس سے اُس کا ذہن بہت صاف ہو جاتا تھا اور اُس کی یاد شدید ہو جاتی تھی۔ لڑکیوں کا سہارا لینا چاہا لیکن اُن کے قریب پہنچتے ہی اُسے ایسا لگتا جیسے وہ بڑا زبردست گناہ کرنے کا خیال رکھتا ہو۔ پھر یک لخت دُھندلکے میں اُس کا چہرہ اُس کے سامنے بڑھنے لگتا۔ پھر دُھندلکا چھٹ جاتا اور وہ بالکل صاف اُس کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ وہ اُس سے بے وفائی کسی طور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُس وفا کی قسم نہیں توڑ سکتا تھا جو اُس نے کبھی کھائی ہی نہ تھی اور نہ کسی نے کھلوائی تھی۔

اور جب زیست نے اپنا مزہ بالکل ہی کھو دیا اور کوئی صورت فرار کی نہ بنی تو اُس نے بھی زندہ رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور تب وہ اپنے گرجا کے بشپ کے پاس گیا۔ بشپ اُسے دیکھ کے چونکا۔ یہ اجنبی چہرہ تھا جو کبھی گرجا میں نظر نہ آیا تھا۔ اُس نے اپنی کرسی اِس اجنبی شخص کی طرف گھمائی۔

وہ کہنے لگا۔ "میں نے سُنا ہے ڈھاکے میں مشن نے کوڑھیوں کا جو ہسپتال کھولا ہے اس میں سرجن کی ضرورت ہے۔ میری خدمات حاضر

ہیں۔"

اِس پر بشپ مُسکرایا۔ اُس نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کی سادہ اور بے تکلّف گفتگو سے محظوظ ہُوا جس میں کوئی ذاتی تعارُف نہ تھا۔ نہ گرجے سے بے تعلّق رہنے کا بہانہ یا جواز تھا۔

بشپ نے کہا "میں تمھارے کاغذات دیکھ سکتا ہُوں؟"

اُس نے کاغذات بُوڑھے بشپ کے آگے پھیلا دیے۔

بشپ چونکا اور اپنی خوشی اور حیرت کو دباتے ہُوئے کہنے لگا: "تو تُم نے مدراس میں بھی کام کیا ہے اور رائل انفرمری میں اوّل آئے تھے؟ خُوب۔ تُم وہاں جانا چاہتے ہو؟ مگر معلُوم ہے کہ تمھیں اِتنی تنخواہ نہ ملے گی اور نہ صِرف یہ بلکہ دُنیا کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑے گا۔ تم کوڑھ کے ماہر سرجن ہو۔ تُم کو معلوم ہوگا کہ دیر یا سویر یہ اُن مُعالجوں کو بھی لگ جاتی ہے جن کا چوبیس گھنٹے مریضوں سے تعلّق رہتا ہے۔ اُن کے لیے باہر نِکلنا اور اُسے پھیلانا مُناسب نہیں۔ سوچ لو۔ تُم نوجوان ہو۔ دُنیا تمھیں بُلائے گی۔ ایسا نہ ہو کہ چھوڑ کر بھاگ آؤ۔ یہ دُنیا چھوڑنا تو کُچھ ہم راہبوں کی ہی شان ہے، جو خُدا رسیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور میں نے تو تمھیں گرجا میں بھی نہیں دیکھا۔ ویسے تمھارا فرقہ کونسا ہے؟"

اس نے بشپ کی گفتگو غور سے سُنی اور کہنے لگا: "میرے ماں باپ کا فرقہ وُہی ہے جو آپ کا ہے۔ یعنی رومن کیتھولک۔"

بشپ نے کہا "تُم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمھارا فرقہ اور مذہب تُمھارے والدین سے مختلف ہو۔"

وہ بیزار ہو کر کہنے لگا: "میں کسی فرقے سے تعلُّق نہیں رکھتا۔ خُدا کا بندہ ہُوں۔ اور مانتا ہُوں کہ عیسیٰؑ پیغمبر ہونے کے علاوہ مسیحا بھی تھے۔ میں وہاں راہب کی حیثیّت سے نہیں بلکہ محض مُعالج کی حیثیّت سے جانا چاہتا ہُوں۔ میں رہبانیت کا لبادہ نہیں پہنوں گا۔ اگر یہ منظُور ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں مشنری کی سپرٹ سے نہیں بلکہ اُن کے علاج اور اُن کو صحت پہنچانے کے خیال سے جا رہا ہُوں۔ باقی میں نے اِس کے مُتعلّق خُوب سوچ لیا ہے۔ دُنیا اب مُجھے واپس نہیں بُلا سکتی۔ ہم دونوں ایک دُوسرے سے مُدّت ہوئی ناتا توڑ چکے ہیں۔"

بشپ خاموش سُنتا رہا۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ مشنری کا اصول توڑ رہا تھا مگر اُس کی تیوری پہ بل نہیں آئے۔ وہاں سرجن کی سخت ضرورت تھی۔ اُس نے سوچا "ضرورت بڑی چیز ہے۔ اور یہ اُس کے مقابلے میں بہت چھوٹی سی ضد کر رہا ہے۔ وہاں سرجن بھیجنے کا فخر مُجھے حاصِل ہوگا۔ کوئی اور بشپ یہ معرکہ نہ سر کر سکا۔ ایک آدھ ایسے کام انجام دینے کا مطلب ہے کہ میں جلد ہی آرچ بشپ بنا دیا جاؤں گا۔"

بشپ اُسے دیکھ کے شفقت سے مُسکرایا اور آگے جُھک کے کہنے لگا: "ایک بار پھر سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ دُنیا تمھیں اپنی طرف کھینچے اور تُمھیں اِس سے کُچھ حاصل کرنے کا خیال آئے۔ پھر بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ پچھتاوا ــــ"

اور تب اُس نے اپنے گھر کے جنگلے میں کھڑے ہو کر اِس شہر پر نظر ڈالی۔ یہ شہر اُسے بہت ویران لگا۔ اب اُس کا جی اِس سے اُچاٹ ہو چکا تھا اور وہ اِس میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔

جھک کر اُس نے دیکھا اور چپکے سے کہا "یہ راستے، یہ موڑ اُجڑ گئے اور ساتھ ہی دل کی بستی بھی بس کے ویران ہُوئی اور آئندہ نہ بسنے کو اُجڑ گئی۔ اب یہ کبھی آباد نہ ہو گی۔ تو یہ سب کچھ یُوں تھا۔ ہُوں"

اندر آ کے اُس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا اور گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ پھر وہ اس طرح بولا جیسے وہ کھڑی ہو۔

"اِن آنکھوں میں تُم ہی تُم نظر آتی ہو۔ آئینہ دیکھ کے مجھے ایسا لگا، جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ آج سے آئینہ دیکھنا ختم ہُوا۔"

واپس جنگلے میں آ کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے دھیرے آنسوؤں کا ایک سمندر بہنے لگا۔

پھر اُس نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ بڑھا کے چمیلی کی بیل ہلائی، جس کے اندر سے بہت سی چڑیاں نکل کر پھُر پھُر اُڑ گئیں۔ وہ اُنھیں رنج سے دیکھتا رہا۔

پھر اُس نے اپنے گھر پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا: "میں اِس میں آرام سے رہتا تھا مگر اب بے آرامی محسوس کرتا ہوں۔ دراصل گھر تو دِل میں ہُوا کرتا ہے۔ اور جب دل ہی اُجڑ گیا ہو تو پھر ہر جگہ ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔"

پھر وہ اُسے خط لکھنے بیٹھا۔

"اگر تُم کوئی حرج نہ سمجھو تو میں تُم سے آ کر مِل لُوں۔ اور وہ یُوں کہ میں اپنا تعلق دُنیا سے توڑ رہا ہُوں۔ میں کوڑھیوں کے ہسپتال، میمن سنگھ، جا رہا ہُوں۔ میں تمھارے یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ تُم گھبرانا مت۔ کوئی کُچھ نہیں کہے گا۔ جس دن آؤں گا اُسی دن پلٹ جاؤں گا۔ خط کے بجائے تُم مجھے ٹیلیفون پر بتا دو تو اچھا کرو۔ یہاں نیچے فون ہے، جن کے یہاں میں اُوپر رہتا ہُوں۔ آج دو ہے پانچ کو مجھے چلا جانا ہے۔ وقت کم ہے اور کام بہت۔ خط کے اُوپر فون نمبر میں نے لکھ دیا ہے۔

تمھارا ایڈورڈ

خط اُس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی "یہ بدلہ تُم نے بہت سخت لیا۔" ہر چیز گھوم رہی تھی۔ اور کانوں میں قیامت کا شور تھا اور ہر آواز یہ کہتی تھی۔ "وہ چلا۔" یک لخت اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ جیسے کسی نے پھُونک مار کے زندگی کی شمع جھپ سے گُل کر دی ہو اور وہ اندھیرے میں چیزوں سے ٹکرا رہی ہو۔

ٹیلیفون پر اُس کی آواز بے طرح کانپ رہی تھی - اور وہ بار بار چیختا
تھا "مجھے کچھ سُنائی نہیں دیتا - بس اِتنا بتادو، آؤں یا نہ آؤں؟ بات کو
ٹُول دینے کی کوشش نہ کرو - تمھاری آواز بیٹھی ہُوئی ہے۔"

اِس پر زُہرہ نے چِلّا کے کہا "کہہ تو رہی ہُوں، آجاؤ"

اُس نے پُوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"گلگت میں۔"

"ٹھیک - تو میں آتا ہُوں - مگر مجھے تمھارے گھر کا پتا نہیں معلُوم
بھٹکتا پھرُوں گا - سمجھادو۔" بہت چڑچڑا ہو رہا تھا - اور بار بار جھنجھلا کر
چِلّاتا تھا -

اور جب وہ سمجھانے لگی تو وہ اَور چیخا "میری بالکل سمجھ میں نہیں آرہا
ہے - میں خان کو بُلاتا ہُوں، اُسے سمجھادو - سمجھادو گی نا؟"

اگر وہ پہلے اُس سے خان کو سمجھانے کو کوئی بات کہتا تو وہ غصہ کرتی
مگر اب تو وہ جارہا تھا - جب وہ خان کو پتا سمجھا چکی تو اُس نے خان سے
فون لیا اور چڑ کے کہنے لگا :-

"غور تو کرو - اب آخری لمحے میں تمھارا گھر ڈھونڈ رہا ہُوں۔"

وہ چُپ رہی اور دُوسرے سِرے پر ایڈورڈ نے غصّے سے رِسیور
پٹخ دیا -

صُبح صُبح وہ آیا - بظاہر بہت تازہ دم اور صاف سُتھرا لگ رہا تھا -
آدھی آستین کی سفید بُش شرٹ اور سفید پتلون پہنے دِلکشی سے مُسکراتا

ہُوا وہ اُترا اور زُہرہ اُسے دیکھ کے ٹِھٹک گئی - پھر اُس نے پُوچھا "تمھیں
گھر ملنے میں دِقّت تو نہیں ہوئی؟"

وہ ہنس کر کہنے لگا "خاصا کام تھا - بہرحال مِل ہی گیا۔"

اُس نے پُوچھا :-

"چائے پیوگے؟"

"صُبح بہت پی ہے - دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"تو پھر کافی پی لو" - زُہرہ نے اپنی آواز کا توازُن قائم رکھتے ہُوئے کہا۔
دِل کے ساتھ اُس کی آواز بھی ڈول رہی تھی -

ایڈورڈ نے اُس کی طرف غور سے دیکھا - اُس کی آنکھیں سُوجی ہُوئی
تھیں - وہ سوچنے لگا "ہاں، تُم آنسُو بہا سکتی تھیں - اِس لیے تُم نے
بہائے اور غُبار نکال دیا - مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اِس لیے اپنا غُبار
دل میں لیے جارہا ہُوں - ٹھیک ہے - کُچھ اشک دِن کی روشنی میں
جھلملاتے ہیں، کُچھ اشک غم میں چُھپے ہُوئے ہیں، جِن کو تُم دیکھ نہیں
سکتیں۔"

اُس کے دونوں بچّوں کو دیکھ کر اُس نے ایکدم جھنجھلا کے بات شرُوع
کی - "تُمھارے بچّے تمھاری نجات کا ذریعہ ہیں - میرے پاس ایسا کُچھ
نہیں ہے - تُم فُرصت کے اوقات ہی میں میری طرف دِھیان کرتی
ہوگی - میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو تُمھاری طرف سے میرا دھیان
کِسی لمحے ہٹا سکے۔" اُسے بہت غصّہ آرہا تھا -

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ پھر کہنے لگی: "کوڑھ تو متعدی بیماری ہے۔ ہر وقت ساتھ رہنے سے لگ جاتی ہے۔ تم نے اِس خطرے کے متعلق بھی سوچا ہے؟"

وہ اور غصے ہوا اور کہنے لگا "میں بچہ تھوڑی ہوں۔ اور یہ تم مجھے سمجھا رہی ہو جو اس کا سرجن ہے۔ وہاں اور بھی لوگ ہیں۔ میں اکیلا تھوڑی ہوں۔ پھر مجھے کوئی ایسی پروا بھی نہیں۔ میرے اُوپر کسی کی ذمہ داری نہیں ہے۔"

وہ پوچھنے لگی: "تم مجھے خط تو لکھا کرو گے نا؟"

وہ اِس انداز میں کہنے لگا جیسے اُس پر احسان کر رہا ہو "ہاں۔ یہ میں کر دیا کروں گا۔"

وہ کہنے لگی: "آج تم ٹھہر جاتے۔"

وہ ناخوش ہُوا۔ اور بولا "اب تمھیں مجھے روکنے کا خیال آ رہا ہے، جبکہ مجھے ہزاروں کام ہیں۔ پہلے تم کہاں تھیں؟ مجھے بنک جانا ہے اور میں چھٹی پر تھوڑی ہوں۔"

وہ چپ چاپ اُس کا غصہ سہتی رہی۔ پھر کہنے لگی: "مگر تم نے ایسا کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ کہنے لگا: "پھر میں کیا کرتا؟ تمھارے پاس میرے جینے کی کوئی راہ تھی؟ تم مجھے جینے کا کوئی طریقہ سکھا گئی تھیں؟ تمھارے پاس تمھارے بچے ہیں۔ تم اِن میں مشغول رہتی ہو۔ یہی تمھاری نجات ہیں۔ میرے پاس کیا ہے۔ میری نجات کی کوئی راہ ہے تمھارے

پاس؟" وہ دانت پیس رہا تھا۔ اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

پھر وہ اندر کھانے کے لیے گئے جہاں وہ اُس کے دونوں لڑکوں کو جو خاصے بڑے تھے، میز کے گرد بیٹھا دیکھ کے نہ صرف رنجیدہ ہُوا بلکہ غصے بھی ہُوا۔ وہ اُن سے قطعی نہیں بولا اور نہ اُنھوں نے ہی اُس کی ذرہ برابر پروا کی۔ وہ آپس میں ہنستے بولتے رہے۔

اُس نے بڑے رکیتے سے سوچا "یہ اِن میں مجھے قطعی بھول جاتی ہوگی۔ ایک میں ہُوں جو بے وقوفوں کی طرح ہر گھڑی اِس کے متعلق سوچتا رہتا ہُوں۔"

کھانے کے بعد باہر آکے اُس نے پُوچھا "وہ گلگت سے کب آ رہا ہے؟ سُنا ہے میجر ہو گیا ہے۔ مُبارک ہو۔"

اُس کے دل سے دُھوئیں اُٹھ رہے تھے ایسے کہ زُہرہ کو محسوس ہُوا جیسے وہ جل رہا ہے۔

وہ کہنے لگی "اگلے ہفتے آ جائے گا۔"

اِس پر اُس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لی اور گہری سی ہُوں کی۔

زُہرہ پُوچھنے لگی "تمھارے ماں باپ ہیں؟"

وہ کہنے لگا: "اب یہ پُوچھنا تمھیں یاد آ رہا ہے۔ اِس سے پہلے تُم نے مُجھ سے میرے مُتعلق کبھی کوئی بات پُوچھی؟ ایک بار پاکستان بنتے ہی جب میں ہندوستان گیا تھا تو اپنے باپ کے مرتے ہی پہ گیا تھا۔ مگر تمھیں کیا معلوم۔ میری ماں اور بھائی ولایت میں ہیں۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔
زُہرہ کہنے لگی۔ "تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔"
"نہیں مجھے دیر ہو جائے گی۔"
چلتے وقت زُہرہ نے اُسے ایک تھیلی دی "یہ تُمھارے لیے ہے۔"
"اچھا، شکریہ"۔ بغیر دیکھے اُس نے تھیلی کار میں رکھ لی۔
گھر آ کر اُس نے تھیلی کھولی اور دیر تک سفید ملنے کے ڈرلینگ گاؤن کو دیکھتا رہا۔ پھر دل میں کہنے لگا "ہر چیز کو خُوب سمجھتی ہو۔ یہ وہاں کے موسم کے لیے بہت مُناسب ہے۔"
اور ایک بار پھر اُس نے بغیر القاب کے تین سطریں لکھیں:
"تُمھارے تحفے کا بہت شکریہ۔ یہ واقعی بہت اچھا ہے اور وہاں میرے کام آئے گا۔ اُمید ہے تمھارے بچے بخیریت ہوں گے۔ میں وہاں پہنچ کر تُمھیں اپنی خیریت سے مُطلع کروں گا۔

ایڈورڈ

"زُہرہ نے خط پڑھ کر چپکے سے دِل میں کہا: "جاؤ، خدا حافظ۔ بے شک تُم اچھے چارہ گر ہو گے۔ تُمھارے ہاتھوں کی نرمی میں نے اُس دن محسوس کی تھی جس دن تُم نے میری لٹیں ہٹائی تھیں۔"

یہ فیصلہ اُس نے خود ہی کیا تھا اور وہ ہر طرح مُطمئن تھا۔ مگر اُس کے دل میں غُبار تھا اور جی بہت مَیلا ہو رہا تھا۔

مانا کہ یہ شہر اب ویران تھا مگر حیات بعد الممات تو اُسے یہیں ملی تھی اور زندگی کے زہر کا پیالہ اُس نے اِسی شہر میں پیا تھا لیکن اُسے یہ خبر نہ تھی کہ جس سرزمین کی طرف جاتے ہُوئے اُس کے پاؤں مُشکل سے اُٹھ رہے تھے، وہ سرزمین نہ جانے کب سے اُس کی مُنتظر تھی۔

ڈھاکے کے ہوائی اڈّے پر راہب اُس کے اِستقبال کے لیے صف بستہ کھڑے ہُوئے تھے۔ بدلی جھُوم کے آئی تھی اور پھُولوں اور خود رو گھاس کی میٹھی میٹھی خوشبو ہر سُو بکھری ہُوئی تھی۔ تب وہ سُست قدموں سے نیچے اُترا۔ تیرتی ہُوئی بدلی نے ایک لحظے کو سفر موقُوف کیا۔ جھُومتے ہُوئے درختوں نے ایک ذرا جھُک کے زمین سے سرگوشی کی، زمین سے خوشبُو نے بات اُڑائی اور پھر دم بھر میں وہ بات سارے سبزہ زاروں میں پھیل گئی۔ ناتواں اور بے قرار رُوحیں سمٹنے لگیں اور اُنھوں نے مُسکرا کے کہا۔ "وہ آ گیا جس کا اِنتظار تھا۔ نزارت کا عیسیٰ نہیں، زخموں کا چارہ گر۔"

خُود اُس نے بھی ایسا ہی محسُوس کیا جیسے اِس زمین اور اِس فضا

میں اُس کا مدتوں سے اِنتظار کیا جا رہا ہو۔ تب وہ مُسکراتا ہُوا چشم براہ راہبوں کی طرف بڑھا اور ایک ٹک اُس نے اُوپر کے اندھیرے کو دیکھا اور سوچنے لگا۔ "میں روشنی کا شائق رہا ہُوں۔ ایسی کُہر آلود جگھیں مُجھے پسند نہیں تھیں لیکن یہ جگہ مجھے اچھی لگ رہی ہے اور آج مُجھے احساس ہُوا ہے کہ نیم تاریکی اور دُھند کا بھی ایک حُسن ہوتا ہے۔ پھر وہ روشنی جو اُس نے مُجھے بخشی ہے' اُس سے خود میرے اندر اتنی دُھوپ کھِلی ہُوئی ہے کہ مجھے یہ اندھیرا اچھا لگ رہا ہے۔"

راہبوں نے اُس کی ہِمّت کی داد دی اور اُس کے جذبۂ ایثار سے واقعی مُتاثر ہوئے' جو راہب نہ تھا' مذہبی نہ تھا اور پھر بھی سب کچھ تج کے مقتل میں خوشی سے سر دینے آگیا تھا۔

اِس کی قربانی ہزار راہبوں سے برتر ہے۔" برادر شرمن نے محسُوس کیا اور اِسے اِحترام سے دیکھا۔

وہ دو دن ڈھاکے کی مشنری میں راہبوں کے ساتھ رہا۔ پھر برادر شرمن نے اُسے اپنی ذمّہ داری میں لے لیا اور مشرقی بنگال دکھانے لے گیا۔ چِناگانگ کا پہاڑی علاقہ اُس نے سرسری طور پر دیکھا۔ یہاں اُسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ لیکن کرنافلی اُسے بڑا اچھا لگا اور اِس دریا کے پاٹ نے اُسے قوّت کا اِحساس دلایا۔ وہ دیر تک کھڑا اپنی نیلی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اور دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں اور گہری ہوگئیں۔

پھر وہ اُوپر بغیر پھسلے چڑھتا گیا اور بُدھ کی خانقاہ میں جب پہنچا۔ وہاں

اُس نے آرام سے جُوتے اُتارے اور خانقاہ کا کونا کونا دیکھتا پھرا جیسے کُچھ تلاش کر رہا ہو۔ طالب علموں نے اُس سے خوش دلی سے بات کی اور اُن کے گُرُو نے اُسے خوش آمدید کہا۔

اُس نے گُرُو سے کہا "گوتم بُدھ کی تعلیمات میں سے کوئی مُختصر سا جُملہ میرے سامنے دُہراؤ۔ میں سُننا چاہتا ہُوں۔"

گُرُو سوچتا ہی رہا۔ تب ایک طالب علم نے کہا۔ "ایک چھوٹی سی بات اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہُوں۔ گوتم نے فرمایا کہ اِرادتاً کسی جان کو ضائع نہ کرو۔ اُسے بچانے کی کوشش کرو۔"

اُس نے کہا۔ "ہُوں۔"

شرمن نے اُس کی پوزیشن اُن پہ واضح کی اور طالب علموں نے کہا۔ ہماری دُعا ہے کہ تُم اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور زندگیوں کو بچا سکو۔ آفریں ہے تُم پر کہ تُم کانٹوں میں چھُپے ہُوئے قُربانی کے پھُول کا حُسن سمجھ سکے اور اس کے حصُول کے لیے اتنی کٹھن راہ پہ گامزن ہُوئے۔ دُعا ہے کہ تُم سُرخ رُو ہو۔"

وہ مُسکرایا اور چُپکے سے آمین کہی۔ پھر کہنے لگا: "شُکریہ۔ تُم بڑے اچھے لوگ ہو جو میرے لیے یُوں دُعا کرتے ہو۔ میں ممنُون ہُوں۔"

پھر وہ مُڑ کر شرمن سے کہنے لگا: "عجیب بات ہے! مجھے ایسا لگا جیسے میں یہاں آچُکا ہُوں۔"

اِس پر شرمن نے کہا۔ "ہندوستان کے جنگلات ایک دُوسرے سے

بہت مُشابہ ہیں۔ اِس سے ملتے جلتے مقامات تُم نے ترائی میں دیکھے ہوں گے۔ ذہن محفوظ کر لیتا ہے۔"

اُس نے سر ہلایا اور کہنے لگا: "شاید ذہن محفوظ کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ وقت سے بے نیاز ہے۔"

پھر شرمن اُسے سلہٹ لے گیا۔ اُس کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ اِس لیے شرمن نے اُسے صرف چند اہم مقامات دکھائے حالانکہ اُسے سُندر بن جانے کا بہت شوق تھا۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث اُس نے شرمن سے اِس کا ذکر نہیں کیا۔

یہ مقام بھی اُسے اچھا لگا۔ چائے کے باغات اور ان میں پتیاں توڑتی ہوئی عورتیں۔ اِس منظر میں اُسے انہماک اور سکون کا اِحساس ہُوا۔ وہ دلچسپی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ اِس کے علاوہ یہاں اُسے اور مقاموں کی نسبت فراغت اور صحت کی فضا نظر آئی۔

پُرانے طرز کے سجے ہُوئے گھر دیکھ کے اُسے اپنے باپ کے ہندوستان میں مختلف مقامات کے گھر یاد آئے اور پلانٹرز کے بچّوں کو نوکروں کے ساتھ گھومتا دیکھ کر اُسے اپنا اور پیٹر کا بچپن یاد آ گیا۔ "یہ پھر کبھی نہیں آتا۔" اُس نے مُسکرا کر سوچا۔

یہاں اُسے گزری ہُوئی بہت سی باتوں کا خیال آیا۔ بچّوں کے ساتھ کھیلتا ہُوا ایک نوکر اُسے احمد لگا۔ اور گھر میں گھومتی پھرتی ماؤں کا خیال کر کے ممی کی یاد تکلیف دِہ حد تک آئی۔ پھر ڈھلوان چھتوں کے

خوبصورت کا ٹچوں پر نظر ڈال کر اُس کے دل میں اُس عورت کی یاد کھٹکنے لگی اور پھر ممی اور وہ آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔

پھر اُس نے نظریں ہٹا لیں اور شرمن سے آگے چلنے کو کہا۔ شرمن نے محسوس کیا کہ وہ تھکا ہُوا اور بیزار سا ہے۔

یہ مقام یہاں کے عام گاؤں کی طرح تھا مگر وہ یہاں آ کر ٹھٹک گیا۔ اُس کے مزاج میں ایک ذرا ٹھہراؤ پیدا ہُوا۔

"میں بستی کے اندر جاؤں گا۔" اُس نے ضِد کی۔

شرمن نے کہا "اندر بیماری اور غلاظت ہے۔ وہاں جا کے کیا کرو گے؟ پھر ان گاؤں والوں کی عادت ہوتی ہے کہ نو وارد کو دیکھ کے گھیر لیتے ہیں۔"

اِس پر اُس نے مزید ضِد اور بے پروائی سے کہا۔ "گھیر لینے دو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بیماری ہی میں رہنے آیا ہُوں۔ میں یہاں، عام بستی میں، کوڑھ کا تناسب دیکھنا چاہتا ہُوں۔"

شرمن نے کہا "آگے موٹر نہیں جا سکتی۔ کشتی سے دریا پار کرنا پڑے گا پھر کافی دُور پیدل بھی چلنا پڑے گا۔ آگے نِری کیچڑ ہے۔ جُوتے خراب ہوں گے۔"

وہ کہنے لگا: "تمھیں جُوتوں کا خیال ہے تو تم ٹھہرو۔ میرے ساتھ کوئی بنگالی کر دو۔"

شرمن ٹھہر گیا اور وہ ایک بنگالی لڑکے کو لے کر

اُسے ایک بنگالی نے ڈاب پیش کی جس کو اُس نے پیا اور پسند کیا۔

اُس کی رفتار تیز تھی اور وہ بڑے شوق سے آگے بڑھ رہا تھا جیسے راستا اُس کا جانا بُوجھا ہو۔ راہ میں دو چار باشائیں آئیں اور وہ اُن کے سامنے بغیر رُکے آگے بڑھ گیا۔ ہر باشا سے دو ایک لوگ، جیسا کہ شرمن نے کہا تھا، اُس کے ساتھ ہوتے رہے۔

اُس کے ساتھ والا چھوکرا اِن لوگوں کو بتا رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر ہے اور وہ ایک دُوسرے کو سر ہلا ہلا کے سمجھا رہے تھے۔ "اے ڈاکٹر بابُو بوڑا (بڑا) ڈاکٹر پچھم سے آیا۔ بھالو۔ بھالو۔" سب اُسے قدر سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک خستہ حال باشا کے آگے وہ ٹھہر گیا۔ تب ایک بنگالی نے آگے بڑھ کے اُس کا راستا روکا اور کہا "ڈاکٹر بابُو، آگے نہ جانا۔ اے بارمی بھالو نا۔ اے تو کوڑھن کی بارمی ہے۔"

یہ آنو تھا جو اُس کا راستا روکے کھڑا تھا۔

اس نے مُنہ اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ یہ بنگالی اُسے بہت چالاک لگا۔

"سوٗر کا بچہ" وہ بڑبڑایا اور اُس چار پسلی کے آدمی کو اُس نے ایک ہاتھ سے اپنی اُلٹی طرف دِھیرے سے دھکیل دیا۔ اور جُھک کے باشا کے اندر پہنچا۔ آنو دُوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ باہر ہی کھڑا رہا۔ صِرف ایک بُوڑھا اُس کے ساتھ اندر گیا۔ یہ مسجد کا مُلّا تھا۔

شمپا نے آنکھیں پھاڑ کے اُسے دیکھا۔ اُسے اُردو نہ آتی تھی اور وہ ابھی بنگالی نہ جانتا تھا۔ تب اُس نے مُلّا سے کہا "کوڑھن سے پُوچھو، یہ میرے ساتھ ہسپتال چلے گی؟ اِسے بتاؤ کہ میں کوڑھ کا ڈاکٹر ہُوں اور

اِس کا علاج کرنا چاہتا ہُوں۔ یہ اچھی ہو سکتی ہے۔ اِس کا چہرہ ابھی صاف ہے۔" مُلّا نے شمپا کو بتایا۔

شمپا نے کہا "اِس سے کہو۔ اِس سے کہو۔" پھر اُس کا گلا رُندھ گیا اور وہ اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ اِس کو بتانا چاہتی تھی کہ ایک بُدھی اُس کا اِنتظار کرتا تھا اور مُنتظر ہی مر گیا۔ مگر گویائی اُس کے پاس نہ تھی۔ وہ اس سے کیا کہتی جو اُسے جانتا نہ تھا، جِسے بُدھی کے مُتعلق کچھ بھی معلُوم نہ تھا۔ وہ جانے میں پس و پیش کر رہی تھی اور وہ بڑے صبر سے اُسے سمجھا رہا تھا۔ تب شمپا نے محسُوس کیا جیسے مہاتما بُدھ کا بے چین بیرو کھڑا کہتا ہو "شمپا، وہ شُبھ گھڑی آگئی ہے جس میں اُسے یہاں پہنچنا تھا۔ رانی، یہ وُہی تو شخص ہے جس کا میں اِنتظار کرتا تھا۔ تُو اِسے نہیں پہچانتی پر میں اِسے جانتا ہوں۔ جا، میں نے تجھے حِفاظت سے اِس کے ہاتھوں میں سونپا۔" وہ جانے کو کھڑی ہو گئی۔

چلتے چلتے دو چار کوڑھی اُس نے اور سمیٹے اور موٹر میں بیٹھ کر مُطمئن ہو کر سوچا "جیسے یہ میرا انتظار کرتے ہوں۔ خُدا ہر ایک کا 'وقت پر' اِنتظام کر دیتا ہے۔ ہر چیز کا اُس نے وقت مُعیّن کر رکھا ہے۔ خُدا غافل نہیں رہتا۔"

اور وہ اِن کو لے کر اپنے دُشوار گُزار سفر پر طمانیّت قلب سے چل کھڑا ہُوا۔ راستوں نے اُسے لبّیک کہا، ہواؤں نے اُس کے چہرے پر خُوشبُو بکھیری، گُل مہر کے پھُول اُس کے قدموں تلے بچھ گئے۔ اور

سیکڑوں پُراُمید آنکھیں فرشِ راہ ہوئیں۔

ہسپتال کی طرف بڑھتے ہُوئے اُس نے پلٹ کے دُور دُور پھیلے کُنجوں اور سبزہ زاروں کو دیکھا اور مُسکرا کے اُن سے کہا "تم مجھے اپنے بیمار بھیجتے رہو۔ میں وعدہ کرتا ہُوں کہ میں اپنی زندگی اِن کے لیے وقف کر دُوں گا اور انھیں اپنے زخم خُوردہ دل سے لگاؤں گا۔ اے زمینِ سرسبز اور اے سرزمینِ کرب و بلا، میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے اُوپر یقین ہے۔"

پھر ہسپتال کے پھاٹک پر ٹھٹک کے اُس نے کہا:۔

"اے خُدا، میں اپنے دِل کے ٹکڑے تیرے حضُور میں پیش کرتا ہُوں کہ تجھے شکستہ دِل عزیز تر ہیں اور اِس اکیلی روشنی کی وساطت سے اس میں داخل ہوتا ہُوں جو اُس نے مجھے بخشی ہے۔ اے خُدا مجھے سُرخ رُو کر، تاکہ میں اپنے آپ سے شرمسار نہ ہُوں۔ اے خُدا، مجھے ثابت قدم رکھیو۔ اور میرے یقین کو مُتزلزل نہ کیجیو۔"

اُس نے شرمن کو خُدا حافظ کہا اور اپنے مریضوں کا قافلہ لیے کچھ اِس شان سے آگے بڑھا جیسے غازی جامِ شہادت پینے ذَوق و شوق سے بڑھتا ہے۔

پھر اُس نے وارڈ میں ایک لائن میں لیٹے ہُوئے مریضوں کے پاس سرنگوں ہو کر کہا:۔

"اے خدا! ہم سب گُنہگار ہیں لیکن تیرے ادنیٰ خادم ہیں۔ تُو ہمیں اپنا اِعتماد، اپنا رحم، اپنی مہربانیاں اور اپنے لاتعداد اِنعامات عطا کر

اور اپنے نیکوکار شہیدوں میں شامل کر۔ آمین!"

یہ رومن ماس کی لاطینی میں دُعا آج اُسے یاد آئی، جو اُس نے بڑے خلُوص سے پڑھی۔ پھر ایک اور دُعا خود اُس کے اندر سے اُٹھی جو اُس نے دِل میں کہی:۔

"آج میں اُس سے جُدا ہوتا ہُوں جو مشعلِ راہ ثابت ہُوئی۔ اے خُدا، تو اُسے اپنی حفاظت میں رکھیو اور میرے اس جذبے کو بھی جس کی وساطت سے مجھے یہ جذبہ عطا ہُوا۔ تو اِن دونوں جذبوں کی تکمیل کر تاکہ وہ لازوال ہوں۔ اے خُدا، مجھے تنہائی کی سُولی سے محفُوظ رکھیو اور اِس سے پہلے ہی مجھے بُلا لیجیو۔ اور اب میں مُعالج، مسیحا عیسیٰؑ ابنِ مریم کی مسیحائی کے صحت کا جام اُٹھاتا ہوں، جو اندھوں کو بینائی اور کوڑھیوں کو شفا دیتا تھا۔ تو اُس کے طفیل مجھے بھی تھوڑی سی مسیحائی عطا کر اور سعادت دے کہ یہ میرے ہاتھ مجھ سے بھی زیادہ شکستہ لوگوں کے کام آئیں۔ اور مجھے توفیق دے کہ آخری دم تک میں اِس تنہا روشنی کو تھامے رہُوں اور زندگی میں مجھے تسکین عطا کر۔ آمین!

یہاں اُس کے آنے پر مسرّت کا اِظہار کیا گیا۔ مریضوں کو اچھے ہونے کی آس بندھی۔ بڑے پادری نے اِطمینان کی سانس لی کہ جس مقصد سے اُس نے ہسپتال کھولا تھا اُس میں وہ کامیاب ہُوا۔ فزیشن ڈاکٹروں کے علاوہ اس ہسپتال کو ایک ماہر سرجن بھی نصیب ہُوا۔ ہسپتال والے اس کے

آنے کی خوشی میں ایک چھوٹا سا جشن منعقد کرنا چاہتے تھے۔ اور اُن کی زندگیوں میں کیا تھا۔ بس یہ ذرا ذرا سے کرسمس، ایسٹر، سالگرہیں اور استقبالیہ ہنگامے، جو انھیں زندہ رکھتے تھے۔ مگر اُس نے اُن کی یہ تجویز ردّ کر دی اور راہبوں اور راہباؤں کو یہ شخص کچھ ٹھکانے کا نہ لگا۔ وہ اِسے خشک اور سخت مزاج سمجھے۔ اور اُسی وقت سے اُن کا دل اِس سے میلا ہو گیا۔

"اِس کا تو مزاج ہی نرالا ہے" میس کے انچارج برادر نے سوچا۔

اِس کو ہسپتال کی حالت دیکھ کر نہ اطمینان ہُوا اور نہ مسرّت۔ وہ ناک چڑھائے رہا۔ بے اطمینان نظریں اِدھر اُدھر دَوڑاتا رہا۔ ہر چیز کی بال کی کھال نکالتا اور تنقید کرتا رہا۔ پھر اُس نے سب کو یکجا کیا اور اُن کی اظہارِ خوشنودی کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے انھیں لیکچر پلانے لگا۔ اُس نے کہا۔

"میں اِس ہسپتال کی حالت سے قطعی مطمئن نہیں ہُوں۔ مجھے تُمھاری دوستی نہیں، کام چاہیے۔ جس کے لیے تمھیں اپنے کندھے مضبوط کرنے پڑیں گے۔ تم کو یہ معلوم ہے کہ تُم یہاں کیوں ہو اور مجھے بھی معلوم ہے کہ میں یہاں اِس وقت کیوں موجود ہُوں۔ یہ بتانا محض وقت ضائع کرنا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ دوا ایک تدبیر اور چارہ ہے اور جس کی یہاں خاصی قلت ہے۔ مثال کے طور پہ اِس ہسپتال میں اب تک سلفون کے انجکشن نہیں ہیں۔ صرف گولیاں ہیں۔

"دُوسری چیز جو دُنیا کے ہر مریض کو درکار ہوتی ہے، وہ توجّہ اور دلداری ہے اور اِس کی بھی میں یہاں شدید کمی پا رہا ہُوں۔ تُم خُدا رسیدہ لوگ ہو۔ تُم نے انجیلِ مقدّس میں پڑھا ہوگا کہ خُدا ضعیف لوگوں سے محبّت کا حُکم دیتا ہے اور ہر حال میں محبّت کو پسند فرماتا ہے۔ وہ برتاؤ تُمھیں معلوم ہوگا جو عیسٰیؑ کوڑھیوں سے کرتے تھے۔ مُجھ سے زیادہ تُم عیسٰیؑ کی انجیل کے عالم ہو۔ اُس کے مُتعلّق تمھیں بتانا بے کار ہے۔ البتہ یاد دہانی اور اُس پر عمل کرانا میں نے اپنے ذمّے لیا ہے۔ مریض زمین پر پڑے ہیں اور تُم پلنگوں پر آرام فرماتے ہو جبکہ تُم سے زیادہ اُنھیں آرام کی ضرُورت ہے کیونکہ وہ بیمار ہیں اور اُن کے کمزور جسم ایسی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے۔ تُم تندرست ہو، سختی جھیل سکتے ہو۔"

"اگر میں نے تُم میں سے کسی کو کبھی اِن سے بدسلُوکی سے پیش آتے دیکھا تو یقین کرو وہ دِن اُس شخص کا یعنی بدسلُوکی کرنے والے کا تاریک ترین دن ہوگا۔ مجھے اُمّید ہے کہ میرا کوئی مریض اِس نوبت کو نہ پہنچے گا کہ خودکشی کرے۔ کوڑھی عام طور پہ زندگی سے عاجز ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ مگر احتیاط رکھی جائے گی۔ مجھے توقّع ہے کہ تمھیں میرے اِتنے کہے کا دھیان رہے گا اور استقبالیہ جشن مُنعقد کرنے، اِن میں پیسہ اور وقت ضائع کرنے کے بجائے تُم ہسپتال کی صفائی، مریضوں کی دیکھ بھال اور کام کی طرف توجّہ کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اِن کے مُعاملے میں بہت احتیاط سے کام لو گے اور مجھے سختی پہ آمادہ نہ کرو گے۔ تُم سب

پڑھے لکھے، سمجھ دار اور خدا رسیدہ لوگ ہو۔ اِس لیے بچوں کی طرح تمھیں بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سو گئے تھے، میں تمھیں جگاتا ہوں۔ تم بھول گئے تھے میں تمھیں یاد دلاتا ہوں۔"

اُنھوں نے فنڈ کی کمی کا دُکھڑا رونا چاہا۔ اپنی مشکلات بیان کرنی چاہیں مگر اس نے بڑے سکون سے مُسکرا کے بات کاٹ دی اور کہنے لگا۔ "وقت ضائع مت کرو۔ خلوصِ نیت رکھنے والوں اور کام کرنے والوں کے لیے پہاڑ سرک جاتے ہیں اور چٹانیں موم ہو جاتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر آ گیا، اُنھیں بڑبڑانے اور غُصّہ کرنے کو چھوڑ کے۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ یہ باتیں اُنھیں ناگوار لگی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ وہ انھیں عقل نہیں سکھا رہا ہے۔ "یہ خُوب سمجھتے ہیں۔ بہت گھاگ ہیں۔ یہ تو میں نے اُنھیں تنبیہ کی ہے اور اُس سلوک کی طرف اِشارہ کیا ہے جو میں اُن کی بڑھتی ہوئی غفلت اور مریضوں سے بدسلوکی پر کروں گا۔"

پھر وہ اُن کی طرف سے بے پروا ہو کر یکسُوئی سے ہسپتال کی فلاح و بہبُود میں لگ گیا۔

فادر ہنری سے اُس نے سخت الفاظ میں کہا کہ وہ ہسپتال کی صفائی اور مزید جراثیم کُش ادویہ منگوانے کا اِنتظام کرے۔ بچارا فادر ہنری جو خاصا بھاری ہو گیا تھا، ایک دم کام کی زیادتی سے ہانپا جا رہا تھا۔

آج کا دِن خاصا سراسیمگی کا تھا۔ اُس دن سب کو کچھ ایسا محسوس ہُوا کہ

اب اتواریں بھی ہمیشہ ناس ہُوا کریں گی۔ کیونکہ آج وہ حساب کی جانچ پڑتال پہ لگا ہُوا تھا۔ ڈھیروں روپیہ نجانے کہاں سے اُس نے برامد کیا اور بقیہ پیسے کی خُرد بُرد پہ اُس نے حساب رکھنے والے فادر کو اچھی طرح شرمسار کیا۔ اور برادر وُڈ کو چالیس پلنگوں کی فراہمی کا مُختصر نوٹس دیا۔

اور جب شام تک پلنگ وارڈ میں بچھ گئے اور مریضوں کو اُس نے اپنی آنکھوں سے لیٹا دیکھ کے تسلی کر لی تو اُسے ذرا اطمینان ہُوا اور وہ دُوسرے دن کے پہلے آپریشن کی تیاری میں لگ گیا۔

اور آج کی صُبح وہ اِطمینان سے مُسکراتا ہُوا وارڈ میں گھُوم رہا تھا۔ وہ فرخندہ سے مُخاطب تھا۔ "کل تُمھارا آپریشن ہے۔"

"سلام فادر صاحب۔" فرخندہ نے ہمک کے اُسے سلام کیا۔

وہ ہنسا اور کہنے لگا: "میں تمھیں فادر نظر آتا ہوں؟ فادر ایسے کپڑے پہنتے ہیں؟ میں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹر ہمفری۔"

وہ کہنے لگی: "فادر صاب، ہم سے یہ تُمھارا نام نکلنے نہیں سکے گا۔ پھر ہم کو فادر بُلانے کی عادت ہے۔ ہم کیسے بولنے سکے گا۔"

وہ پھر ہنسا اور کہنے لگا: "اچھا، جو جی چاہے کہو۔"

تب فرخندہ نے اُسے آرام سے ہنستے اور شفقت سے بات کرتے دیکھ کے کہا۔ "فادر صاحب، ہم آپ سے بات کرنا مانگتا ہے۔"

"ہاں، ضرور کرو۔ کیا بات ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"فادر صاحب، ہم سسٹر روتھ کی شکایت کرنا چاہتا ہیں۔ یہ ہم لوگ کو

جب میں سسٹر روتھ کی شکایت کر سکی۔ اب مزہ آئے گا سسٹر روتھ کو بہت چھڑکتی ہے۔" اور یہ کہہ کر فرخندہ نے سوچا "آخر وہ دن آ ہی گیا
اُس نے غور سے سُنا اور کہنے لگا "یہ بات ہے! اچھا اب یہ نہیں چھڑکے گی۔ میں اسے دیکھوں گا۔"
اور وہ یُوں بغیر راہب بنے فادر کہلانے لگا۔ باہر نکل کے اُس نے سوچا "ساری عمر مجھے پادریوں سے نفرت رہی اور خود ہی پادری کہلانے لگا۔ اچھا۔"
دوپہر کو مریضوں کا کھانا دیکھ کے اُس کا غصے سے مُنہ سُرخ ہو گیا۔ اُس نے بیرے پیٹنے اور مریضوں کے کھانے کے ذمّہ دار فادر پر خوب غصے ہُوا۔
اُس نے جزبز ہو کر کہا "فادر رچرڈ، مہربانی سے مریضوں کی بہتری پر توجّہ کرو اور بے تحاشا عبادت میں وقت ضائع نہ کرو۔"
بڑی جلدی ہسپتال کی دُنیا بدل گئی تھی۔ اب مریض آرام سے صاف سُتھرے بستروں پر لیٹے تھے اور انھیں بادلوں میں سے سُنہری روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی جس کی گرمی حیات بخش تھی۔
راہب اور راہبائیں یک لخت ہنستے ہنستے چُپ ہو گئے تھے۔ ہسپتال پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور ہر شخص بہت مصروف ہو گیا تھا۔ وہ سب اُس سے ناخوش و بیزار تھے۔ وہ اُن کے لیے ایک دھمکی تھا۔ اُس نے اُن کی خوشیاں چھین لی تھیں۔

"شاید یہ ہماری زندگیاں بھی مریضوں کو دے دینا چاہتا ہے۔" سسٹر روتھ نے سوچا اور سرنج احتیاط سے اُبالنے لگی۔
یہ سرنجیں بھی حال ہی میں زیادہ اُبلنے لگی تھیں ورنہ اکثر ایسے ہی بھونک دی جاتی تھیں۔
"اُس نے آ کے جھنجھٹ بہت بڑھا دیے۔" روتھ نے پھر سوچا اور مُنہ لٹکا کے انجکشن بھرنے لگی۔
تب فرخندہ نے بڑے فخر سے شامو سے کہا۔ "میں نہ کہتی تھی، بھالو آدمی آئے گا۔ کوئی کوئی ہر مذہب میں بھالو ہوتا ہے۔ خُدا صاب نے بھیجا اور کہا، بیٹا جاؤ بیمار کا حال چال دیکھو۔ اب سسٹر روتھ ایک دم چالو ہو گی۔"
شامو اُس کی جسارت پر حیرت کر رہی تھی۔ "یہ فرخندہ خُوب ہے" اُس نے سوچا۔
راہب اور راہباؤں کے کام کے اوقات میں مُنہ لٹکے رہتے مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔ اب بھی ایک دُوسرے کو چھیڑتے اور اندھیری گیلریوں اور کوریڈاروں میں چُہلیں کرتے۔ جواں سال، زندہ دِل راہب رات کو راہباؤں کی جائے رہائش کی طرف اُسی طرح رُخ کرتے۔ اُسے خُوب معلوم تھا مگر کام کے بعد وہ اُن کی کسی عیاشی سے سروکار نہ رکھتا۔
اُس نے مریضوں کو شب بخیر کہا، فرخندہ کی خیریت دریافت کی،

ڈینیل کا کمبل ٹھیک کیا اور شفقت سے اُن کی طرف دیکھ کے مُسکرایا۔ پھر جاتے جاتے پلٹا، کھڑکی کو اچھی طرح دیکھا کہ بند ہے۔ نیا دبیز کھدّر کا سُرمئی پردہ برابر کیا تاکہ کھڑکی کے سامنے پلنگ پر لیٹے ہُوئے تھمسو کو ہوا نہ لگے۔

"اِس مرض میں نمونیا جلدی ہو جاتا ہے۔ ہوا کی احتیاط رکھنا چاہیے" اُس نے رات کی ڈیوٹی والی سسٹر کو آگاہ کیا اور مُسکرا کے اُس کے ہاتھ سے اُون اور سلائیاں لے لیں۔

"یہ تم صبح بُننا دِن میں تمھیں فُرصت ہو گی۔ صبح جاتے وقت فرانسس تمھیں دے دے گا۔ شب بخیر۔"

وہ مُسکرایا اور چل دیا۔

ہسپتال کے اُجڑے ہُوئے باغ پر بہار آئی ہُوئی تھی۔ خود رو گھاس اور بے ضرورت درخت کٹوا کر کھدوا دیے گئے تھے۔ اِس طرح جو رقم ملی اُس میں سے کُچھ کے پُھولوں اور سبزیوں کے بیج منگوائے گئے تاکہ مریض تازہ سبزیاں کھائیں اور باہر سے سبزیاں آنے کا خرچ بند ہو اور باقی ہسپتال کے فنڈ میں جمع کر دی گئی۔ بچت کی یہ رقم فی الحال بہت تھوڑی تھی۔ پھر بھی بُری نہ تھی کیونکہ اِس مد میں ایسا کبھی ہُوا ہی نہ تھا۔ ہر وارڈ کی کھڑکی پر پیالہ نُما گُلدانوں میں پُھول سجے تھے۔ کھانے اور نشست کے کمروں میں اور خود اُس کے کمرے میں بھی پُھول کِھلے تھے۔ اُنھیں دیکھ کے وہ مُسکرایا۔

"یہ فرانسس اچھے پُھول سجاتا ہے بالکل احمد کی طرح۔"

وہ مُسکراتا ہُوا عورتوں کے وارڈ کی طرف بڑھ گیا۔

"سلام فادر صاحب" چمک کے فرخندہ نے سلام کیا۔ اُس کے آپریشن کو کئی دن ہو گئے تھے اور آج اُس کی پٹیاں کُھل رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ یہ اِس کا پہلا آپریشن تھا اور کامیاب رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑا پٹیاں کُھلواتا رہا۔

"فادر صاب، ہماری چُھٹی؟" فرخندہ نے پُوچھا۔

"بس دو چار دن میں ہو جائے گی۔ تُم اب اچھّی ہو۔ تُمھیں اب کوئی شکایت تو نہیں؟ سِسٹر تو نہیں ستاتی؟" اُس نے خُوش دلی سے پُوچھا۔

"نہیں فادر صاب، خُدا صاب تُم کو اچھّا رکھے۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا تُمھارے آنے سے۔" فرخندہ نے کہا۔

مگر سِسٹر روتھ پر آج سختی کا دِن تھا۔ وہ مردانہ وارڈ میں اِسلام کو جھڑک رہی تھی۔

"بڑے نخرے کرتے ہو۔ کل سے تُمھیں پانی بھی نہیں ملے گا۔ بس جو پکے گا وُہی کھاؤ گے۔"

وہ ایک مریضہ کی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اُس نے جھٹ سے رپورٹ سِسٹر کے ہاتھ میں دی اور سِسٹر روتھ کے چیخنے کی آواز سُن کر مردانہ وارڈ میں گُھس گیا۔ "یہ تُمھیں کس نے حق دیا ہے کہ تُم اِن سے اِتنی دُرشتی سے پیش آؤ۔" اُس نے سِسٹر روتھ سے پُوچھا۔

سِسٹر نے افسوس سے اُسے دیکھا اور کہنے لگی:۔

"ڈاکٹر ہمفری، تُم یہ بھی تو غور کرو کہ خود اِن کی قوم والے ان کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ کبھی کسی نے اِس ہسپتال کو چندہ دینے کی تکلیف کی یا اس سے دِلچسپی کا اِظہار کیا؟ ہم باہر کے آ کر اِتنا کُچھ اِن کے لیے کرتے ہیں، یہ پھر بھی شور کرتے ہیں۔ یہ اسی سلوک کے مستحق ہیں۔"

اِس پر وہ کہنے لگا: "ہمیں اِن کی قوم سے کیا مطلب۔ یہ ہسپتال

مِشن نے اپنی خوشی سے کھولا ہے۔ اُنھوں نے تو نہیں کہا تھا کہ کھولو۔ اگر وہ بے حِس ہیں تو ہم سے کیا مطلب۔ تُم لوگوں نے نیکی اور خُدا کی خوشنُودی کی خاطر یہ ہسپتال قائم کیا ہے ورنہ جیسے یہ سڑ رہے تھے اِنھیں سڑنے دیا ہوتا۔ یہ اب کسی کے نہیں ہے۔ نہ یہ کسی قوم سے تعلّق رکھتے ہیں، نہ کسی مُلک سے۔ یہ صرف کوڑھی ہیں، لاچار ہیں۔ ہم اِن کے ہیں اور یہ ہمارے ہیں۔ تُم مُجھے زیادہ سمجھانے اور تستعلیق بننے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ تُمھارے حق میں اچھّا نہ ہوگا۔ جاؤ اور کُچھ اَور اِس کے لیے کھانے کو بھیجو۔"

سِسٹر روتھ نے باورچی خانے میں آدمی بھیج کر کھانا تو منگایا لیکن اُس کی بات سے اِتّفاق نہ کیا۔ وہ بڑبڑانے لگی "یہ اچھّی منطق ہے۔ اچھا ڈاکٹر آیا ہے جو ہمیں ہر وقت اِن کے سامنے ڈانٹتا ہے۔"

ایڈورڈ نے اِسلام سے پُوچھا۔ "کیا بات تھی؟"

وہ شکایت کرنے لگا "صاب، بہت تھوڑا کھانا ملتا ہے۔ مچھلی کبھی نہیں ملتا۔ کیسے کھانے سکے گا؟ کیسے زندہ رہنے سکے گا؟"

ایڈورڈ نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا: "فِکر مت کرو۔ کل سے کھانا ٹھیک ملے گا۔ دراصل یہ میری غلطی ہے۔ مُجھے تُمھارے باورچی خانے کے فادر سے پُوچھنا تھا اور خود دیکھنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب ٹھیک ہو جائے گا۔ رنج مت کیا کرو۔ رنج سے بیماری بڑھتی ہے۔"

وہ مُسکرایا اور چل دیا۔

تب اِسلام نے اپنے پاس والے مریض سے کہا۔ "چاچا اِتنے تمام فادروں میں صرف اِس کے، جو پادری نہیں ہے، سینے میں ایک اچھا اور صاف دِل ہے۔ بات یہ ہے چاچا ہر زمانے اور ہر قوم میں سراجُ الدّولہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا دادا کہتا تھا بنگال میں بس ایک سراجُ الدّولہ تھا اور وہ ختم ہو گیا۔ اب کوئی سراجُ الدّولہ پیدا نہ ہوگا۔ بنگالیوں سے محبت کرنے کو میرا دادا ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ اصل میں چاچا بنگال میں بہت دُکھ ہے۔ انگریزوں نے آکر ہم پر بہت ظُلم توڑا۔ مگر انھی انگریزوں میں سراجُ الدّولہ پیدا ہُوا۔"

چاچا کی سمجھ میں اِسلام کی بات خاک نہ آئی۔ وہ اپنی لمبوتری ڈاڑھی کھُجاتا اور سر ہلاتا رہا اور محض یہ محسوس کرتا رہا کہ یہ ڈاکٹر بہت اچھا ہے اور کوئی سراجُ الدّولہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس نے کوئی سراجُ الدّولہ کاہے کو دیکھا تھا۔ اِسلام ہر بات میں کوئی نکتہ نکال لیتا ہے۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے دو خط لکھے۔ ایک اپنی ماں کو۔ ماں کے خط میں اُس نے مشن کا پتا لکھا اور یہ کہ وہ ڈھاکے میں ڈاکٹر ہے۔ اس نے اُن کی پریشانی کا خیال کر کے یہ نہیں لکھا کہ وہ یہاں کوڑھیوں کے ہسپتال میں ہے۔ اُس کے خطوط برادر شرمن پتا کاٹ کر ڈاک کے ذریعے بھیج دیا کرتا تھا۔ اُس نے پیٹر اور اس کے بیوی بچّے کی خیریت تفصیلی طور پر دریافت کی اور یہ کہ پیٹر کا بچہ کس کی صُورت پر گیا ہے؟ اُس کی بیوی کیسی ہے؟ اور یہ کہ میں خوش اور تندرُست ہُوں۔

وہ دُوسرا خط لکھنے بیٹھا تو پہلے قلم میں تازہ روشنائی بھری، لمبی لمبی سانسیں لیں، فرانسس سے ایک پیالی چائے کی فرمائش کی، ذرا سا رُکا اور تھم کر اُس نے سوچا "کہنے کو ایسا ہی محسُوس ہوتا ہے کہ محبّت بہت آسان چیز ہے مگر ایسا نہ تھا۔ میں مُشکلوں میں پھنس گیا اور مُنہ کے بل گرا۔"

پھر اُس نے لکھا۔ "اُمید ہے تُم بخیر ہو گی۔ اور میرا یہ ہے کہ میں یہاں بہت مصرُوف ہُوں۔ میرے حق میں دُعا کرتی رہا کرو کہ میں اِن کے کام آسکوں اور یہ کہ تمھاری یاد سے نجات پا جاؤں۔ تُم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تُمھارے پاس اِس کی کوئی سبیل ہے؟ یہاں چاروں طرف اِتنا دُکھ ہے کہ باقی ہر دُکھ سُکڑ کے رہ جاتا ہے۔ مگر دُکھ کے اِس انبار میں بھی مجُھے دُکھ کی کسک محسُوس ہوتی ہے۔ اور وقت اسے تیز تر کرتا جاتا ہے۔ مجُھے یہاں آکے خوشی ہُوئی۔ ایسا محسُوس ہُوا کہ انھیں میری ضرُورت تھی اور شاید یہ میرے مُنتظر تھے۔ اور سچ پُوچھو تو یہ دُکھ مجھے عزیز ہے۔ ایک چیز میری زندگی نے کھوئی تو مجھے اور بہت کچھ مِل گیا۔ تُمھیں کیا معلوم کہ اُن کے ساتھ رہ کے، اُن کے کام آکے مجُھے کتنی تسکین ہوتی ہے۔ شاید دُکھ سے میرا رِشتہ پُرانا ہے۔

تُمھارا ایڈورڈ

دہاں کبھی احمد تھا اور یہاں فرانسس۔

جوزف کی موت کے بعد فرانسس کا دل دُنیا سے کچھ اُچاٹ ہوگیا تھا۔ مگر پھر ایڈورڈ کی شکل میں اُسے ایک دِل چسپی مل گئی۔ اُسے نئے ڈاکٹر صاحب بہت پسند آئے تھے۔ گو کہ وہ راہبوں کے اِزدحام میں کوٹ پتلون پہنے عجیب سے لگتے۔ اُس نے سوچا تھا، شاید یہ اِسی لیے دُوسرے فادروں سے مُختلف ہیں۔ نہ وہ فادروں کی طرح نوکروں پر خفا ہوتے نہ گھڑی گھڑی پکارتے نہ کھانے کی میز پر قہقہے لگاتے اور نہ راہباؤں سے ہنسی مذاق کرتے۔

اُن کا تو یہ تھا کہ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے کہہ رہے تھے "فرانسس، ایک پیالی چائے۔"

وہ ہمیشہ اِسی طرح سے کہتے۔ وہ ذاتی کاموں میں کاہل تھے۔ اب فرانسس کو کیا معلوم کہ ان کے بچپن کے نوکروں نے ان کی عادتیں خراب کر دی تھیں۔

اُنھوں نے یہ بھی کہا "تُم میری گھڑی میں چابی دینا بھول جاتے ہو۔ آج جاتے وقت دے دینا۔" یہ کہہ کر وہ ہنستے اور پھر جھینپ کے کہنے

لگے: "میں ذرا کاہل ہوں ایسے کاموں میں۔" اور یُوں جھینپتے ہُوئے وہ بڑے اچھے لگے۔

فرانسس بھی انھیں فادر صاحب ہی کہتا تھا کیونکہ فادر کا لفظ ان سب کی زبان پر چڑھا ہُوا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "ابھی لایا فادر صاحب۔"

اور جب فرانسس چائے کی پیالی لایا تو اُس نے کہا "تم بھی بیٹھ جاؤ سٹُول پر، فرانسس۔"

تب فرانسس نے کہا۔ "فادر صاحب ہمیں آپ کے آنے کی بشارت خوابوں میں دی گئی تھی۔ میرا دل بولتا تھا کہ ایک دن آپ آ گئے۔ اگر جوزف ہوتا تو آپ کو بتاتا۔"

اُس نے پُوچھا۔ "جوزف کون تھا؟"

"جوزف میرا دوست تھا فادر صاحب۔ اُسے بھی خُدا باپ نے تُمھارے آنے کی بشارت دی تھی۔"

وہ کہنے لگا۔ "یہ تم خُدا باپ کیوں کہتے ہو؟ نہ وہ خُدا کا بیٹا تھا اور نہ خُدا اُس کا باپ ہے۔ وہ مُعالج و مسیحا تھا۔ پیغمبر تھا۔ اِس طرح کہنا خُدا پر عیب دھرنا ہے۔"

فرانسس کہنے لگا "فادر صاحب، ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی دِل یہی بولتا ہے۔ پر گرجا کا بڑا پادری جو یہ کہتا ہے۔"

"اُس کی بات نہ کیا کرو۔ وہ بے وقُوف ہے۔"

فرانسس نے حیرت سے اُسے دیکھا اور سوچنے لگا۔ "یہ ٹھیک ہی

یقین کروں گا جو یہ کہے گا۔ کیونکہ مجھے اِس کی بشارت
کہتا ہے۔ میں وہی
دی گئی تھی۔"
اور ایڈورڈ سوچ رہا تھا "یہ کس قدر ضعیف الاعتقاد قوم ہے۔
میری بشارت دی گئی تھی۔ گویا میں نہ ہُوا کوئی بزرگ ہوگیا۔ یہ محض اِن
کے بے سہارا پن کا ثبوت ہے۔ یہ تصورات کی دُنیا قائم کرکے جیتے ہوں
گے اور یُوں انھیں خواب نظر آتے ہوں گے۔
اُس کا دل بہت دُکھا اور وہ کہنے لگا "ایسی باتیں مت کیا کرو۔ کوئی
بشارت وشارت نہیں۔ یہ بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ اب جاؤ اور سو جاؤ۔
تُم بہت کام کرتے ہو۔"
اِس پر فرانسس کہنے لگا: "مگر فادر اوڈ تو ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ تُم سا
کوئی کاہل نہیں۔"
ایڈورڈ نے کہا "وہ خود بہت کاہل ہے نا۔" یہ کہہ کر وہ کپڑے بدلنے
غسل خانے میں گھس گیا۔
فرانسس کو اِس کے متعلق افواہیں اُڑانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔
— پیالی رکھتے ہُوئے اُس نے خانساماں سے، جو اپنے کوارٹر میں
جانے کی تیاری کر رہا تھا، کہا "ڈاکٹر فادر صاحب کو ہمارے خُدا باپ،
میرا مطلب ہے خود عیسیٰؑ مسیح نے بشارت دی کہ تم بنگال جاؤ اور
کنواری مریم نے پیر ول کا سایہ کیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے
ان کی کھڑکی پر سایہ دیکھا۔ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔"

اُس نے اپنا سفید ڈریسنگ گاؤن پہنا اور کچھ دیر بیٹھا اُسے دیکھتا رہا
پھر اُتار کے اُوپر ڈال لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر جھڑی لگی
تھی۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کے، براؤن کے یہاں
کے، منظر آتے جاتے رہے۔
"ہُوں" اُس نے کہا اور بے حد نیلی آنکھیں اندھیرے میں جھپکتا رہا
حتّٰی کہ بیداری اُس سے تھک گئی اور یُوں وہ سو گیا۔
سویرے، اخبار آنے سے پہلے ہی فرانسس اُس کے لیے چائے
لے آتا اور اِس وقت وہ اکثر حافظ کا ترجمہ پڑھتا ہوتا۔
اُس نے چائے کی چُسکی بھری اور دھیرے سے یہ اشعار تھم تھم کے
پڑھے۔ اور پھر دل ہی دل میں اُن سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔
"دُنیا کی تمام خوشیاں اُس ایک لمحے پر نثار جس میں کوئی سر درد و الم
سے جُھٹک جاتا ہے۔"
اُس نے لمبی سی سانس لی، چائے کی دُوسری پیالی بنائی اور سوچنے لگا۔
"بھلا جب دل ٹُوٹتا ہے تو اُس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ کیا اُسے کوئی
بیان کر سکتا ہے؟ خزاں رسیدہ پتّی کی طرح چُرمُر اور مُرجھایا ہُوا دِل۔
اور کون کہتا ہے کہ دِل کے زخم اچھے ہو جاتے ہیں۔ کھرنڈ آ جاتا ہے۔
جب کھرنڈ اُکھڑ جاتا ہے تو گڑھا پڑا رہ جاتا ہے اور جب دِل میں
ایسے گڑھے پڑ چکے ہوں تو وہ صحیح وسالم تو نہ ہُوا۔
فرانسس نے اُسے اخبار لا کر دیا۔ پڑھتے پڑھتے یک لخت اُس نے

جھنجھلا کے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور اپنے خزاں کی پتّی کے ایسے دل

میں کہنے لگا۔

"مہربانی تم مجھے یاد آتی ہو اور آتی چلی جاتی ہو۔ اور اب تو مجھے اِس کی عادت ہو گئی ہے۔ سوتے جاگتے ہر جگہ تم ہی ہو لیکن اگر تم سے نجات مل جائے تو مجھے یکسوئی حاصل ہو۔ مگر کہاں!..... کوشش تو کرتا ہوں۔"

اور اب وہ اسلام کو قرنیہ تھیرپی کرا رہا تھا۔ اُس نے اسلام کو ابھی تک سلفون کا انجکشن نہیں دیا تھا بلکہ گولیاں دے رہا تھا۔

اسلام اب کافی بہتر تھا اور وہ اُسے شاباش دے رہا تھا۔ "شاباش اسی طرح کیے جاؤ۔ ایک بار اور۔ بڑی جلدی تمھیں چھٹی مل جائے گی۔"

پھر وہ عورتوں کے وارڈ میں داخل ہُوا۔ اور جب وہ وارڈ سے نکل رہا تھا تو اُس نے سسٹر روتھ کے ڈانٹنے کی آواز سُنی۔ وہ لپکا ہُوا واپس مردانے وارڈ میں گیا۔ اِسلام کے دُودھ میں مکھی پڑی ہُوئی تھی اور سسٹر روتھ اُسے ڈانٹ رہی تھی کہ وہ اِسے نکال کے کیوں نہیں پی لیتا۔

وہ کہہ رہی تھی: "میں تمھارے سر پہ پیالی ماروں گی۔ پیو گے کہ نہیں۔ نہیں پیتے تو اور دُودھ نہیں ملے گا۔"

اُس نے یہ سُنا تو تیزی سے اُس کی طرف گیا۔ "تم بھڑک رہی ہو۔ مجھے تو خیال تھا عورتیں نرم دل ہوتی ہیں۔ پر تم کیسی عورت ہو۔ خبردار جو تم نے آیندہ کسی مریض کو جھڑکا۔ تمھیں اِن میں رہتے ہُوئے اذیّت کا

اندازہ نہیں۔ تم کو نہیں معلوم کہ اِن کی دُنیا جہنّم سے بدتر ہے۔ تم اور آگ دہکاتی ہو۔ یہ بات یاد رکھنا کہ میں اور تم سب یہیں مریں گے۔ اِنھیں دیکھ کے عبرت پکڑو۔ جاؤ اور دُوسرا دُودھ منگواؤ۔"

پھر وہ اِسلام کے پاس آیا اور کہنے لگا: "جب تک دُودھ آئے تم تھوڑی سی ورزش اور کر لو۔ شاباش! کوشش کرتے رہو۔ زندگی کو لڑ کر حاصل کرو۔ اس پر تُمھارا حق ہے۔"

پھر اُس نے اُس کی پیٹھ پہ تھپکی دی اور دُوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر پلٹ کر دیکھا۔ اسلام دُودھ پی رہا تھا۔

"اب ٹھیک ہے؟" اُس نے بنگالی میں کہا۔ اب وہ اچھی خاصی بنگالی بولنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے صاب" اِسلام نے خوش ہو کر کہا۔

وہ مُطمئن ہو کر سسٹر برہمن سے کہنے لگا کہ شمپا کے آپریشن کی تیاری کرو۔

اِسلام کو چھٹی ہو گئی اور شمپا صحت یاب ہو رہی تھی۔ فرانسس نے تمانساماں سے کہا "بے شک ہمارے فادر صاب کو عیسیٰ مسیح نے اپنی مسیحائی عطا کی۔ مریض نمبر ۱۱ اچھا ہو کر چلا گیا اور مریضہ نمبر ۱۹ اچھی ہو رہی ہے۔"

آج پھر آپریشن کا دن تھا۔ وارڈ کا آدمی بڑی بے دردی اور بے پروائی

سے مریض کی گاڑی دھکیل رہا تھا۔ گاڑی آپریشن تھیٹر کے دروازے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ایڈورڈ لپک کے آیا اور اُس آدمی کو جھنجھوڑا۔

"ایسے دھکا دیتے ہیں؟ خبردار، جو ایسے چلائی ہوگی۔ یہ انسان ہے اور بیمار ہے۔ کوڑا کرکٹ نہیں ہے۔ بیمار انسان کو شیشے کے برتن کی طرح اُٹھانا چاہیے۔ آیندہ میں نے تمھیں اس طرح گاڑی دھکیلتے دیکھا تو تمھاری پٹائی کروں گا۔ سمجھے؟" اُس نے گاڑی دوبارہ اُس سے چلوائی۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے۔ ہمیشہ اسی طرح چلانا۔"

پھر وہ تھیٹر کے اندر داخل ہُوا۔ جراحی کے کپڑے پہنے اور مریض کا مُعاینہ کرنے لگا۔ مریض کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اُس نے اُس کا کالر پکڑ لیا۔ وہ اور جھکا اور نرمی سے پُوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاب ہم زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ ہم اچھا ہونے نہیں سکے گا۔ ہم کو زہر کا گولی دے دیجیے۔"

اُس نے ایک ٹک غور سے دیکھا اور بڑی نرمی سے کہنے لگا۔ "ایسے مت کہو۔ خُدا سے اپنی صحت کی دُعا کرنا چاہیے۔ زندگی کو بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ زندگی ایک امانت ہے جو نعمت کے طور پر اُس نے تمھیں دی ہے۔ اِس کی حفاظت کی کوشش میرا اور سب سے بڑھ کر تُمھارا فرض ہے۔ تُم اچھے ہو اِس لیے ایسا سوچ رہے ہو۔ اگر تُم صحت پانے کے قابل نہ ہوتے تو ایسا نہ سوچتے۔ ایک ذرا سا میں تمھارا آپریشن کروں گا اور تُم اچھے ہو جاؤ گے۔ شاباش!"

پھر اُس نے سسٹر مارگرٹ کو اشارہ کیا۔ کہ وہ اُس کو بیہوشی کا انجکشن لگائے۔

مریض کہنے لگا "ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر صاب۔ آپ نے ہماری ہمت بڑھا دی۔ کوئی کوئی ڈاکٹر مریض سے بولتا ہے تُم اچھا ہونے نہیں سکے گا۔ اور اتنا تسلی مریض کو بھی (کبھی) نہیں دیتا جتنا آپ دیتے ہو۔ ہم اچھا ہونے سے تمھارے لیے اپنے باگن سے انارس (اناناس) لائے گا۔"

اِس پر وہ کہنے لگا "اچھا ذرا اپنے بوٹا کا انارس تو گنو۔"

اور گنتے گنتے وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور سسٹر مارگرٹ سوچنے لگی: "یہ کیسی نرمی اور شفقت سے مریضوں سے پیش آتا ہے۔ یہ انسان ہے۔"

وہ اُس کے احکام پر کٹھ پُتلی کی طرح چلنے لگی۔ یہ اُس کا سحر تھا۔ اس سے پہلے اُس نے اپنے آپ کو مریضوں سے اتنا منسلک نہ پایا تھا۔

تب اُس نے اپنے مریض پر جُھک کے سوچا:۔

"انسان جو پھُسپھُسا اور کمزور ہے، ایک خزاں رسیدہ پتّی کی طرح چُر مُر۔ اُسے ہر وقت ایک دلدار مُعالج چاہیے، جو اُس کی صحت کے لیے کوشاں ہو۔ جو اُس سے مُتعلق اور قریب ہو۔ انسان تو بہت بے سہارا ہے۔ اُس کا خوف و ہراس میں ڈولتا ہُوا دل اُمید اور سہارا ڈھونڈتا ہے اور ہم کو اِس کا احساس اُسی وقت ہوتا ہے جب ہم خود شکستہ اور بے سہارا ہوتے ہیں اور اپنے اُمید کے چراغ اپنے اندر گُل کر چکے ہوتے

ہیں۔ تم ہوتیں تو میں تمھیں دکھاتا کہ دُکھ کیا چیز ہے۔ اور اب تم ذرا دیر
کو میرے پاس سے ہٹ جاؤ کہ میں آپریشن کرتا ہوں مگر تم کہاں ہٹتی ہو۔
روز اسی طرح میں کام کرتا ہوں۔ تمھاری مجھے عادت جو ٹھہری"۔

وہ مطمئن باہر نکلا۔ اُس نے ایک بار پھر گاڑی چلانے والے کو آہستہ
چلانے کی تاکید کی اور مارگرٹ سے کہا کہ مریض ہوش میں آجائے تو اُسے
اطلاع کردے۔ وہ بے پروائی سے آپریشن کے کپڑوں میں گھوم رہا تھا
اور پسینے میں تر تھا۔ یہ موسم اُس کے لیے صبر آزما تھا مگر اسے موسم کا احساس نہ
تھا۔ تب مارگرٹ نے اُس سے کہا کہ وہ کپڑے بدل لے اور وہ فرانسس
کے پاس چائے کی درخواست لے کر جانے ہی والا تھا کہ مارگرٹ اُس کے
لیے چائے لے آئی۔

"شکریہ۔ تم نے بڑی تکلیف کی۔ فرانسس لے آتا"۔ اُس نے
بے دھیانی سے کہا اور چائے پینے لگا۔

پھر اُس نے مارگرٹ سے کہا "ذرا جاکے دیکھو اُسے ہوش آیا؟"

اور یہاں مریض نے کراہ کے کہا "ڈاکٹر صاب"۔

آرام سے لیٹے رہو۔ وہ ابھی آتے ہیں"۔ مارگرٹ نے اُسے تسلی
دی اور سوچنے لگی:۔

یہ جو راہب نہیں ہے۔ جو گرجے نہیں جاتا اور جسے جنت کا کوئی
دھیان نہیں، اس کے باوجود یہ ان تمام خدا رسیدہ راہبوں سے زیادہ
رحمدل ہے۔ لیکن جب اِسے ثواب و عذاب کا خیال نہیں، جنت کی

تمنا نہیں تو یہ کاہے کو اتنی دل سوزی اور دلداری کرتا ہے۔ باقی خدا رسیدہ
راہبوں کا تو یہ حال ہے کہ انھیں ہنگامے مچانے، راہباؤں سے عشق
لڑانے اور چھیڑ چھاڑ کرنے سے فرصت نہ تھی۔ مگر اس کے آنے سے
یہ سب بھی اب کام کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ اس مصروفیت سے وہ خوش
نہیں ہیں"۔ وہ راؤنڈ لے رہا تھا۔ اور وہ اُسے بڑی عزت اور پسندیدگی
سے دیکھ رہی تھی۔

وہ اُس مریض کے پاس گیا جس کا اُس نے آپریشن کیا تھا۔ اور اُس کی خیریت
دریافت کرنے لگا۔ پھر وہ گلٹیوں والے کوڑھی کی طرف گیا جس کے اعصاب
خراب ہو چکے تھے اور وہ اُس کی طرف سے متفکر تھا۔ اُس نے سسٹر روتھ
سے کہا کہ وہ اِسے سلفون کا انجکشن دے۔ اور خود مریض سے باتیں کرنے لگا۔

تم اِس وقت بہت اچھے لگ رہے ہو۔ تمھارے کھیتوں میں کیا پیدا
ہوتا ہے؟

وہ کہنے لگا "فادر صاب، بڑا بڑا تیج پوری انناس۔ ہمارا دھان کا بھی
کھیت ہے۔ ابھی بیمار ہونے سے ہمارا بھائی دیکھتا ہے۔ اچھا ہونے سے
ہم اپنے بگن (باغوں) سے آپ کے لیے انناس لائے گا"۔

"اچھا تم انناس کی فکر مت کرو۔ اچھے ہونے کی کوشش کرو اور انجکشن
لگواتے وقت اتنا شور نہ کیا کرو"۔

پھر اُس نے روتھ سے کہا کہ وہ اُسے اچھی طرح ڈھانپ دے۔ اس
مرض میں نمونیہ جلدی ہو جاتا ہے۔ روتھ بڑی لاپروا تھی۔ وہ اُس پر

بے دلی سے کمبل کھینچنے لگی۔

وہ جھلّایا اور کہنے لگا "پتا نہیں تم کیسی ہو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ بیمار ہیں۔ ایسا کرنے سے اِن کی تکلیف بڑھتی ہے۔ کیا اب مَیں تمھیں کمبل اوڑھانا بھی سکھاؤں؟ ذرا آہستہ سے اوڑھاؤ۔"

رات کو وہ بہت تھکا ہُوا تھا۔ سسٹر رودھ اور برادر گوڈی لابریائیو اور اُس کے سمجھانے اور تاکید کرنے کے باوجود اُن کی مریضوں کی طرف سے غفلت کی وجہ سے اُسے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔

"میں اِن کے سینوں میں شفیق اور نرم دل کہاں سے لاکر رکھوں۔" اور یہ تم ہو جو مجھے اُور ستاتی ہو۔ ہر وقت موجود رہتی ہو۔ اور اب تم مجھے سونے دو۔"

اور رات کو سوتے میں بھی وہ دلگیر رہا۔

"صبح بخیر، میری جان۔ آنکھ کھلی اور تم موجود۔ تمھاری یہی صفت ہے۔ مُصیبت ہو میری جان کو۔" وہ ہنسا اور شیو کرتے میں دھیرے دھیرے عُمر خیام کے یہ اشعار دُہراتا رہا۔

نیشاپور ہو یا بابل
جام مئے شیریں سے لبریز ہو یا مئے تلخ سے
صہبائے زندگی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی ہے
برگِ حیات ایک ایک کرکے گرتے رہتے ہیں۔

یہ حافظ و عُمر خیام کے مُترجم دیوان ڈاکٹری کی کتابوں کے علاوہ ہر جگہ اور ہمیشہ اُس کے ساتھ رہے۔ ولایت جب وہ پڑھنے گیا تھا جب بھی وہ اِنھیں ساتھ لے گیا تھا۔

"یہ زندگی کو سمجھتے تھے اور تسلی دیتے تھے۔ اِنھیں پڑھنے سے جی کو قرار آتا ہے۔" اُس نے بارہا سوچا تھا۔ اور یہ مشرق کے شاعروں کی عارفانہ اور صُوفیانہ فکر تھی جو اُس پر ہمیشہ حاوی رہی اور وہ اِس سے ہمیشہ مُتاثر رہا۔ شاید اِسی مٹی سے اُس کے پُتلے کی تشکیل کی گئی ہو۔

وہ یہ آخری لائن دُہراتا ہُوا کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

برگِ حیات ایک ایک کرکے گرتے رہتے ہیں۔

آج بھی آپریشن کا دِن تھا۔ وارڈ میں اس نے شمس الحق سے کہا "آج تمھارا آپریشن ہے" وہ کہنے لگا "صاب ہم اچھا ہوتے سکے گا۔ اچھا ہونے سے ہم آپ کے لیے اپنے باگن سے کٹھل اور ڈاب لائے گا۔ صاب، ہم آپ کا خدمت کرے گا"۔

وہ ہنسا اور کہنے لگا "تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔ شمس الحق، تمھارے کتنے بچے ہیں؟"

"صاب پانچ ٹھو (عدد) ابھی ہم بیمار ہے۔ ہم کو پیچھے باڑی اور بچّوں کی فکر ہے"۔

وہ کہنے لگا تم اچھا ہونے کے بعد ایک کام کرو۔ اب بچّے پیدا نہ کرو اور گھر جا کے اپنا بہت خیال کرنا۔ میں تمھیں دوائی دُوں گا۔ پانی میں کام کرنے سے اگر زخم ہو جائے تو اُس سے صاف کر لیا کرنا۔

ایک نظر اُس نے بیمار مردوں کو دیکھا اور پھر عورتوں کے وارڈ کی طرف مُڑ گیا۔ آج ایک حاملہ کو ڈھن داخل ہوئی تھی۔ وہ اُس کی ہسٹری لکھ رہا تھا۔ اُس نے اُسے غور سے دیکھا اور رنج سے محسوس کیا کہ وہ بہت کم عُمری میں اِس مرض میں مُبتلا ہو گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر اثر تھا، آنکھوں میں بے نوری پھیل رہی تھی اور وہ بہت لاغر ہو گئی تھی۔ اُس کا آپریشن ناممکن تھا۔ ایک لحظے کو اُس نے اپنا سر پکڑ لیا اور سوچنے لگا:...

"چارہ گر کیا کرے جب مریض اُس کے پاس اتنی دیر سے پہنچایا جائے۔ بہرحال کوشش کی جائے گی۔ دونوں نہیں تو ایک جان تو بچا ہی لی جائے گی"۔

عورت کا میاں باہر پھاٹک پر کھڑا تھا۔ وہ خود گیا اور اسے صُورتِ حال سمجھانے لگا۔ "اگر بچّہ زندہ پیدا ہُوا تو تمھیں دے دیا جائے گا تاکہ بیماری اُسے نہ لگے۔ یہ بڑی مُتعدّی بیماری ہے۔ لیکن یہ ورثے میں نہیں ملتی۔ ہم تمھیں اِطلاع کروا دیں گے یا تم آ کے معلوم کر لینا"۔

اُس کا میاں کہنے لگا: "صاب، ہم بہت گوریب ہے۔ روز روز آنے نہیں سکے گا ہم ڈھاکے سے باہر کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ پتا دے دے گا۔ ماجدہ اچھا ہوتے سکے گا صاب؟"

ایڈورڈ نے سوچا "میں اِسے کیا جواب دُوں؟"

"ہُوں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں کوشش کروں گا۔ اور تم دُعا کرو۔ بہرحال ہمیشہ اچھی اُمید رکھنا چاہیے۔ کاش تم اِسے پہلے لے آئے ہوتے!"

اِتنا کہہ کر وہ واپس جانے کو مُڑ گیا۔ اور رنج سے سوچنے لگا: "ایک گھر جو پہلے ہی غربت کی مُصیبت میں مُبتلا تھا، بیماری نے اُسے اور نادار کر دیا۔ تاریکی اور مزید تاریکی۔ کاش میری قوم نے سراج الدّولہ سے اِتنا سخت بدلہ نہ لیا ہوتا۔ کاش وہ کچھ نہ ہوتے، محض اِنسان ہوتے۔ میں شرمسار ہُوں۔ میری قوم نے بھیڑیوں کی قوم ہونے کا ثبوت دیا۔ اِنسان جب چاہتا ہے اپنے کو درندوں کی صف میں شامل کر لیتا ہے۔ میں

آج تک نفرت اور انتقام کی تھیوری کو وضاحت سے سمجھ نہ پایا۔ شاید
خدا مجھ سے اِن کی خدمت لے کر اُس ظلم کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں
ایک فرد ہوں۔ کتنا کروں گا۔ یہ پوری جماعت کا ظلم ہے۔ اے خدا تو
مجھے توفیق دے کہ میں صحیح طور پر خدمت کرتا رہوں۔
ماجدہ کے پاس آیا۔ رنج اور فکر سے اُس نے اُس کی طرف دیکھا۔
”کیسی ہو؟ تمھیں تو بخار بھی ہے۔“
وہ کہنے لگی: ”فادر صاب، ہم ایک بات پوچھتا ہے۔“
”ٹھیرو، پہلے میں تمھیں بستر سے بخار کی گولی دِلواؤں۔ پھر تمھاری
بات سنوں گا۔“
جب وہ گولی کھا چکی اور ایڈورڈ نے اُسے اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا
تو اُس سے پوچھنے لگا: ”ہاں، اب بتاؤ، کیا بات ہے؟“
وہ بولی ”صاب، ہم یہ پوچھتا کہ ہمارے بچے کا کیا بنے گا؟“ اُس کی
آنکھیں ایڈورڈ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اُن میں پریشانی اور بے چینی
تھی۔
وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”میں اِسے کیا جواب دوں؟ اے خدا تو مجھ سے
کیسے کیسے سخت کام لے رہا ہے۔ تُو نے مجھے جرّاح کا دِل بھی دیا ہوتا۔
پھر میرے آگے کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔“
وہ کہنے لگا۔ ”ماجدہ تمھارا بچہ صحیح سلامت پیدا ہوگا۔ اچھا رہے گا۔
تم فکر نہ کرو۔ یہ فکر میری ہے۔“

ماجدہ کے بیمار، زخم خوردہ چہرے پر خوشی کی لہر دیکھ کے اُسے بڑی
تکلیف ہوئی۔ اور وہ سوچنے لگا ”یہ سمجھ رہی ہے کہ بچہ اُس کے پاس رہے گا۔
اُسے یہ بتانا کہ بچہ اُس کے پاس سے چلا جائے گا کٹھن کام ہے۔ اب
اِس کے لیے اِسے تیار بھی کرنا پڑے گا۔ اور میرے سوا اِس کام کو کون کرے
گا۔ اِن میں سے اگر کسی سے کہوں کہ دھیرے دھیرے اِسے بتاؤ تو وہ اپنے
مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں بتا دیں گے۔ مشینوں کو دِلوں سے کیا واسطہ۔
یہ چُور چُور دِل ٹوٹ کے بکھر نہ جائے گا؟“
تب وہ کہنے لگا۔ ”ماجدہ، تم چاہتی ہو نا کہ تمھارا بچہ تندرست رہے؟“
”ہاں صاب، کون ماں نہ چاہے گی۔“ اُس نے خوش ہو کر کہا۔
”اچھا تو پھر کچھ دِن اِس کی دیکھ بھال ہم کریں گے۔ اب تم سو جاؤ۔
سفر سے تمھیں تھکن بھی ہو گئی ہے۔“ مگر ماجدہ نے پھر پوچھا۔ ”صاب، ہم
اچھا ہونے سکے گا؟ ڈھاکے کا ڈاکٹر بولتا تھا ہم اچھے ہونے نہیں سکتا۔“
اُس نے غصے سے کہا ”ڈھاکے کا ڈاکٹر گدھا ہے۔ بے رحم
ہے۔ تم اس کی بات پر دھیان نہ دو۔“ پھر جھنجھلا کے سوچنے لگا۔
”اپنے خیال میں اُس ڈاکٹر نے بڑا تیر مارا۔ موت سے جان کنی میں
ڈال دیا۔ پتا نہیں لوگ اِتنے سخت دل کیوں ہوتے ہیں۔ وہ یہ
کیوں نہیں سمجھتے کہ بیمار کا دِل بھی مریض ہوتا ہے۔ اُس میں صدمہ
سہارنے کی سکت نہیں ہوتی اور ذرا سی عارضی خوشی اُس کے
لیے بڑی چیز ہوتی ہے۔“

اُس کا خیال تھا کہ وہ ماجدہ کی فزیو تھریپی کرائے گا مگر اُسے تو
خاصا بُخار تھا۔
اُس نے چلتے چلتے کہا "ماجدہ، تھوڑے دِن کو بچہ الگ کر سکو گی؟"
"ہاں فادر صاب، کرنے سکے گا۔"

دِن بھر بہت حبس رہا تھا۔ اِس وقت بدلی جھوم کے آئی تھی۔
کھڑکی میں سے خوشگوار ہوا کا جھونکا اُس کے سیاہی مائل نرم بال ذرا سے
بے ترتیب کر گیا اور وہ اُس کی شوخی پر مُسکرایا۔ مگر پھر باہر کا دلکش منظر
دیکھ کے رنجیدہ ہُوا۔ "وہ سب جو پلنگوں پر سُرخ کمبلوں میں بیٹھے پڑے
سسک رہے ہیں۔ وہ جن کا یہ اپنا منظر ہے، اِس سے بے نیاز ہیں۔"
میز پر اُس کا خط رکھا تھا۔ اُس نے غور سے جانی پہچانی تحریر دیکھی۔
نیلی آنکھیں بڑی کسک سے جھپکیں اور وہ چند سطریں بڑی دیر تک پڑھتا
رہا۔ اُس نے لکھا تھا۔
"اب تک تو تُم بخیریت ہی ہو۔ خُدا کرے تُم اسی طرح خیریت سے
رہتے رہو۔ آخر کار تُمھیں بھی اپنی نجات کا ذریعہ مل ہی گیا۔ تُم بھی فُرصت
کے اوقات ہی میں میرا دھیان کرتے ہو گے۔ اور مصرُوفیت میں بھول جاتے
ہو گے۔ خط لکھتے رہو کیونکہ اِس سے پتا چلتا رہتا ہے کہ تُم ہو اور تندرُست
ہو۔" زُہرہ
خط پڑھ کے وہ مُسکرایا اور چُپکے سے کہنے لگا۔ "تو تُم اب بھی بدلہ
چُکانا بھُولی نہیں۔ مگر میں اب بھی یہی کہوں گا جو تُم سے کہہ کے آیا تھا۔ ہاں

مجھے بھی میری نجات کا ذریعہ مل گیا۔

پھر وہ فرانسس کے پاس گیا۔ "ایک پیالی چائے، فرانسس"۔

چائے پی کر وہ عورتوں کے وارڈ میں گیا اور ماجدہ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیسی طبیعت ہے، ماجدہ؟"

"ابھی بھالو صاب۔ سسٹر بولتا ابھی بخار نہیں۔ اچھا صاب، ٹھیک ہو جائے گا؟"

"ہاں ٹھیک ہو جائے گا ماجدہ"۔

"صاب، ہمارا بچہ بھی کوڑھی ہو گا؟" اُس نے پُوچھا۔

اُس کے اِس سوال پر وہ سنبھل کے بیٹھ گیا۔ باہر ڈھیروں شفاف موتی اُوپر سے نیچے بکھر رہے تھے اور اندر اُن کا ترنم غمناک سی فضا پیدا کر رہا تھا۔

تب اُس نے ماجدہ سے کہا۔ "دیکھو ماجدہ، خدا کسی کو کوڑھی نہیں پیدا کرتا۔ یہ دُنیا ہے جو کوڑھی کرتی ہے۔ آج تک کوئی بچہ کوڑھی نہیں پیدا ہُوا۔ لیکن اگر وہ تمھارے پاس رہے گا تو اُسے تمھاری بیماری لگ جائے گی۔ تم اچھی ہونے کے بعد اُسے اپنے پاس رکھنا۔ تمھاری ماں ہے؟"

"ہاں صاب۔ سب کوئی ہے۔ بون (بہن) بھی ہے"۔

"بس، پھر ٹھیک ہے۔ وہ اُس وقت تک اُسے رکھیں گی جب تک تم ہسپتال میں رہو گی۔ تمھاری ماں نے تمھیں پالا ہے۔ تم فکر نہ کرو

وہ اُسے بھی رکھ لے گی"۔

اِس پر ماجدہ نے پُوچھا "صاب، ہم اچھا ہو جائے گا"؟ وہ کہنے لگا، "تم بار بار کیوں پُوچھتی ہو۔ خدا سے اچھے ہونے کی دُعا کیا کرو"۔ اُس کے اچھے ہونے کی اُمید یُوں ہی سی تھی۔ مگر وہ ہمّت بندھاتا رہا۔

"یقین سے صحت کی اُمید دِلانا بھی علاج ہے۔ اور یہ بہت اہم ہے"۔ اُس نے اُٹھتے ہُوئے سوچا۔

وہ وارڈ سے نکل ہی رہا تھا کہ اُسے پیغام ملا کہ بڑے پادری صاحب یاد کرتے ہیں۔

ہسپتال سے الگ مگر اُسی کے احاطے میں بڑے پادری صاحب کا گھر تھا اور نزدیک ہی گرجا تھا۔ وہ بڑے پادری صاحب سے ذرا گھبراتا تھا۔ کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ بڑے پادری صاحب کے دِل پر اُن کے جسم کی طرح منوں چربی چڑھی ہُوئی ہے۔

بہرحال خوش و ناخوش وہ اُن کے بُلاوے پر چل دیا اور سوچنے لگا "یہ آج اُنھیں مُجھ سے ملنے کا کیا شوق چرایا۔ اُنھیں نہیں معلوم کہ میں اُن کی محبّت سے بہت گھبراتا ہُوں"۔

پادری صاحب اُسے دیکھ کے مُسکرائے اور حیران رہ گئے۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ دُبلا ہونے کے علاوہ اُس کے چند بال بھی سفید ہو گئے تھے۔

اُنھوں نے اُسے بیٹھنے کا اِشارہ کیا اور کہنے لگے "تم اپنا خیال نہیں رکھتے ہو۔ پیٹ سے کمزور نظر آ رہے ہو۔ مُجھے معلوم ہے تم بہت جانسوزی

سے کام کر رہے ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم خود کو بھول جاؤ۔"
پادری کی بات سُن کر اُس نے سوچا "خود کو تو مدت ہوا بھول گیا۔
خود ہُوں کہاں؟" پھر وہ جھنجھلایا۔ "یہ میرا وقت خراب کر رہا ہے۔ اسی
لیے اِس نے مجھے بُلایا تھا۔ یہ کس بات کی تمہید اُٹھا رہا ہے؟"
عُمر رسیدہ کیتھولک بشپ اُس سے باز پُرس کر رہا تھا مگر بڑے
نرم الفاظ میں، بڑی خُوش گُفتاری سے۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے تم سے گِلہ
ہے۔ تم گرجا بالکل نہیں آتے۔ نمازوں میں بھی شرکت نہیں کرتے۔
میں نے سُنا ہے کہ تم کھانے کے وقت کی دُعا میں بھی شریک نہیں ہوتے۔
کیا بات ہے؟"
وہ بہت جز بز ہُوا اور کہنے لگا۔ "میں یہاں عیسائیت کا پرچار کرنے
نہیں آیا ہُوں۔ اور نہ عبادت میں وقت ضائع کرنے۔ میں کام کرنے آیا
ہُوں۔ یہی میری عبادت ہے۔"
بوڑھے بشپ کا صبر و ضبط دیکھنے کے قابل تھا۔ اُس نے بڑے تحمل
سے سُنا اور کہنے لگا "یہ کافی نہیں ہے۔ مذہبی رُسوم بھی ضروری ہیں۔"
اِس پر وہ کہنے لگا: "نہ میں آپ کو سمجھا سکتا ہُوں اور نہ آپ سمجھ سکتے
ہیں۔ بہر حال، میرے اعمال کی پُرسش آپ سے نہیں ہو گی۔"
بشپ مُسکرایا اور کہنے لگا: "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ تم بُرا نہ مانو۔
ہدایت کرنا میرا فرض ہے۔"
وہ جھلا کے کہنے لگا: "ٹھیک ہے۔ آپ اپنا فرض ادا کیجیے میں اپنا

فرض ادا کرتا ہُوں۔"
بشپ کہنے لگا: "تُم عیسیٰؑ ابنِ مریم کے پَیرو ہو۔ خوش نصیب ہے
وہ شخص جو اُس کی بھیڑوں میں شامل ہُوا اور اُس کی رحمت کا حقدار ہُوا۔
ایڈورڈ نے اِس کا سخت بُرا مانا۔ اُس نے کہا۔ "میں عیسیٰؑ کی بھیڑ
نہیں ہُوں۔ میں انسان ہُوں۔ بھیڑیں سوچا نہیں کرتیں۔ وہ دُنیا کے لیے صحت
کا جام اور شفا کی خوش خبری لایا تھا۔ وہ مُعالجوں کا باپ تھا اور میں
اُس کی پَیروی کرنے کی کوشش کر رہا ہُوں۔
بشپ نے سُنا اور کہنے لگا: "مگر خُدا کے قہر سے ڈرو۔"
خُدا کے قہر پر وہ مُسکرایا۔ "میں خُدا سے اُس کے غُصّے اور قہر ہی
کی وجہ سے محبت کرتا ہُوں۔ اِس لیے کہ ہمیں پر اُس کی برتری کا احساس
ہوتا ہے۔ ورنہ تو انسان اپنے آگے کسی کی برتری مانا نہ کرتا۔ خُدا کے
رحم اور حِلم پر وہ کبھی شکر گزار نہ ہُوا بلکہ ہمیشہ اس سے اور کی فرمائش کی
اور کمی ہی کا گِلہ کرتا رہا۔ آپ میری فکر مت کیجیے۔ میں اُس کے اُن
بندوں کی خدمت کرنے کی کوشش کر رہا ہُوں جو اُسے عزیز تر ہیں۔
عبادت کا ایک یہ بھی طریقہ اُس نے سمجھایا ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔
بشپ نے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔ "مرضی ہے تمھاری۔ مگر میں
گاہے گاہے اپنا فرض ادا کرتا رہُوں گا۔"
"ضرور" ایڈورڈ نے کہا اور چل دیا۔
وہ ہسپتال میں داخل ہی ہُوا تھا کہ اُسے خبر ملی کہ گلٹیوں والے

جذام کے ایک مریض، ڈینیل نے، خودکشی کر لی - اُس کی ساری جان میں کوڑھ تھا اور وہ زندگی سے بیزار تھا۔ لیکن ایڈورڈ نے سرہلا کے یہی کہا "احتیاط نہیں کی گئی - ورنہ خودکشی نہ کرتا"

خودکشی اُس نے کیسے اور کیوں کی ؟ اُس نے تفتیش کی - معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنی دھوتی میں سے دھجی پھاڑ کے گلے میں پھندا لگا لیا تھا۔ لیکن کیوں؟ اس کیوں کی وجہ اُسے بتائی گئی تو وہ غم و غصے سے کانپنے لگا۔ سسٹر روتھ نے ڈینیل سے کہا تھا "تم پر اتنی قیمتی دوا ضائع ہو رہی ہے - ڈاکٹر ہمفری کو جھک ہے - تم اچھے نہیں ہوگے - تم مر کیوں نہیں جاتے" یہ کہہ کر اُس نے دو تین بار بے رحمی سے سلفون کا انجکشن اُس کے گوشت میں ٹھونسا - دوا چڑھ نہیں رہی تھی - غالباً سوئی میں گڑ بڑ تھی - آدھی دوا بہہ گئی - جس پر سسٹر نے مزید قیمتی دوا ضائع ہونے پر اُسے بُرا بھلا کہا اور مرنے کی تجویز پیش کی -

اُس نے پیر پٹخے اور کرسی پر بیٹھ کے سر ہاتھوں میں تھام لیا - وہ اُس کی پلاسٹک سرجری کی سوچ رہا تھا - ایسے ہی ایک مریض کی چند دن ہوئے اُس نے پلاسٹک سرجری کی تھی اور وہ اچھا ہو رہا تھا - چند دن پہلے کا آپریشن اُس کی نظروں میں گھوم گیا - کتنی احتیاط سے اُس نے عضلات کو بچا بچا کے اُس کی کھال کاٹی تھی اور نہ صرف معطل اعضا کو خوبصورت بنا دیا تھا بلکہ وہ کارآمد بھی ہو گئے تھے -

اُس نے گھوم کے پیچھے کے پلنگ پر لیٹے ہُوئے اُس مریض کو دیکھا جس کی پلاسٹک سرجری اُس نے حال ہی میں کی تھی اور جس کا ہاتھ اب آسانی سے حرکت کر رہا تھا - اُس نے رنج سے ڈینیل کے متعلق سوچا:
"افسوس! یہ اُس کی آخری قوتِ عمل تھی جو گلے میں پھندا لگانے میں صرف ہُوئی - اور آپریشن کے بعد فزیوتھریپی میں اِستعمال نہ ہو سکی"

وہ بہت ناخوش تھا - وہ روتھ کی تلاش میں لپکا اور بغیر کُچھ کہے اُس کا بازو سختی سے پکڑا اور اُسے بڑے پادری کے پاس لے گیا - وہ اُن سے کہنے لگا:-

"یہ عیسیٰؑ کی بھیڑ ہے جو صحت کا جام پیش کرنے کے بجائے مریضوں کو موت کی ترکیبیں سُجھاتی ہے - تیمارداری کے بجائے اُنھیں تکلیف دیتی ہے - اب یہ آیندہ ہسپتال میں داخل نہ ہو - یہ یقیناً پابندی سے گرجے جاتی ہے اور ہر نماز میں شرکت کرتی ہے - مگر مُجھے اِس کی ضرورت نہیں - اِس کی جگہ آپ میرے ساتھ سسٹر فریز کو کر دیجیے"

آج اُس کا مزاج بہت خراب تھا - وارڈ میں بچارا فادر فرینک مریضوں کو اِنجیلِ مُقدس سُنا رہا تھا - وہ اُسے دیکھ کے جھلایا اور کہنے لگا:
"اِسے بند کرو - کام کرو - ڈسپنسری میں جا کے برادر اِلشلے سے کہو کہ مکسچر فوراً بھجوائے یہ پرچہ اُسے دینا - اِس کے مُطابق وہ برومائیڈ اور سپرٹ امونیا کی خوراک اِس میں شامل کرے گا - اور سُنو! ابھی اِدھر نہ آنا - اُن کی پٹیاں ہوں گی"

پھر وہ سسٹر فریز سے مخاطب ہُوا۔ "مجھے اُمید ہے کہ تم محنت اور احتیاط
سے کام کرو گی۔ اُن کا خیال رکھو گی جن کی خاطر تمھیں یہاں لایا گیا ہے اور
سسٹر روتھ کے رویّے سے گُریز کرو گی۔"

اِس پر فریز نے اِطاعت سے کہا "وعدہ کرتی ہُوں۔ شکایت کا موقع
نہ دُوں گی۔"

"ہُوں۔ شاباش۔" اُس نے مطمئن ہو کے کہا اور اپنے سامنے مریضوں
کی پٹّیاں کروائیں۔

پھر اُس نے وارڈ کے آدمی سے پُوچھا "آج اِن کے بستر کیوں نہیں
بدلے گئے؟ آج تو چوتھا دن ہے۔ ایک دِن زیادہ ہو گیا۔ یہ برادر ہنری
کیا کرتا ہے؟ سسٹر فریز، ہنری سے چادریں لے کر آؤ۔ اُس کے چارج
میں جو انبار میں چادریں الماریوں میں رکھی ہیں، وہ کس دِن کام آئیں گی؟"

وہ ایڑیوں کے بل مُڑی اور چادریں لینے چلی گئی۔ وہ اُس کی چھوڑی
ہوئی اُدھوری پٹّی خود کرنے لگا۔ مریض نے اِطمینان سے ٹانگ ڈھیلی
چھوڑ دی۔ اُس کے ہاتھ نرم اور مُلائم تھے۔ اُسے یہ دیکھ کے حیرت ہُوئی
کہ ڈاکٹر صاحب پٹّی بھی کرنا جانتے ہیں اور بڑی نرمی اور پھُرتی سے کرتے
ہیں۔

سسٹر فریز چادروں کا گٹھر لیے ہُوئے داخل ہُوئی اور جلدی جلدی
چادریں بدلنے لگی۔

ایڈورڈ نے اُسے ٹوکا "اپنے جرمن ہاتھوں کی سختی کم کرو۔ اِن کے

زخم دُکھتے ہیں اور نرمی سے۔ شاباش۔"
سسٹر فریز نے چادریں بدلتے بدلتے سوچا۔ "اِس میں شک نہیں،
اِس کے تحت کام کرنا مُشکل ہے۔ مگر میں اِسے شکایت کا موقع نہ دُوں گی۔"
وہ سب کھانے کے کمرے میں جمع تھے اور عادتاً شور مچا رہے تھے۔
فرانسس جلدی جلدی باورچی خانے کے کمرے کے فاصلے طے کر رہا تھا۔
چائے کے بعد وہ سب باہر سبزے پر ٹینس کھیلنے جانے والے تھے۔
تب وہ داخل ہُوا۔ وہ اُسے آتا دیکھ کے ایک دم خاموش ہو گئے
اور گڈ ایوننگ کا کورس ہُوا۔ اُس نے مُسکرا کر بظاہر بشاشت سے جواب
دیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

برادر وڈ کا مُنہ سسٹر روتھ کی تنزلی پر لمبا ہو رہا تھا۔ اب وہ
ہسپتال کی چار دیواری میں کس سے چُہلیں کرے گا اور آنکھیں لڑائے گا۔
اُسے کام کے اوقات میں بھی دل بستگی درکار تھی۔
ایڈورڈ نے اُس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا "راتوں کی عیّاشی اِس
کے لیے کافی نہیں ہے۔" اور پھر اطمینان سے چائے پینے لگا۔
روتھ اب گرجے کی صفائی پر مامور تھی اور مدر مارگریٹ فیری اس پر
کڑی نظر رکھتی تھی۔

کرسمس آنے والا تھا اور وہ سب دھیرے دھیرے کرسمس کی باتیں
کر رہے تھے۔ اُنھیں اِس کی تیاری کے سلسلے میں بہت کام کرنا تھے۔

پھر وہ سسٹر فریز سے مُخاطب ہُوا۔ "مجھے اُمّید ہے کہ تم محنت اور احتیاط سے کام کرو گی۔ اُن کا خیال رکھو گی جن کی خاطر تمھیں یہاں لایا گیا ہے اور سسٹر روتھ کے رویّے سے گریز کرو گی۔"

اِس پر فریز نے اِطاعت سے کہا "وعدہ کرتی ہُوں۔ شکایت کا موقع نہ دُوں گی۔"

"ہُوں۔ شاباش۔" اُس نے مطمئن ہو کے کہا اور اپنے سامنے مریضوں کی پٹّیاں کروائیں۔

پھر اُس نے وارڈ کے آدمی سے پُوچھا "آج اِن کے بستر کیوں نہیں بدلے گئے؟ آج تو چوتھا دن ہے۔ ایک دِن زیادہ ہو گیا۔ یہ برادر ہنری کیا کرتا ہے؟ سسٹر فریز، ہنری سے چادریں لے کر آؤ۔ اُس کے چارج میں جو انباروں چادریں الماریوں میں رکھی ہیں، وہ کس دِن کام آئیں گی؟"

وہ ایڑیوں کے بل مُڑی اور چادریں لینے چلی گئی۔ وہ اُس کی چھوڑی ہوئی اُدھوری پٹّی خود کرنے لگا۔ مریض نے اِطمینان سے ٹانگ ڈھیل چھوڑ دی۔ اُس کے ہاتھ نرم اور مُلائم تھے۔ اُسے یہ دیکھ کے حیرت ہُوئی کہ ڈاکٹر صاحب پٹّی بھی کرنا جانتے ہیں اور بڑی نرمی اور پھُرتی سے کرتے ہیں۔

سسٹر فریز چادروں کا گٹھر لیے ہُوئے داخل ہُوئی اور جلدی جلدی چادریں بدلنے لگی۔

ایڈورڈ نے اُسے ٹوکا "اپنے جرمن ہاتھوں کی سختی کم کرو۔ اِن کے

زخم دُکھتے ہیں اَور نرمی سے۔ شاباش۔"

سسٹر فریز نے چادریں بدلتے بدلتے سوچا۔ "اِس میں شک نہیں، اِس کے تحت کام کرنا مُشکل ہے۔ مگر میں اِسے شکایت کا موقع نہ دُوں گی۔"

وہ سب کھانے کے کمرے میں جمع تھے اور عادتاً شور مچا رہے تھے۔ فرانسس جلدی جلدی باورچی خانے کے کمرے کے فاصلے طے کر رہا تھا۔ چائے کے بعد وہ سب باہر سبزے پر ٹینس کھیلنے جانے والے تھے۔

تب وہ داخل ہُوا۔ وہ اُسے آتا دیکھ کے ایک دم خاموش ہو گئے اور گُڈ ایوننگ کا کورس ہُوا۔ اُس نے مُسکرا کر بظاہر بشاشت سے جواب دیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

برادر وڈ کا مُنہ سسٹر روتھ کی تنزلی پر لمبا ہو رہا تھا۔ اب وہ ہسپتال کی چار دیواری میں کس سے چُہلیں کرے گا اور آنکھیں لڑائے گا۔ اُسے کام کے اوقات میں بھی دل بستگی درکار تھی۔

ایڈورڈ نے اُس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا "راتوں کی عیّاشی اِس کے لیے کافی نہیں ہے۔" اور پھر اطمینان سے چائے پینے لگا۔

روتھ اب گرجے کی صفائی پر مامُور تھی اور مدر مارگریٹ میری اس پر کڑی نظر رکھتی تھی۔

کرسمس آنے والا تھا اور وہ سب دھیرے دھیرے کرسمس کی باتیں کر رہے تھے۔ اُنھیں اِس کی تیاری کے سِلسلے میں بہت کام کرنا تھے۔

فادر فرینک کو مزید بنگالی میں انجیل حفظ کرنی تھی۔ اُس دن وہ مریضوں کو ارشادات سُناتا تھا۔

ایڈورڈ نے فادر فرینک کی طرف دیکھ کے سوچا: "یہ کس لیے اِنھیں انجیل سُناتا ہے۔ زنا، چوری، پڑوسی کی بیوی سے عیاشی؛ اِن سب باتوں کی اِن میں سکت کہاں ہے۔ شاید یہ اِنھیں موت کا دھیان دلاتا ہے۔"

مگر ایڈورڈ نے کرسمس کی خوشیوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ راہبوں نے ناگواری اور کینہ پروری سے اُسے دیکھا۔ اِن سب نے متفق ہو کے سوچا: "ہم دُنیا سے الگ تھلگ ہیں۔ ایک ذرا اِس دن خوش ہو لیتے تھے۔ مگر اِسے یہ بھی گوارا نہیں۔"

ایڈورڈ نے اُنھیں بتایا: "کرسمس بڑی نہیں سجے گا۔ وہ ہسپتال کے فنڈ سے ایک دُوسرے کو تحائف نہیں دیں گے۔ صِرف کرسمس کارڈ بھیجے جائیں گے۔ تمام ایسی فضُول باتیں ابکی نہیں ہوں گی اور پیسہ ضائع نہیں کیا جائے گا۔ اِس کے بدلے اِس دن مریضوں کو اچھّا کھانا ملے گا۔ اُن کے کپڑے ہسپتال کی طرف سے بنیں گے۔ انجکشن لگانے کی پلاسٹک کی سرنجیں اور سرجری کا کچھ سامان وِلایت سے آئے گا۔"

راہبوں کے مُنہ ذرا ذرا سے نکل آئے۔ "یہ بڑی زیادتی ہے" اُنھوں نے کبیدہ خاطر ہو کر سوچا۔ پھر وہ کوفت مٹانے کو، اِس بات کا ذکر کرنے لگے کہ ابکی یورپ میں ہر جگہ برف باری بہت ہُوئی ہے۔

اور خود وہ سوچ رہا تھا: "یورپ بہت دُور ہے۔ پیٹر کا بٹیا نجانے کس سے ملتا ہوگا۔ ممی کے دروازے پر ہر صُبح برف کا ڈھیر لگ جاتا ہوگا۔ نجانے پیٹر کو اُسے صاف کرنے کا خیال بھی ہوگا یا نہیں ورنہ ممی کو صُبح دروازہ کھولنے میں دِقت ہوتی ہوگی۔ شاید اخبار والا یا دُودھ والا پیسے لے کر صاف کر دیتا ہوگا۔ پیٹر نے کچھ اِنتظام ضرُور کیا ہوگا۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور وہ ٹینس کھیلنے چل دیے اور نیلے سبزے پر ٹینس شُو خراب ہوتے دیکھ کے اُنھوں نے اِس مُلک کو اور اِس کے موسم کو بُرا بھلا کہا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ یہاں فرانسس اُس کا بستہ ٹھیک کر رہا تھا۔

"ذرا سِسٹر مارگرٹ کو بُلا لاؤ۔" اُس نے فرانسس سے کہا۔

سِسٹر مارگرٹ نے دروازے پر جھٹک کے خوشدلی سے کہا "گُڈ ایوننگ ڈاکٹر ہمفری۔"

"گُڈ ایوننگ۔ آ جاؤ۔" اُس نے بھی خوشدلی سے کہا اور الماری ٹٹولنے لگا۔ پھر وہ مُڑا اور پُوچھنے لگا۔ "تُم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟"

وہ خوش ہو گئی اور کہنے لگی: "ضرُور۔ کیا کام ہے؟"

ایڈورڈ نے اُسے پیسے دیتے ہُوئے کہا۔ "میں نے سُنا ہے تُمھارے یہاں کوئی نن بہت اچھّی سِلائی کرتی ہے۔ میرا اُس سے ایک کام کروا دوگی؟"

وہ کہنے لگی۔ "ہاں، مگر وہ تو ہمارے کپڑے سیتی ہے۔ آپ لوگوں کے کام کے لیے تو درزی ہے۔ مگر شاید وہ کوٹ پتلون سینا نہ جانتا ہو کیونکہ پادری تو قبائیں پہنتے ہیں۔ اِس کے لیے ڈھاکے کی مِشن کو لکھو۔ برادر ٹرمن درزی لے کر آ جائے گا۔ اگر ولایت سے کپڑا منگوانے کا اِنتظام کیا ہے تو

کچھ وقت لگے گا اور کرسمس تو اب نزدیک ہے۔" وہ سمجھی کہ وہ کرسمس پر سُوٹ سلوانا چاہتا ہے۔

وہ یہ محسُوس کر کے بہت محظُوظ ہُوا اور مُدّت بعد خُوش دِلی سے ہنسا وہ کہنے لگا۔ "مجھے اپنے لیے کپڑے نہیں سلوانا۔ ایک بچّے کے لیے سلوانا ہیں۔"

اس پر وہ حیرت سے کہنے لگی: "ڈاکٹر ہمفری، بچّے کے؟"

وہ اور ہنسا اور سِسٹر مارگرٹ اُسے ہنستا ہُوا دیکھ کے سوچنے لگی۔ "اِس کی ہنسی کتنی خوبصُورت ہے۔ اِس میں بچّوں کی سی خوشی اور سادگی ہے۔" وہ اُسے یک لخت بہت اچھّا لگا۔ "دِلکش اِنسان" اُس نے دِل میں کہا۔

"ہاں بچّے کے۔ مریضہ نمبر ۱۳ یعنی ماجدہ کے بچّہ ہونے والا ہے، اُس کے لیے۔ اِن پیسوں میں بنوا دو۔ اگر کم ہُوئے تو میں اور دے دُوں گا۔ ٹھیک ہے نا؟ میں بہت ممنون ہوں گا۔"

"اوہ۔ آئی سی۔ وُہی تو میں کہوں۔ آئی ایم سوری۔ بہت اچھا خیال ہے۔ شاید تُم اسے کرسمس کا تحفہ دینا چاہتے ہو۔"

"چلو یُونہی سہی۔ حالانکہ کرسمس پر تحفہ دینے کا مجھے کوئی خیال نہ تھا۔ اگر جلدی سِل گئے تو میں پہلے ہی اُسے دے دُوں گا تاکہ اُسے یہ خیال نہ ہو کہ میں اُسے خیرات دے رہا ہُوں کرسمس پر۔" اُس نے سوچا۔

وہ کہنے لگی: "وہ بھی میرے نام کی عُمر رسیدہ نن ہے، مدر مارگرٹ میری

وہ بہت اچھے کپڑے سیتی ہے۔ سِلائی کا کام وہی کرتی ہے۔ ضرور کر دے گی۔ یہ پیسے بہت ہیں۔"

اُس نے پیسے لے لیے اور کہنے لگی: "ہمارے یہاں پہلی بار کسی بچّے کے کپڑے سِل رہے ہیں۔"

اِس پر وہ پُوچھنے لگا۔ "کیوں؟ یہ راہبوں کے بچّے جو ننوں سے ہوتے ہیں، اِن کے کپڑے کہاں سِلتے ہیں؟"

سِسٹر مارگرٹ نے محسُوس کیا کہ وہ نہ صِرف صاف گو ہے بلکہ خاصا بدلحاظ بھی ہے۔ بائیس تئیس سال کی خُوبصُورت اور تندرُست کیتھولک راہبہ جھینپ کے سُرخ ہو گئی۔ وہ ڈھٹائی سے جواب لینے کو اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور سنجیدہ تھا۔ مگر اُس کی بے حد نیلی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

وہ کہنے لگی: "تو تمھیں یہ سب معلوم ہے۔"

"کیوں؟ میں بھی تو یہاں رہتا ہوں۔" اُس نے ضِد سے کہا۔

"مگر تمھیں تو اِن باتوں سے کوئی تعلّق نہیں۔ اصل راہب تو تُم ہو۔" اُس نے نظر نیچے کر کے کہا۔

اُس نے کہا: "اِس سے کیا ہوتا ہے۔ بچّہ تو نہیں ہُوں۔ پھر میں نے بھی کانونٹ میں اِنھی راہبوں کے درمیان بورڈنگ میں رہ کے پڑھا ہے۔"

وہ بات ختم کرنے کو کہنے لگی "وہ مشن کو بھیج دیے جاتے ہیں ڈھاکہ۔ وہاں یتیم خانے کی راہبائیں اُنھیں رکھتی ہیں۔"

"بھیج تو دیے جاتے ہیں مگر نگے؟" وہ اپنے سوال کے جواب پر اڑا رہا۔ یک لخت مارگرٹ نے دِل میں بڑی دلچسپی سے کہا "خوبصورت ترین بدتمیز اور بدلحاظ شخص جو ایسا کرتا بدقسمتی سے بڑا پیارا لگ رہا ہے۔"

پھر اُس نے جھینپ کے کوفت سے کہا۔ "اُن کے کپڑے ڈھاکے کی مشنری سے آتے ہیں۔"

"گڈ۔ اچھا ایک بات یہ ہے کہ یہ کپڑے کرسمس سے پہلے ہی سِلوا دو۔ میں تمھارا اور مدر مارگرٹ کا ممنون ہُوں گا۔ شکریہ۔"

وہ جانے کو مُڑ گیا اور وہ اُس کی پیٹھ کو دیکھتی رہی۔ اُس کے جسم میں ایک لہر دوڑ گئی۔ "مقناطیسی اِنسان جو اپنے اندر فولاد کی سی قوّت رکھتا ہے۔" یہ سوچتے ہُوئے مارگرٹ نے اُس کے لیے شائستگی سے دروازہ کھولا اور وہ شکریہ کہتا ہُوا بغیر اُسے دیکھے یہ سوچتا ہُوا باہر نکل گیا کہ یہ نن علیٰ کی اِن تمام بھیڑوں میں صحیح الدِماغ ہے۔

رات کو سونے سے پہلے اُس نے دو رلے مجلے کرسمس اور نئے سال کے کارڈوں پہ پیٹر اور ممی کو مُبارکباد لکھی اور اِس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وُہ ایک اچھا کرسمس منائیں اور نیا سال اُن لوگوں کے لیے سلامتی، صحت اور خوشیاں لائے۔ پھر اُس نے ڈھاکہ برادر شرمن کو لکھا کہ وہ ولایت کے مِشن کو لکھ دے کہ وہ اس کی تنخواہ میں سے بیس پاؤنڈ پیٹر کے بیٹے اور تیس پاؤنڈ ممی کو کرسمس پہ بھیج دیں۔

پھر ایک نئے سال کے کارڈ پر اُس نے صِرف اپنے دستخط کیے اور اسکرود کا پتا لکھ کر ڈاک فرانسس کے سپُرد کی تاکہ وہ صُبح ڈھاکے سے آنے والے قاصد کو دے دے۔

وہ سو نہ سکا۔ اُٹھ کے بیٹھ گیا اور دھیرے سے کہنے لگا "تم میرے ذہن کا دروازہ کا ہے کو کھٹکھٹاتی ہو۔ شاید اِس لیے کہ وہ باوجود کوشش کے مجھ سے بند نہیں ہوتا۔ تُم پر یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ تم اِس سے فائدہ اُٹھاتی ہو۔ اور اِس وقت تُم اِسے بڑی شوریدہ سری سے کھٹکھٹا رہی ہو۔ اِتنا شور مچانا سراسر بدتمیزی ہے۔ ٹھہرو، میں یہ شور برداشت نہیں کر سکتا۔"

اُس نے کپڑے بدلے اور ماجدہ کو دیکھنے وارڈ کی طرف چل دیا۔
ماجدہ کا بخار اُتر گیا تھا مگر وہ کراہ رہی تھی۔ وہ ذرا سا جھکا۔ "کیا بات ہے ماجدہ؟"

"فادر صاب، سر دکھتا ہے۔"

"اچھا، میں تمھیں سر کے درد کی گولی دلواتا ہوں۔"

گولی کھا کے وہ کہنے لگی "اب بھی درد ہے فادر صاب"

"ارے ابھی تو تم نے گولی کھائی ہے۔ ابھی کیسے چلا جائے گا۔ ٹھہرو میں تمھارا سر دباتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ نہیں۔ نہیں فادر صاحب۔ ایسا کیسے ہو سکے گا۔ آپ اتنا تکلیف مت کرو۔ کوبھی نہیں۔"

"تم چپکی لیٹی رہو۔ پھر سسٹر آئے گی تو وہ تمھارا سر دبا دے گی۔ ایڈورڈ نے اُسے ڈانٹا۔ اور وہ خاموشی سے سر دبواتی رہی۔ اور کہتی رہی "فادر صاب تم ہمارا مائی باپ ہے۔ کوئی اِتنا کرنے نہیں سکتا جتنا آپ کرتے ہو۔ ہم کیا بولنے سکے گا۔"

وہ دھیرے دھیرے اُس کا سر دباتا رہا اور بچّے کو علٰحدہ کرنے کے لیے اُسے تیار کرتا رہا۔ وہ کہنے لگا۔ "دیکھو ماجدہ، میں نے تمھارے بچّے کے لیے کپڑے سلوائے ہیں۔ تمھاری ماں اور بہن کو سسٹر سمجھا دے گی کہ اُسے روز نہلا کے کپڑے پہنائیں۔ روز نہانے سے وہ تندرست رہے گا۔ پھر تم اسے دیکھو گی تو تمھیں ایسا لگے گا جیسے وہ کوئی دوسرا بچّہ ہو۔ تمھارے جانے تک وہ ذرا موٹا اور بڑا ہو جائے گا نا۔"

ماجدہ کہنے لگی "فادر صاب، تم نے اتنا تکلیف کیا۔ ہمارے بچّے کے کپڑے بھی سلا دیے۔ ہم تو کچھ کرنے نہیں سکتا تھا۔ ہم بہت گریب ہے۔ صاب، ہم کیسے بدلہ اُتارنے سکے گا۔ صاب، ہم آپ کا خدمت کرنے مانگتا۔ آپ ہم کو بولے۔ ہم آپ کا خدمت کرے گا، اگر اچھا ہونے سکا۔"

وہ کہنے لگا، "تم فکر مت کرو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تمھیں بولتا ہوں تم ابھی میری خدمت یہ کرو کہ میرے کہنے پر بچّہ اپنی ماں بہن کو دے دو، اُس وقت تک جب تک تم ہسپتال میں ہو۔ تم میری بات خوشی سے مان لوگی تو میرا بدلہ اُتر جائے گا۔ مان لوگی نا ماجدہ؟ بچّے کو کوڑھ سے بچا کے تم مجھ پر بڑا احسان کرو گی۔ ٹھیک ہے نا؟

"ٹھیک ہے فادر صاب۔ تم ہمارا مائی باپ ہے۔ ہم خوشی سے دے دے گا۔ تم جیسا بولے گا ہم کرنے سکے گا۔ تم ہمارے بچّے کی تندرستی کے لیے بولتے ہو۔ ہمارے لیے تکلیف کرتے ہو۔ ٹھیک ہے فادر صاب"۔ ماجدہ نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ مگر بچّے کی جُدائی کا خیال کر کے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، جن کو وہ خاموشی سے پی گئی۔

ایڈورڈ نے اُسے آنسو پیتے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ "او خدا۔ اِس نحیف و ناتواں دِل پر کتنے الم ہیں۔ تو ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہے!"

وہ سر دباتا رہا اور جب ماجدہ سو گئی تو وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور کپڑے بدل کے لیٹ گیا۔ اُس کے ذہن کے دروازے پر

غم کی دیوار اُس ہاتھ کا رستا روکے کھڑی تھی جو اُسے کھٹکھٹانا چاہتا تھا۔ یہ غم اُس کا اپنا نہ تھا۔ یہ اُس کوڑھی عورت کا تھا جس کا بچہ جُدا ہونے والا تھا اور جس کو جُدا کرنے والا وہ خود تھا۔

دسمبر کا مہینا اس سرزمین پر نسبتاً خشک ہوتا تھا مگر اُس رات بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے کسمسا کے کروٹ لی اور سوتے میں بڑبڑایا "نجانے کون روتا ہے"۔

وہ اُٹھا' کھڑکی پر سے پردہ سرکا کے باہر نظر ڈالی اور کہنے لگا: "ارے' ڈیلیا کے پھول اتنی زور کی بارش میں ٹوٹ جائیں گے"۔ پھر ذرا سا شور اُسے ذہن میں سُنائی دیا۔ اُس نے تکیہ پر سر پٹخا' دُوسرے کے غم نے تھپکی دی اور وہ بے چین سی نیند سو گیا۔ نیلی آنکھوں میں کھٹک تھی۔ اور باہر کب سے تیز بارش میں پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کے خاک آلود ہو رہی تھیں۔

"آہ' ڈیلیا کے پھول۔ سب برباد ہُوئے"۔ شاید اُس نے خواب میں کہا کیونکہ اُس نے پھولوں کی بڑی دیکھ بھال کی تھی اور اُس کی پیدائش پر' جو کوڑھیوں کا سب سے پہلا مُعالج اور سہارا تھا' وہ بڑے بڑے پھول مریضوں کے سامنے کھڑکیوں پر گلدانوں میں سجانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ڈیلیا کے پھول' اُس کا خیال تھا' صحت اور بشاشت کی علامت ہیں۔ پر ایسا نہ ہو سکا وہ بکھر گئے کیونکہ آسمان روتا تھا۔۔۔۔

نکھری دُھلی بے داغ دُھوپ میں زرد املتاس کے جُھکے جُھکے گُچھے' سُرخ گُل مُہر کے پھول اور بھینی بھینی خوشبو والے کنیر' نم اور خُنک ہوا کے جھونکے اور اُس کے کمرے کے پہلو میں بافراط بانس کے جُھنڈ۔

پیٹر لارڈ ہمفری کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کے شکار پر چلا جایا کرتا تھا اور وہ اپنے گھوڑے سبکتگین پر بیٹھ کر کینٹر میں بانس کے جُھنڈوں کی طرف آجاتا۔ یہاں درختوں کی جڑوں سے پیٹھ لگا کے عُمر خیام اور حافظ کا مُطالعہ کیا کرتا۔ اس وقت وہ سینئر کیمبرج میں تھا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ سبکتگین کی پیٹھ پر بیٹھ کر بے مقصد گھومے اور پھر بے فکری سے بانس کے جُھنڈوں میں بیٹھ کے' پہلے کی طرح' عُمر خیام کی رُباعیاں پڑھے۔

وہ مُسکرایا۔ اِردگِرد کے منظر پر تعریفی نظر ڈالی اور پُراعتماد قدموں سے ٹائی کی گرہ کو سجل کرتا ہُوا آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گیا۔

یہ چکمہ لڑکی کسی زمیندار کی بیٹی تھی۔ سُنہری رنگت' ترچھی آنکھیں' ڈھیروں نرم سیاہ' سیدھے بال' پیٹھ پر بکھرائے اپنے قبیلے کے لباس میں تھوڑی سی خوفزدہ' ذرا دِقّت سے چلتی ہُوئی۔

مایا اس کا نام تھا۔ وہ اُس کے آگے آگے چل رہی تھی اور اُس سے خاصی سُتھری انگریزی میں مُڑ مُڑ کے پُوچھ رہی تھی کہ آپریشن میں تکلیف تو نہ ہوگی۔ اور وہ اسے ہنس ہنس کے یقین دلا رہا تھا کہ نہیں۔ ذرا سا کوڑھ کا داغ تھا اس کی ٹانگ پر۔ باقی وہ ہر طرح تندرست تھی۔

یہ آپریشن اُس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اُنگلی میں سے پھانس نکالتے

ہیں۔ اُس نے بڑھ کے اُسے کنیر کے سُرخ گچھے دِیے۔ "یہ تم اپنے بالوں میں لگالو۔ آپریشن کی میز پر لیٹنے سے یہ خراب نہیں ہوں گے۔" ایسا کہتے ہُوئے اُس نے سوچا "لڑکیوں کو ان باتوں کی کتنی فکر ہوتی ہے۔ بال بے ترتیب نہ ہوں۔ بالوں میں سجے ہُوئے پھول اور پِنیں مُنتشر نہ ہوں۔ ہاں۔ مگر اُسے ایسی کوئی فکر نہ تھی۔ قُدرت کی طرح بے پروا سجنے بننے اور ایسی چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں سے بے نیاز۔"

وہ جلدی سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوگیا۔ وہ بڑی احتیاط سے عضلات بچا بچا کے اُس کے زخم کی پلاسٹک سرجری کر رہا تھا اور ساتھ میں دھیان بٹانے کو اُس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ اُسے بے ہوش نہیں کیا گیا تھا۔ صِرف زخم کے آس پاس کے حصّے کو سُن کر دیا گیا تھا۔

"اچھی ہونے پر تم آرام سے کام کالج جا سکتی ہو۔ تمھارے مضامین کیا ہیں؟ تمھاری زبان میں پھولوں کو کیا کہتے ہیں؟ شاباش! بلومت۔ بڑی سمجھ دار لڑکی ہو۔"

اپنے مُنہ پر سے اُس نے سفید ماسک ایک ذرا ہٹایا اور مارگرٹ کو اِشارہ کیا۔ اُس نے اُس کی ڈوری ٹھیک سے باندھی اور ماسک ناک اور مُنہ پر دوبارہ ٹھیک کیا۔

"یہ قینچی نہیں مارگرٹ، وہ سی۔ تم ذرا تر سے لے کر اِدھر تھوڑی سی کِھسک جاؤ۔ اِس میں میری کُہنی لگتی ہے۔ اب ٹھیک ہے۔"

پھر وہ لڑکی سے مُخاطب ہُوا "مایا ذرا پیر سکیڑو شاباش۔ میں تمھاری پٹی کرتا ہوں۔ گڈ گرل۔ لو بھئی پٹی بھی ہو گئی۔ اب تم جا سکتی ہو۔" وہ پُوچھنے لگی "خود جا سکتی ہوں؟"

"اِتنی بہادری بھی مت دکھانا۔ یہ سسٹر تمھیں پہیوں والی کُرسی پر بٹھائے گی اور تم شان سے باہر جانا اور اپنے ماں باپ کو جو باہر تمھارے منتظر ہیں آپریشن کا حال سُنانا۔ صبر کرو۔ تمھارے پھول گرتے ہیں۔ میں اُنھیں سنبھال دُوں۔ ارے مجھے تو پِن ہی لگانا نہیں آتی۔ مارگرٹ ذرا یہ گچھا اس پن میں اڑسو۔ لو تمھارے پھول بھی لگ گئے۔" وہ ہنس پڑی۔

"گڈ گرل اور بہادر بھی۔ کل صُبح تمھاری خیریت پُوچھوں گا۔ خُدا حافظ" اس نے کہا۔

پھر وہ مردوں کے وارڈ کا راؤنڈ لینے آگیا اور تمیزُالدین سے اُس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ تمیزُالدین بڑا بکواسی تھا۔ وہ باتیں کرتا رہا اور وہ ہنستا رہا۔ وہ کہیں کلرک تھا۔ دسویں فیل مگر انگریزی بولنے کا بہت شائق۔

اُس نے تمیزُالدین سے کہا "تم پڑھے لکھے ہو۔ سسٹر سے کہو تمھیں بنگالی یا انگریزی کے کچھ رسالے لا دے۔ لیٹے لیٹے پڑھو۔"

اُس نے سوچا اس طرح اِس کی بکواس کم ہو گی۔ مردانہ وارڈ کا راؤنڈ ختم کر کے وہ زنانہ وارڈ کی طرف گیا۔

ماجدہ کو ایک ٹک اُس نے دیکھا اور اُس کا دِل بڑا فکر مند ہُوا۔ "یہ بہت کمزور اور بیمار ہے۔ غالباً اِسے خُون کی ضرورت پڑے۔

یہاں کوئی خون دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ میں اپنا خون ٹیسٹ کراؤں۔ اِس کا میاں بلڈ بنک سے خرید نہیں سکتا۔ میری تنخواہ ساری کی ساری بٹ گئی۔ آدھی ولایت چلی گئی، کچھ پیسے اِس کے بچّے کے کپڑوں کے لیے دے دیے اور کچھ غریب مریضوں کے فنڈ میں۔ رُومال ختم ہو گئے تھے وہ آئے۔ گرجا جاؤ نہ جاؤ یہ موٹا اُس کے پیسے بھی کاٹ لیتا ہے۔ ولایت سے پلاسٹک سرجری پر کتابیں آئیں اور یہ نجاتے شرمن نے مجھے ٹرانسسٹر کیوں بھیج دیا تھا۔ اس کے پیسے بھیجے۔ ٹیپ خریدی۔"

ہنری کے پاس ٹیپ رکارڈ تھا۔ ایڈورڈ نے اپنی آواز اِس میں ٹیپ کر کے ڈھاکہ مشن کو بھیجی تھی۔ کہ وہ کسی کے ہاتھ اُس کی ماں کو بھیج دے۔ ماں نے اُسے لکھا تھا "میرا دل تمھاری آواز کو ڈھونڈتا ہے۔ صُورت تو تصویر میں دیکھ لیتی ہوں مگر آواز کیسے سُنوں"۔

اِس کے پیسے ہنری نے مارے کمین پن کے کچھ زیادہ ہی وصول کر لیے تھے۔

ماجدہ کو اُس نے تھوڑی سی فزیوتھریپی کرائی اور اُس کی غذا میں ضرُوری حیاتین شامل کیے۔ مگر وہ اُس کی طرف سے غیر مُطمئن رہا۔

ایک بار وہ پھر مردانے وارڈ میں گیا اور تمیزُالدّین کو سمجھایا کہ وہ آہستہ اور کم بولے۔ پاس والے کا خیال کرے۔ اِس کے بعد چند نئے مریضوں کی ہسٹری لکھی۔ اُن کے آپریشن کے دن مُقرّر کیے۔ کچھ مریضوں کے پروگرس چارٹ دیکھے۔ ایک مریض کا گلا خراب تھا۔

اُس نے سسٹر فریزہ سے کہا کہ اُسے رات کو پوٹیشم کا غرارہ کرائے۔ اور اریتھرومِسِن کی ایک گولی ہر چھ گھنٹے بعد اُس وقت تک دیتی رہے جب تک کہ گلا صاف نہ ہو جائے۔

وہ ہر چیز کو اپنے تئیں بہت تفصیل میں پڑ کے جانچنے اور علاج کرنے کا قائل تھا۔ وہ پہلے ہی بیمار اور کمزور تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک ذرا سی بات اُن کے لیے بتنگڑ بن جائے۔ لیکن دُوسرے لوگ اُس کی ان باتوں سے ناراض تھے۔ ہر چیز کا مکمل ٹیسٹ اور کلچر کا مطلب تھا کہ ہسپتال کا پیسہ اب زیادہ تر مریضوں ہی پر خرچ ہوتا تھا۔ اور پادریوں کو اللے تللے کرنے کو نہیں ملتا تھا۔ وہ اُس کے خلاف چُھپکے چُھپکے پھلجھڑی پکاتے مگر اُس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے راہبوں سے وہ کم عُمر تھا مگر فی الحال وہ ہسپتال کا انچارج تھا اور واحد ماہر ڈاکٹر۔ مشن اُس سے بہت خوش تھا، کیونکہ جب سے وہ آیا تھا اُس نے کبھی مزید فنڈ کے لیے ولایت کو نہیں لکھا تھا۔ ایک تو بے ایمانی بند ہو گئی تھی۔ دُوسرے چھوٹے چھوٹے بہت سے خرچے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اِس کے علاوہ اُس نے ڈھاکے کے مشن سے ہسپتال کی مد میں کچھ زمینیں خرید کروا کر ان میں کاشت شروع کروائی تھی جس کا آدھا پیسہ ایمان داری سے شرمن ہسپتال کو بھیجا کرتا تھا۔

اُس نے ہسپتال کے نام سے چندہ مانگنا بند کروا دیا تھا۔ اور اُس کی اِس بات سے بشپ کی جبیں بھی شکن آلُود ہو گئی تھی لیکن اُس کا کہنا تھا کہ

جب خود کسی دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو اور وہ دے تو اُس سے لینا جائز ہے ۔ زبردستی کسی سے لینا میری نظر میں قطعی ناجائز ہے ۔ جو مریض ہسپتال میں آگیا وہ ہمارا ہے ۔ اس کا نہ کوئی مُلک ہے اور نہ قوم ۔ ہم اُس کے ذمّہ دار اور ضامن ہیں ۔ یہ ہمارا کام ہے ۔"

ہسپتال کا ٹرسٹ قائم ہو گیا تھا اور ہسپتال کی توسیع کی بُنیاد بھی پڑ گئی تھی، جس کا سنگِ بُنیاد اُس نے بشپ کے اِصرار کے باوجود نہ خود رکھا نہ اُس سے رکھوایا بلکہ اُن تین مریضوں سے رکھوایا جن کی وجہ سے جگہ کی قلت کا مسئلہ اُٹھا تھا ۔

سسٹر فریزے سے اُس نے ماجدہ کے مُعاملے میں اِحتیاط برتنے کی تاکید کی اور فکر مند بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا ۔ اُسے یہ سوچ کر بہت اُلجھن ہو رہی تھی کہ وہ ماں سے بچّہ کیسے الگ کرے گا اور پتا نہیں بچّہ تندرُست بھی ہو گا یا نہیں ۔ یہ مسئلے تھے اور یہ اُلجھنیں تھیں جو اب محض اُس کی تھیں اور وہ اُنھیں کلیجے سے لگائے دلچسپی اور پیار سے سُلجھانے میں مصروف رہتا ۔ اُس نے سوچ سوچ کر کپڑے بدلے اور ڈریسنگ گاؤن پہن کر باورچی خانے کا رُخ کیا کہ شاید فرانسس جاگ رہا ہو ۔ فرانسس لائٹ لگائے پادریوں کے جُوتے صاف کر رہا تھا ۔

"فرانسس ایک پیالی چائے ۔" فرانسس بہت خوش ہُوا ۔ اب وہ گپ کرے گا ۔ دن بھر کی خبریں سُنائے گا، پادریوں اور ننوں کو سکنڈل کرے گا ۔

"ابھی لایا فادر صاب ۔" اُس نے کہا ۔

ایڈورڈ ولایت سے آیا ہُوا کوڑھ پر نیا رسالہ پڑھ رہا تھا ۔ پڑھتے پڑھتے یہ الفاظ اُس کے دماغ میں گُونجے "تمھیں بھی اپنی نجات کا ذریعہ مِل گیا ۔ تم بھی مُجھے بھُول جاتے ہو گے ۔

"ہوں، بات یہ ہے ۔ تم بھی میری ہی جیسی ہو ۔ مجال ہے جو بدلہ چکانا نہ یاد رہے ۔ اور جیسا میں تمھیں بھُولا ہُوں، میں ہی جانتا ہُوں ۔ مریضوں کی چیخ پکاریں، آپریشن کرتے وقت، غرض کہاں اور کِس وقت تم یاد نہیں آتیں ۔ ایک مُصیبت ہو میری جان کو ۔ وقت سے کوئی فرق بھی تو نہیں پڑ رہا ہے ۔ یہ وقت کا مرہم میرے مرض کے لیے بے کار ہی ہے ۔ کاش میں اندھا ہوتا اور تمھاری آنکھوں میں دیکھ نہ سکتا ۔ نجات کہاں ملی"——

فرانسس پیالی لے کر داخل ہُوا ۔ "آجاؤں فادر صاب ؟"

آجاؤ فرانسس ۔ شُکریہ ۔ میں تمھیں بڑی تکلیف دیتا ہوں ۔ اِدھر سٹول پر بیٹھ جاؤ ۔"

فرانسس اِطمینان سے بیٹھ کے پُوچھنے لگا ۔ "فادر صاب، آپ گرجے نہیں جاتے ۔ اور تو سب جاتے ہیں ۔"

وہ ہنسا اور کہنے لگا "پہلے تم مُجھے یہ بتاؤ کہ تم مُجھے فادر کیوں کہتے ہو؟ میں تمھیں فادر نظر آتا ہُوں ؟ فادر ایسے کپڑے پہنتے ہیں ؟ میں تو ڈاکٹر ہُوں، بھائی — اور رہا گرجے کا تو فرانسس، خُدا ہے اور ہر جگہ ہے ۔ وہ گرجے میں تو نہیں بیٹھا رہتا ۔ ساری دُنیا گرجا ہے ۔ کیونکہ وہ ہر جگہ ہے ۔ اور خُدا کو کچھ نہیں چاہیے ۔ جو کچھ تم کرتے ہو اپنے لیے ۔"

پھر فرانسس برادر اشروِوڈ اور گرجے کی ایک راہبہ کو سکنڈل کرنے لگا کہ اِن دونوں میں آج کل بہت دوستی ہو رہی ہے۔

وہ کہنے لگا: "اب تم ہی دیکھ لو فرانسس۔ یہ تو خُدا رسیدہ لوگ ہیں۔ میں تو کُچھ بھی نہیں ہُوں۔ پھر بھی ایسی باتیں نہیں کرتا۔ یہ تو ریاکاری ہُوئی نا۔ میں ریاکار نہیں ہُوں۔ یاد رکھو خُدا کو اور اُس کے پیغمبروں کو ریاکاری بہت بُری لگتی ہے۔"

پھر وہ پُوچھنے لگا "فرانسس، تُم اپنے بیوی بچّوں کے پاس نہیں جاتے؟"

"صاب، ہم نے شادی نہیں کیا۔ جوزف کی موت کے بعد ہمارا دِل دُنیا سے اُچاٹ ہُوا۔ جوزف ایک دِن خواب میں آیا، اور بولا بیٹا، جاؤ اور بیمار کی خِدمت کرو۔ اور ہمارا دل بولا شادی والا آدمی بھی مرجاتا ہے اور بے شادی والا بھی۔ پر آرام سے وہ مرتا ہے جو کُچھ کرتا ہے۔"

ایڈورڈ نے کہا "ہُوں۔"

فرانسس پُوچھنے لگا "مگر فادر صاب، آپ کا بابا لوگ کہاں ہے؟ اور ولایت میں آپ کا گھر کہاں ہے؟"

وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ "ہم نے بھی شادی نہیں کیا۔ ہمارا دِل بھی یہی بولا۔ ہماری ممی کا گھر لندن میں ہے اور ہمارا گھر یہاں ہے۔ دراصل فرانسس، گھر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ سب گھر عارضی ہوتے ہیں۔ بارش اور گرمی سردی سے بچنے کو اِنسان سائے بان بنالیتا ہے۔ اب چاہے اِسے گھر کہہ لو۔"

فرانسس جانے لگا۔ فادر صاب کو شاید نیند آتی تھی۔

"گُڈ نائٹ فادر صاب۔"

"گُڈ نائٹ، فرانسس۔"

کوٹھری میں جاکے فرانسس نے بیرے کا کندھا ہلایا اور ایک اور افواہ اُڑائی "ہمارے فادر صاب کو یعنی ڈاکٹر صاب کو بشارت دی گئی کہ جاؤ اور کوڑھیوں کی خِدمت کرو۔ شادی مت کرو۔"

بیرے نے نیند سے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور کروٹ بدل کر سوگیا۔

کمبل اُوپر کھینچتے ہُوئے اُس نے کہا "اور آج دن بھر تم بے حساب یاد آئیں۔ کیا اِسی کو نجات کہتے ہیں؟ اور اب میرے سر میں درد ہے تو کون دبائے؟ تم کسی مرض کی دوا بھی ہو۔ یا محض دردِ سر ہی ہو؟"

بارش زور پکڑ گئی تھی اور یُوں برستی اچھی لگ رہی تھی۔ اُس نے سوچا ابکی دسمبر بھی گیلا ہی گُزرے گا۔"

وہ سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون ہے؟"

سسٹر مارگرٹ داخل ہُوئی۔

وہ پُوچھنے لگا: "خیریت تو ہے؟ مریض ٹھیک ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں" وہ کہنے لگی۔

"تب کیسے آئیں؟"

"اگر تُمھیں نیند نہ آرہی ہو تو میں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں"۔ مارگرٹ نے کہا۔

"ہاں ضرور" اُس نے مری ہوئی آواز میں کہا اور سوچنے لگا "یہ عالم

تنہائی اُوپر سے یہ اُور آہیں، پریشان کرنے کو۔ میرے سکون کا بھی کوئی لمحہ ہے۔"

مارگرٹ نے پُوچھا "تم ابھی تک سوئے نہیں؟"

وہ کہنے لگا "میرے سر میں درد ہے آج۔"

"میں دبا دُوں؟" یہ کہتی ہُوئی وہ آگے بڑھی۔

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "شکریہ، تم تکلیف نہ کرو۔ یہ دبانے سے نہیں جائے گا"___

مارگرٹ نے اُسے غور سے دیکھا۔ الگ تھلگ، چُپ چاپ، شفیق اور دلدار۔ وہ کہنے لگی "تُم۔ تم۔ مجھے اچھے لگتے ہو۔ نہیں۔ مجھے تُم سے محبت ہے۔"

وہ اُس کی بات پر جھلایا اور سوچنے لگا۔

"یہ یہاں اِسی لیے آئی تھی۔"

پھر اُس نے بڑے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"دیکھو مارگرٹ، یہ سب فضُول باتیں ہیں۔ ہم اکٹھے کام کرتے ہیں دِن بھر ساتھ رہتے ہیں۔ باہر کی دُنیا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اِس لیے ہم ایک دُوسرے کو اچھے لگنے لگتے ہیں۔ محبت کے چہرے ہوتے ہیں۔ یہ وہ چہرہ ہے جو ساتھ رہنے سہنے اور اچھے سلُوک سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے محبت نہیں درکار۔ میں اِس سے عاجز آچکا ہُوں۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں۔ اُن سے کرو۔"

مارگرٹ رونے لگی۔ وہ چُپکا لیٹا رہا۔ پھر کہنے لگا "تم فضول وقت ضائع کر رہی ہو۔ مریض سو رہے ہیں۔ تم کرسی پہ بیٹھ کے آرام کر سکتی تھیں۔ اور تم یہاں کیوں آگئیں؟ خوبصورت ہو، کم عمر ہو۔ وہاں یورپ میں ٹھکانے سے محبت کی ہوتی۔ شادی بیاہ کیا ہوتا۔ یہ تمھیں کیا سُوجھی؟"

وہ کہنے لگی: "میں یتیم خانے میں پلی تھی۔ میرا کوئی نہ تھا۔"

"مجھے افسوس ہے"۔ ایڈورڈ نے واقعی رنج سے کہا۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے چاہا تھا، محبت کرلُوں۔ میں نے چاہا تھا، شادی کرلُوں۔ مگر وہ سب ایسے ہی تھے۔ ہر جگہ مایُوسی اور دھوکا تھا۔" مارگرٹ نے کہا۔

"یہ تُم یقین رکھو۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اِنسانوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ دُنیا ایک دھوکا ہے۔ اِس کے دھوکے میں آنا نہیں چاہیے۔ اور محبت کا وہ مخصُوص چہرہ جس کے مُتعلق تُم نے سُنا ہوگا Fall in love آدمی اُس میں گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اُس کے گھٹنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور گرا ہُوا بھی کبھی اُٹھا ہے؟ اور گرتے ہُوئے کو بھی کسی نے تھاما ہے؟ ایسے فضُول خیالات دماغ میں نہ لایا کرو۔ جس کام کے لیے آئی ہو، اُسے خوش اسلوبی سے کرنے کی کوشش کرو۔ تمھاری نجات اِسی میں ہے۔ ویسے میں ہر نیک دل اور محنتی اِنسان کا دوست ہُوں ___ مجھے دوست ہی سمجھنا۔ اب جاؤ۔ دیکھو کوئی مریض نہ اُٹھا ہو۔"

باہر بارش ہوتی رہی اور کنول تالاب میں ڈوبتے رہے۔ ملاحوں نے

نرائن گنج گھاٹ پر کشتیاں باندھیں۔ اور اُسی میں لنگر کے پڑ گئے۔ بجلی کوندتی اور تڑپتی رہی۔ سینکڑوں باشا ٹپکتے اور گرتے رہے۔

یہ موسم اُس کے لیے صبر آزما تھا۔ مگر وہ اندر باہر بستیوں میں لوگوں کے صبر کا خیال کرتا رہا۔ "جن پہ اندر باہر بارش پڑتی تھی۔ اُن میں سے کچھ بیمار بھی ہوں گے۔" اُس نے سوچا اور خود کو بارش سے محفوظ پا کے بے چین ہوا کہ کیوں نہ وہ اُن عوام میں سے ہوا جو بھیگتے تھے اور یہ کہ "وہاں سکردو میں بہت سردی ہوگی۔ بہرحال تم محفوظ ہوگی۔ مگر تم بے پروا بھی ہو۔ پھر وہ سو گیا اور یہ اِس درجہ بے چین نیند تھی۔ کہ اُسے سو کے کوفت ہوئی۔

ماجدہ بظاہر موٹی ہوگئی تھی مگر اُس کا کوڑھ بہت بڑھ گیا تھا اور عنقریب اُس کے بچہ ہونے والا تھا۔ مدر مارگرٹ میری نے بہت سی چیزیں تیار کر دی تھیں۔ اُس نے تھوڑا سا کپڑا اور پیسے بھی مار۔ لیے تھے جس کا ایڈورڈ کو کوئی خیال نہ تھا۔

مارگرٹ ایڈورڈ کے ساتھ کپڑے لیے وارڈ میں داخل ہوئی۔ ماجدہ اسے دیکھ کے اُٹھ بیٹھی۔

"آج تو تم اچھی لگ رہی ہو۔ یہ لو۔ اپنے بچے کے کپڑے۔ مارگرٹ، ماجدہ کو کپڑے دکھا دو۔"

مارگرٹ اُسے کپڑے دکھانے لگی۔ اتنی بہت سی چیزوں کو دیکھ کے اُس نے دانتوں میں اُنگلی دبالی۔

"باپ رے باپ۔ ہم کھواب میں بھی کبھی ایسا کوپڑا نہیں دیکھا۔ ہمرا بچہ ایک دم بڑا آدمی کے بچے کے ماپھک ہو جائے گا۔ ہمرا آنکھ کو یقین نہیں آنے سکے گا۔" اُس کے کوڑھ سے بگڑے ہوئے چہرے پر یہ کربناک خوشی پھیل گئی۔

ایڈورڈ نے ٹھنڈی سانس بھری اور سوچنے لگا "کتنی مائیں ہیں جنھیں

دولت کے انباروں میں یہ خوشی میسر ہی نہیں۔ وہ کیا جانیں خوشی کی وقعت؟"
وہ کہنے لگا۔ "دیکھو ماجدہ، میں جھوٹ تو نہ کہتا تھا کہ تم اچھی ہو جاؤ گی۔
بس تھوڑے دن تمھارا بچہ تم سے الگ رہے گا۔"

ماجدہ نے خوشی میں مگن ہو کے لمبی سی ہاں کر دی۔ اُمیدوں کے
چراغ اُس کی آنکھوں میں جلتے تھے۔ آج اُسے اپنی صحت یابی کا یقین
ہو رہا تھا۔

"ہاں صاب، تم جیسا بولے گا ہم کرتے سکے گا۔ صاب ہمارا بچہ
کا تقدیر۔ اِدھر آکے چاند کے ماپھک ہو گیا۔ صاب، تم ہمارا ماں باپ ہو۔"

وہ سوچ رہا تھا "اِس خوشی کو کیا نام دوں۔ اِس کا کس سے موازنہ
کروں؟"

ایڈورڈ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اُس نے مُنہ پھیر کے آنسو پیے اور
لمبے لمبے ڈگ بھرتا دُوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔

اُسے پتا تھا کہ ماجدہ نہیں بچے گی۔ مگر اپنے خیال میں وہ اُسے صدمے
سے بچا رہا تھا۔ اور اُس میں بچہ پیدا کرنے کی ہمت پیدا کر رہا تھا۔
لیبر روم کی طرف جاتے جاتے اُسے خیال آیا "آتشدانوں میں آگ
روشن ہو گی۔ دُور یورپ میں اور ہندوستان کے پہاڑوں پر برف کے
پھول گرتے ہوں گے۔ ہوا چیڑ کے درختوں میں سائیں سائیں کرتی ہو گی۔"
مُدت پہلے کے منائے ہُوئے کرسمس اُس کی نظروں میں گھوم گئے۔

ممی اور پیٹر کے یورپ میں کرسمس منانے کا اُسے خیال آیا۔

تب اُس نے کرسمس پر گائے جانے والے نغموں کی آواز سُنی۔ گرجوں
میں راہب اور راہبائیں سرنگوں تھے۔ رات خاموش اور مُقدس تھی۔
وقت ٹھیر گیا۔ مہتاب پر سے بادل چھٹ گئے۔ نرم اور خنک روشنی
پھیل گئی۔

مرتی مارتی، چیختی چنگھاڑتی، گاتی بجاتی، ہنستی کراہتی دُنیا میں غالباً وہ
نبی پیدا ہو گیا جو کوڑھیوں کو شفا اور اندھوں کو بینائی اور مُردوں کو حیات
بخشتا تھا۔ اور یہ وہ رات ہے جبکہ ربُّ العزت نے مریم سے فرمایا "اے مریم
تُم صبر کرو۔ اور اِس درخت کو مضبوطی سے تھام لو تمھاری تکلیف کم ہو جائے
گی۔ اور یہ رات مریم کی تکلیف کی رات تھی۔ مگر یہ رات بہت سی راتوں
سے بزرگ و برتر ہُوئی۔" اُس نے سوچا اور غور سے کیرل سُنے۔
"ہولی نائٹ، سائیلنٹ نائٹ"۔

اور یہاں موت ارزاں تھی اور زندگی گراں۔ مُقدس اور خاموش
رات۔ بزرگ و برتر رات۔ یہ وہ رات ہے جبکہ وہ پیدا ہُوا۔ ابنِ
مریم۔ امنِ عالم کا علمبردار۔ اور ابنِ مریم اب موجُود نہ تھا۔ اِس لیے
ہر شخص کو، خُود اُس کو بھی، اُس نے سوچا، اپنی صلیب خود اُٹھانا تھی۔
دُکھیوں کا چارہ گر اب موجُود نہ تھا۔ مگر پھر اُس نے یقین سے سوچا کہ
ہر سال وہ اپنے مُعجزوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

اور یہ سوچ کر وہ تیز تیز قدموں سے لیبر رُوم میں داخل ہو گیا، جہاں

موت زندگی کی گھات میں تھی۔ "برگزیدہ رات"۔ دروازے میں ٹھٹھک کے
اُس نے چپکے سے دُعا مانگی۔

"اے خدا، تُو اُس خاص بچّے کی پیدائش کی برکت میں اِس بچّے کو
صحیح وسلامت پیدا کیجیو۔ اے خُدا، اُس خاص مُعالج کے توسّط سے،
جس کی پیدائش کا یہ دن ہے، مجھے بھی ہمّت دے۔"

ماجدہ کی آنکھیں اپنے مُعالج کو تلاش کر رہی تھیں۔ "فادر صاحب"۔
اُس نے بیقراری سے پکارا۔

"میں آگیا۔ ہمّت سے کام لو۔ مریم نے بھی بڑی تکلیف اُٹھائی تھی۔
پھر خدا نے اُسے ہمّت دی۔ خدا تمھیں بھی ہمّت دے گا۔ اُس نے صبر
کیا تھا، تم بھی صبر کرو۔ اُسے لوگ ستاتے تھے۔ تمھیں بیماری پریشان
کرتی ہے۔ شاباش۔"

اُس کے پیروں کے پاس مدر ونسنٹ پچاس سالہ مڈوائف اور
اُن کی اسسٹنٹ سسٹر برکمن کھڑی تھی۔ اُس نے اُن سے اشارے
سے پُوچھا۔ انھیں بڑی دقت پیش آرہی تھی۔ ماجدہ کے اعصاب بیکار
تھے۔ اُس نے تڑپ کر چیخ ماری "فادر صاب"۔

"خدا کا نام لو۔ مجھے مت پکارو۔ وہ تمھاری مدد کرے گا۔ تم تو
بڑی بہادر ہو۔ دُنیا جہان کی ماؤں سے زیادہ بہادر۔ شاباش۔"

ماجدہ نے اُس کی کلائی میں دانت جما دیے اور وہ چپکا کھڑا سوچتا
رہا۔ اے خدا، ایک ناتواں بیمار جسم سے تو کتنی سخت آزمائش لے رہا

ہے اور دیکھ یہ اُف تک نہیں کرتی۔ تُجھے کچھ نہیں کہتی۔ اِس کی ہمّت دیکھ
اِس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ زیورات، نہ روپیہ، نہ تندرستی۔ پھر بھی یہ
تُجھ سے کچھ نہ دینے کا گلہ نہیں کرتی۔ یہ تیرے صابر اور بیکس بندے۔
اے خُدا رحم کر۔"

"فادر صاب" ماجدہ نے پُکارا۔

"میں تمھارے پاس ہُوں۔ بہت قریب۔ بس تھوڑی سی دیر کی
بات ہے۔ ہمّت کرو۔" اُس نے آگے بڑھ کر مدر ونسنٹ سے کچھ پُوچھنا
چاہا تو ماجدہ چلّا پڑی "فادر صاب تم نہ جانا۔"

"میں کہیں نہیں جاتا۔ اُس نے اُسے اطمینان دلایا اور ہر بار اُس کی
آواز پر ماجدہ ہمّت کرتی تھی اور پھر خُدا نے اُس پر رحم کیا اور بچّہ صحیح و
سلامت پیدا ہوگیا۔

سسٹر بچّے کو نہلا دُھلا کے، کپڑے پہنا کے لائی تو ایڈورڈ نے بڑھ کر
اُسے اپنے بازُوؤں میں لے لیا۔ پہلی بار زندگی میں کسی نوزائیدہ بچّے کو
اُس نے گود میں لیا تھا۔ وہ بڑے پیار سے اُسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔
"تو اِسے تخلیق کہتے ہیں۔ حیات اِس درجہ تکلیف سے وجُود میں آئی کہ
موت ششدر رہ گئی۔ خُوب!"

بچّے کو وہ ماجدہ کے قریب لایا "لو دیکھو، اپنا بچّہ۔ بالکل تندرست
ہے۔" پھر وہ اُسے باہر لیجانے لگا۔ وہ چُپ لیٹی رہی۔ حالانکہ وہ اُس
کی آواز سُننے کو ترستا تھا کہ شاید وہ پکارے مگر وہ ضبط کا دامن تھامے

رہی -

پھاٹک پر اُس نے بچّے کو اُس کے باپ، نانی اور خالہ کے سپرد کیا۔ سسٹر نے کپڑوں کا بنڈل دیا۔ وہ چند لمحوں تک جاتا دیکھتا رہا۔ اور پہلی بار اُس نے خواہش کی "کاش، میرا بھی کوئی بچّہ ہوتا۔"

ماجدہ وارڈ میں آگئی تھی۔ اُسے لیٹا دیکھ کے وہ دروازے پر ٹھٹھک گیا۔ "خالی ہاتھوں اُس کے پاس جاتا ہُوں۔ میں اُسے کیا جواب دُوں؟" کائنات کے آنسو اُس کی آنکھوں میں سمٹ آئے، جنھیں وہ وہیں دروازے میں کھڑا پیتا رہا۔ سسٹر فریز کے ہاتھ میں انجکشن تھا۔ "یہ میں لگاؤں گا" اُس نے سسٹر سے کہا اور سوچنے لگا "یہ تکلیف بھی میں ہی اُسے دے دُوں تو بہتر ہے۔" مگر آج ماجدہ نے انجکشن لگواتے وقت سسکاری نہیں بھری۔ وہ چُپ چاپ لیٹی دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ تسلّی بھی تو اُسی کو دینا تھی۔

ماجدہ نے اپنے دِلدار مُعالج کو دیکھ کے ضبط کا دامن چھوڑ دیا اور پٹّی پر سر رکھ کے آنسو بہانے لگی۔ وہ اُس کا سر شفقت سے سہلاتا رہا۔

"چلو، اچھا ہے یہ بہہ جائیں۔ مگر میں اِس سے کیا کہوں؟ الفاظ بے کار ہیں اور نہ میرے پاس ہیں۔"

پھر اُس نے کہا اور اُسے اپنی آواز اجنبی لگی :۔

"ماجدہ بس کرو۔" اِس سے آگے باوجُود کوشش کے وہ کُچھ نہ کہہ سکا۔ زندگی کی شمع یک لخت اُس نے ماجدہ میں گُم ہوتے دیکھی اور وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

رات کو اُس نے مارگرٹ کی اِطّلاع پر اُٹھتے ہُوئے دل میں کہا "مُجھے معلوم تھا وہ نہ بچے گی۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی اور زندگی نے بغیر پس و پیش کیے پہلے ہی مَوت کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ افسوس میں اُسے بچا نہ سکا۔"

مگر وہ عیسٰی تو نہ تھا جو مُردے جِلاتا۔ وہ تو محض مُعالج و چارہ گر تھا۔ ذرا سی مسیحائی رہی تو اُسے عطا ہُوئی تھی۔ ساری رات وہ اُس کے پاس بیٹھا رہا اور شہادت دیتا رہا کہ زندگی ہر حال میں مَوت سے لڑتی رہی۔ مُعالج اور مریض دونوں قضا و قدر کے آگے بے بس رہے۔ یہ فتح قُوّت کی تھی۔ کیونکہ موت زندگی سے قوی ہے۔

صُبح کو وارڈ سے اُسے تھکا ہُوا آتے دیکھ کے سسٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر ہمفری، اِن لوگوں کے لیے آپ اِتنی جان سوزی کریں گے تو خود علیل ہو جائیں گے۔ یہاں تو موت کی اِفراط ہے۔ کِس کِس کے نوحے پڑھیں گے؟"

"ہُوں"۔ اُس نے کہا اور سر جُھکائے چُپ چاپ بھاری قدموں سے وہ اپنے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔

"سسٹر برکمن، یہ تُم اِس لیے کہہ رہی تھیں کہ یہ جسم بیماری کے علاوہ اِفلاس زدہ بھی تھا۔ یہی جسم اگر ریشم و کمخواب میں لپٹا ہوتا اور کسی

موڑ سے اُتارا جاتا تو تُم اسے پھولوں کی طرح اُلٹتیں پلٹتیں اور شیشے کی طرح چھوتیں اور خود بھی نوحہ خوانی کرتیں۔ پھر تمھیں ڈاکٹر ہمفری کی صحت کا خیال نہ آتا۔ شاید تمھیں یہ نہیں معلوم' کیونکہ تمھاری بائیبل لاطینی میں ہے' کہ خود عیسٰی کو ناتواں جسم' کُملائے ہُوئے شکستہ دل' بہت عزیز رہے۔ اور جب بھی اُنھوں نے اُسے تڑپ کے پُکارا وہ اُن کے قریب آ گیا۔ مجھے بھی یہ زخم خوردہ چُور چُور جسم' یہ شکستہ دِل' بہت عزیز ہیں۔ میں اِن سے غفلت برتنے نہیں آیا ہُوں۔ میرے لیے یہ زر و سیم میں تُلتے ہُوئے جسموں سے زیادہ قیمتی ہیں" ــــ وہ پلنگ پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

اُس کا دِل محزُون تھا۔ وہ واماندہ اور تھکا ہُوا تھا۔ آج اُس نے فرانسس سے چائے بھی نہیں مانگی تھی۔ دراصل اُسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں دو منظر گھُوم رہے تھے۔ بچّے کو ماں سے علٰحدہ کرنا اور زندگی اور موت کی کشمکش۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اِس منظر سے کیسے نجات پاؤں؟ کوئی صُورت نباہ کی بھی ہے اِس زندگی سے۔ اِس اُلجھن سے نجات کیسے پاؤں؟" سوچتے سوچتے وہ اُٹھا۔

"آخری منزل تُم ہی تو ہو"

اور پھر آج وہ مُدّت کے بعد اُسے خط لکھنے بیٹھا۔

"میں تمھیں کیا لکھوں۔ آج دُنیا میری نظروں میں ٹوٹ پھوٹ کے بکھر گئی ہے اور میں ریزہ ریزہ ہو رہا ہُوں۔ تُم ہوتیں تو دیکھتیں کہ آج ایک ایسی ماں مر گئی جس نے کوڑھ کی اذیّت اور مفلوج اعصاب کے ساتھ موت سے جنگ کی اور ایک ہستی کو جنم دیا۔ جس نے اُبلتے آنسوؤں کو بارہا خاموشی سے پیا کیونکہ اُن کو کوئی پُوچھنے والا نہ تھا اور بیماری میں اُس نے زندگی سے محض اس لیے چھٹکارا حاصل نہ کیا کہ اُسے اپنا

بچّہ پیدا کرنا تھا۔ جس اولاد کی خاطر اُس نے جدّوجہد کی اُسے وہ اپنے ہونٹوں سے پیار نہ کر سکی۔ کیونکہ ان سے اُسے جراثیم لگنے کا خطرہ تھا۔ آفریں ہے اُس ماں پر جو موت و حیات کی کشمکش میں تخلیق کرتے وقت صابر رہی۔ پتا نہیں اُس میں اِتنا ضبط اور اِتنی ہمّت کہاں سے آگئی تھی! بہرحال اُس نے جامِ شہادت پیا اور وہ زندہ رہے گی۔ تُم نے دیکھا ایک ناتواں دِل کیسے کیسے الم سہتا ہے۔"

"اور آج میں تُمھیں طرح طرح کے القاب سے یاد کر رہا ہُوں۔ وہ اِس لیے کہ میں بھی اِنسان ہُوں اور مُجھے بھی کِسی کا سہارا چاہیے ہے۔ اور جانِ من! وہ تُم ہو۔ اِس خط کا جواب مُجھے درکار ہے۔ افسوس کہ یہاں کوئی محسُوس کرنے والا نہیں۔ یہ سب مشینیں ہیں جو چل رہی ہیں۔ مگر تُم میری آنکھوں سے دیکھتی ہو۔ اِس لیے میرے دِل سے محسُوس بھی کرو گی۔ ساری بات محسُوس کرنے ہی کی تو ہے۔ وہ کیفیّت بیان کرنے سے زبان اور قلم قاصر رہے گا۔ وہ کیفیّت ایسی تھی۔

تُمھارے خط کا مُنتظر ایڈورڈ

یہ خط اُس نے باہر سے آنے والے قاصِد سے سپُردِ ڈاک کروایا۔ اور جیسے اُس کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ کپڑے اور جُوتے پہنے پہنے سو گیا۔ آج پہلی بار، ایک عرصے کے بعد، وہ غافل نیند سویا تھا۔

اُسے زُہرہ کے خط کا انتظار رہا۔ ڈاکیے کی راہ میں اُس کی آنکھیں لگی رہتیں اور آج اُس کا خط مِلا۔ اور اِن چند الفاظ سے اُسے ایسا لگا جیسے دماغ سے کِسی نے کانٹا نکال دیا ہو۔ جیسے جلتے ہُوئے زخموں پر کسی نے پھاہا رکھ دیا ہو۔ اُس نے لکھا تھا:

"ایڈورڈ، جس دِن تُم نے مجھے خط لکھا تھا، اُس رات اور سارے دن میرا دِل تمھاری طرف سے پریشان رہا تھا۔ اِس لیے کہ تُم پریشان تھے۔ میں تمھارے پاس ہُوں۔ تُم مُجھے پُکارو۔ میں بولُوں گی۔ یہ سعادت تُمھیں دی گئی کہ تُمھارے ہاتھوں سے مریضوں کو سہارا مِلا۔ وہ تُمھارے مُنتظر تھے۔ اُنھوں نے تُمھیں پالیا۔ اور میں نے بھی تُمھیں کھویا نہیں۔ خُدا نے تُمھیں اِس چارہ گری کے عوض اِتنی آفاقیت بخشی کہ تُم یہاں بھی ہو اور وہاں بھی۔

زُہرہ

رات کے سنّاٹے میں، برستے پانی میں، اور کھِڑکی میں سے آتے ہُوئے ہوا کے جھونکوں میں رات کی رانی مہکتی تھی۔ وہ کئی دن بعد قدرے آرام اور سکُون سے لیٹا تھا۔ پر اُس کی طبیعت ماندی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُسے کوڑھ لگ گیا ہے۔ مگر اُسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ آرام سے اُسی طرح کام کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اپنا علاج بھی کر لیتا۔ مگر کھُلے ہُوئے زخموں کی اِس درجہ چارہ گری اور بے تکان محنت اُسے صحت یاب ہونے کے بجائے بتدریج بیمار کر رہی تھی۔

اِس وقت بھی اُسے کوئی تکلیف نہیں تھی بس اعصاب پر تھکن طاری تھی، جیسے منوں بوجھ رکھا ہو۔ ذہن کے گوشوں میں یادوں کے ہنگامے اُسے تھکائے دیتے تھے۔ ایک دبی دبی سی تمنّا تھی کہ مرنے

سے پہلے اسے دیکھ سکتا۔ اس کیفیت سے اُلجھ کر اُس نے دیوانِ حافظ اُٹھایا اور آنکھیں بند کر کے کتاب کھولی "دیکھوں کیا کہتا ہے" تب مجذوب نے کہا:

He sought a lodging in the grave too soon, Death won the game, Hafiz can loose no more.

اور باہر پانی کی چادر اُوپر سے گِرتی تھی۔ تب اُس نے مُسکرا کر کہا "مجذوب ٹھیک کہتا ہے۔

Death won the game, Hafiz can loose no more.

بس بات یہی ہے کہ ہر حال میں اور ہر جگہ موت نے بازی جیتی۔ حافظ، خیام، مَیں اور سب ہارتے رہے، ہارتے رہے۔ کسی نے جلدی اور کسی نے دیر میں قبر کو مسکن بنایا۔ اور جان سے زیادہ کوئی کیا ہار سکتا ہے۔

موسمِ گُل کی صبح بے تعلّقی سے مُسکرائی۔ یہ بہار تھی۔ چڑیوں نے نئے پر نکالے تھے۔ درختوں میں نئی کونپلیں پھُوٹی تھیں۔ اُوپر آسمان نے نئی لاجورد کی چادر اوڑھی تھی۔ پُرانے چولے اُتار کے پھینکے گئے

اور نئے چولے زیبِ تن کیے گئے۔ بادل کی کشتی بُوڑھا ملاح کھیتا کھیتا دُور لے گیا۔

کھڑکیوں پر موسمِ بہار کے پھُول مُسکراتے تھے اور وہ اوڑھے لیٹا تھا۔ فرانسس سے اُس نے پہلُو کی کھڑکی کے پردے سرکوائے تاکہ ہسپتال کی نئی عمارت نظر آسکے۔ عمارت کی نئی نئی سُرخ اینٹیں مانگ میں لگے ہُوئے سیندور کی طرح نکھری ہُوئی تھیں۔ اُس نے ایک ذرا سر اُٹھا کے نئی عمارت کو دیکھا اور اطمینان سے گہری سانس لی۔ پھر اُس نے فادر ہنری سے پُوچھا جو اُس کی خیریت پُوچھنے آیا تھا "کیا ابھی مریض اس میں نہیں آئے، ہنری؟"

"کچھ پہنچ گئے ہیں۔ کچھ کل اور پرسوں تک آجائیں گے۔ پلنگوں کی کمی تھی۔ آج تیس پلنگ اور آگئے ہیں۔"

"نیا بوائلر اور سٹربلائزر لگ گیا؟ آپریشن تھیٹر ٹھیک ہوگیا؟" اُس نے پُوچھا،

"آپ کی ہدایت کے مُطابق سب کچھ ہوگیا ہے" ہنری نے کہا اور رنجیدہ ہُوا۔

مدّت سے وہ سب ساتھ کام کر رہے تھے۔ [illegible] تقریباً سب ہی کو اُس سے محبت ہوگئی تھی۔ اور ہنری کا اپنا دِل بھی بُرا نہ تھا۔ اِس وقت اسے بیماری کی حالت میں ہسپتال کے متعلق دریافت کرتے دیکھ کے اُس کو واقعی رنج ہُوا۔

عمارت میں یہ توسیع ایڈورڈ نے کرائی تھی۔ اُس کو تعمیر ہوتے دیکھ کر
اُسے تسکین اور خوشی ہوتی تھی۔ ایک ایک اینٹ سے اُس کا تعلق تھا۔
وہ اپنے مریضوں کو اِس میں خود منتقل کرنا چاہتا تھا اور جب وہ
مکمل ہوگئی تو صحت اُس سے رُوٹھ گئی۔ پر اُسے اِس کی کوئی فکر نہ تھی۔
وہ صرف مریضوں کا آرام چاہتا تھا۔ ہر ہر بات کی اُس نے تفصیل پُوچھی
اور اب وہ مطمئن تھا۔

پھر اُس نے پُوچھا "نیا سرجن کیسا ہے؟ دِلچسپی سے کام کرتا ہے۔
نمبر ۱۱ کا آپریشن کیسا رہا؟

ہنری نے اُسے بتایا کہ نمبر ۱۱ کا آپریشن کامیاب رہا۔ تو اُس نے
پُوچھا: "اُس کے ہاتھ کارآمد ہوگئے ہیں؟ اُن کی صُورت تو نہیں بگڑی؟"

"دیکھنے میں اِتنے اچھے نہیں ہُوئے جتنے آپ کی سرجری سے
ہوجاتے تھے۔ مگر کارآمد ہوگئے ہیں۔" ہنری نے جواب دیا۔

تب وہ کہنے لگا "نئے سرجن کو میرے پاس بھیجنا۔ میں اُسے کچھ
پوائنٹس بتاؤں گا۔ میرے پاس جُذام پر دو بہت اچھی کتابیں ہیں۔ اب
وہ میرے بے کار ہیں۔ اُس کے کام آئیں گی۔"

جب تک وہ کام کرنے کے قابل تھا، کرتا رہا، پھر اُس کے اعصاب
جواب دینے لگے۔ آپریشن کرنا چھُوٹا، آہستہ آہستہ چھوٹے موٹے
کام بھی ختم ہوئے اور اب تو قویٰ بھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مگر اِس کا
اُسے افسوس نہ تھا۔ صرف کبھی کبھی وہ رنج سے سوچتا کہ وہ کارآمد

نہیں رہا اور ڈاکٹر ہوتے ہُوئے اُس کی خدمات سے مریض محروم
ہیں۔

ہنری کے جانے کے بعد اُس کے کانوں میں یہ الفاظ گونجے "اور
میں نے بھی تمھیں کھویا نہیں"

یہ الفاظ اُس کے ماؤف ہوتے ہُوئے ذہن میں گھومتے رہتے۔
وہ اکثر تکیے پر سر رکھ کے اُسے پُکارتا اور شاید اُسے جواب بھی ملتا تھا
کیونکہ وہ مُسکراتا تھا۔ اُس کا چہرہ خراب ہو چُکا تھا مگر اب بھی اُس
کی مُسکراہٹ دِلکش تھی۔

زُہرہ کا وہ خط اُسے آج بڑی شدّت سے یاد آرہا تھا، جس
میں اُس نے لکھا تھا: "تمھیں بھی اپنی نجات کا ذریعہ مِل گیا ہوگا۔
تم بھی مصروفیت میں مجھے بھُول جاتے ہوگے۔"

وہ اُس کے خط کا ایک ایک نقطہ ذہن میں دُہرا رہا تھا۔ اور
لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اُس نے بالکل اُسی کی طرح
بدلہ چُکایا تھا۔ وہ دِل میں کہنے لگا "اور مُجھے تمھارا بدلہ چُکانے
کا اب بھی ارمان ہے۔ مگر جانِ من، اب تو یہ حال ہے، کہ
چاہُوں بھی تو خط نہیں لکھ سکتا۔ ہاتھ ساتھ نہیں دیتے۔ ارادے
میں بھی پُختگی نہیں رہی۔"

سسٹر مارگرٹ اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ اُس نے مارگرٹ
سے کہا۔ "مُجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں سوچنا

چاہتا ہُوں، صرف اُس کے مُتعلق جو مجھے اِس اذیت میں بھی یاد آتی ہے۔ فرانسس سے کہنا میرے لیے چائے لیتا آئے۔

مارگرٹ کے جانے کے بعد اُس نے شروع سے ایک ایک بات سوچنا شروع کی۔ سینما کی طرح منظر آتے اور جاتے رہے۔ پھر اُس نے کہا "یُوں تمھارے متعلق سوچنے سے مجھے کتنی تسکین مِل رہی ہے۔ شکر ہے کہ میں تنہائی کی سُولی سے باز رہا۔ جب میں چھوٹا تھا، تب بھی میرا دِل تمھیں ڈھونڈتا تھا اور جب میں رائل انفرمری میں پڑھا کرتا تھا، تب بھی ایک کشش تھی جو مجھے تمھاری طرف کھینچتی تھی۔ تُم مجھ میں موجود تھیں۔ ہمیشہ سے۔"

فرانسس چائے لایا تو وہ کہنے لگا "مریض میرا اِنتظار کرتے ہوں گے۔ ارے، یادداشت اِتنی خراب ہوگئی ہے۔ میں تو بیمار ہوں اور کب سے مُعطل لیٹا ہُوں۔ سوائے تمھارے اور کُچھ اگلا پچھلا دھیان ہی میں نہیں رہتا۔ دماغ ماؤف جو ہو رہا ہے۔"

چائے پیتے پیتے اُس کی نظروں میں وارڈ میں لیٹے ہُوئے مریض گھُوم گئے۔ وہ پھر بھُول گیا اور اُٹھنے لگا۔

"فادر صاحب، کہاں چلے؟" فرانسس نے پُوچھا۔

"اوہ، میں بھُول جاتا ہُوں۔ بالکل یاد نہیں رہتا کہ مجھے کام نہیں کرنا۔" اُس نے کہا۔

پھر وہ فرانسس سے پُوچھنے لگا "نئے سرجن سے کسی کو کوئی

شکایت تو نہیں؟ نرمی کا برتاؤ کرتا ہے نا؟"

وہ ابھی یہ پُوچھ ہی رہا تھا کہ نیا سرجن داخل ہُوا۔ اُس نے اُس سے کہا۔ "میں نے تمھیں اپنے فرائض، اپنے مریض اور اپنی کتابیں سونپیں۔ خُدا کرے تم کامیاب سرجن ثابت ہو۔ اُمید ہے مریضوں سے نرمی برتتے ہو گے۔"

پھر وہ اُسے پلاسٹک سرجری پر اہم نکات سمجھاتا رہا۔ اُس نے کہا نہ صرف اعضا کو کار آمد بنانا ضروری ہے بلکہ اُنھیں خوبصورت بھی بنانا چاہیے۔ اُنھیں نقصان نہ پہنچے۔

اِسے اُس وقت اپنے مریض بہت یاد آئے اور اُس کا دل چاہا کہ خود جا کر اُسے ایک آپریشن کر کے دکھائے۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کیں اور دھیرے سے کہا "ہُوں۔"

سرجن نے چلتے وقت اُس کا بھی مُعاینہ کیا۔ وہ حیران تھا کہ اِس کی بینائی اب تک کیسے سلامت تھی۔

لیکن نئے سرجن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ نہ صرف بینائی، بلکہ مُعطل ہوتے ہُوئے دماغ کے دو حِصّے بھی زندہ تھے۔ ایک وہ جس میں وہ رہتی تھی۔ دُوسرا وہ جو ہسپتال اور مریضوں سے مُتعلق تھا۔

وہ فرانسس سے کہنے لگا "ذرا جا کے دیکھو۔ شاید کسی کا آپریشن ہُوا ہے۔ کوئی کراہتا ہے۔"

فرانسس کو نئے سرجن کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ اُس سے
بحث نہ کرے ۔ جو وہ کہے کر دیا کرے ۔ کیونکہ اُس کا دماغ تقریباً ماؤف
ہو چکا تھا اور وہ بہکنے لگا تھا ۔

وہ جھوٹ مُوٹ اُٹھ کے گیا اور آ کے کہنے لگا ۔ "نہیں فادر
صاب، سب ٹھیک ٹھاک ہے"۔

"اچھا" اُس نے کہا ۔

فرانسس نے دیکھا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے ۔
وہ کہہ رہا تھا ۔ "ہائے یہ عالمِ تنہائی! تمھیں پتا ہے کہ ایڈورڈ کا
تو چہرہ بھی اُس کے دل کی طرح داغ داغ ہو گیا ہے ۔ اب آئی
ہو تو کیا ۔ آنکھیں بے نُور ہُوئی جاتی ہیں، مگر میں تو تمھیں ذہن کی
آنکھوں سے دیکھتا ہُوں ۔ ایک تمھیں تو ہو جس کا چہرہ صاف و
شفاف ذہن میں اُبھرتا ہے ورنہ میں تو اپنی ماں تک کا چہرہ بھول
گیا ہُوں ۔ تم میرے پاس ہو ۔ بہت قریب ۔ تم بولتی بھی ہو
اور میں سُنتا بھی ہُوں ۔ اِس تمھاری آواز نے میرے پاس آنے
کو ہمیشہ فاصلہ طے کیے دیکھو، یہ روشنی میں اب بھی تھامے
ہُوں جو تم نے دی تھی ۔ اِسی نور سے میری آنکھیں مُنور ہیں ۔
یہی تو وہ روشنی ہے، جسے لوگ بینائی کہہ رہے ہیں ۔ نیا سرجن حیران
ہے کہ میری بینائی اب تک کیسے برقرار ہے ۔ میں اُسے کیسے
سمجھاؤں کہ معجزے بھی تو ہوتے ہیں ۔ جانِ من تم میری زندگی

میں معجزہ ہی تو تھیں"۔

پھر اُس نے فرانسس سے کہا "دیکھو، کوئی کراہ رہا ہے ۔
جاؤ، بہانہ مت کرو"۔

فرانسس وارڈ میں گیا تو واقعی ایک مریض، جس کا آپریشن
ہُوا تھا، بہت تکلیف میں تھا ۔ مگر وہ کراہ نہیں رہا تھا ۔
رو رہا تھا ۔ چُپکے چُپکے ۔ تب فرانسس نے سسٹر مارگریٹ کو
بتایا ۔ اُس نے مریض کو درد کی گولی دی اور اُسے تسلی دینے لگی ۔

پھر وہ سوچنے لگی :

دُور کمرے میں بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر ہمفری کو یہ سب خبر کیسے ہو
جاتی ہے ۔ اُن کی تو سماعت بے کار ہو چکی ہے ۔ مگر ڈاکٹر ہمفری!
تمھارے کانوں تک میرے دل کی آواز نہ پہنچ سکی ۔ یہ بھی سمجھنے کی
بات ہے ۔ شاید اس میں کوئی موجود ہے ۔ مگر میں تمھیں اس لیے
نہیں چاہتی کہ اس کے عوض تم مجھے چاہو ۔ مجھے تم سے کچھ لینے کا
ارمان ہی نہ تھا ۔ معلوم نہیں محبت کا یہ کون سا چہرہ ہے ۔ میں تم
سے کیا پوچھوں ۔ یہ باب تو کھلنے سے پہلے ہی تم نے بند کر دیا تھا ۔
مگر یہ باب میرے ذہن میں بند نہیں ہوا ۔ میں تو اُس دل سے
محبت کرتی ہُوں جو شفقت سے دُکھیوں پہ جھکا کرتا تھا،
جو دلدار تھا اور اب بھی دلدار ہے ۔ جو اب بھی دُکھیوں کی طرف
سے فکرمند ہے ۔ تم مجھے بڑی ذمہ داری کا کام سونپ کے جا رہے

ہو۔ جب بھی کسی مریض سے غفلت کی جائے گی تُم میرے سامنے ہوگے۔ مگر میں تمُھارا سا دِل کہاں سے لاؤں۔ تمُھارے ہاتھوں کی نرمی اور آرام کہاں سے لاؤں۔ یہ تمُ تھے جسے عیسیٰؑ کی مسیحائی عطا ہُوئی تھی۔ اور جو شفا کا پیغام، صحت کا جام لے کر اِس ہسپتال میں داخل ہُوا تھا۔ تمُھاری نبض اِس ہسپتال میں دھڑکتی رہے گی۔ تم یہاں موجُود رہوگے۔ تمُ یہاں ہمیشہ محفوظ رہوگے کیونکہ تمُ امر ہو۔"

اُس صُبح بھی نئے سرجن نے اس کا مُعاینہ کیا اور اپنے اسسٹنٹ برادر سے کہا "اب تک اس کی بینائی باقی ہے۔ کمال ہے۔ اگر ڈاکٹروں کو بتایا جائے تو وہ یقین نہیں کریں گے۔"

سرجن اُس پر جُھکا ہُوا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اپنی بے چارگی پر۔ اُس نے سوچا "کبھی میں بھی اِسی طرح اپنے مریضوں پر جُھکا کرتا تھا۔ مگر یہ ہاتھ اب بے کار ہیں۔"

پھر اُس نے فرانِسس سے کہا "یہ الماری کھولو۔ کوٹ کے اندر کی جیب میں دُو خط ہیں۔ وہ نکال لاؤ۔"

فرانِسس نے بڑے دُکھ سے کہا۔ "فادر صاحب آپ ابھی پڑھ سکتے ہیں؟"

"کیا کہا؟" ہاں پڑھ سکتا ہُوں۔ صِرف یہ خط اور یہ الفاظ۔ شاید اِس لیے کہ یہ مجھے حفظ ہیں۔

وہ ایک ایک لفظ پڑھتا رہا اور مُسکراتا رہا۔ "یہی میری حیات ہے اور یہی میری فنا۔ اور ہاں، اب بھی بدلہ چکانے کا خیال ہے۔ مگر قیامت کے دن۔ تُم وہاں قریب تر ہوگی نا۔" اُس کی آنکھوں میں

آنسو بھر آئے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور شدید اذیت سے انھیں پیتا رہا۔

زندگی اور موت کی کشمکش میں بھی وہ اُسے یاد کرتا رہا اور چپکے سے کہنے لگا: "یہ آنسو کبھی نہ بہے۔ ایسا کرتے بُرا لگتا تھا۔ یہ غم عزیز تھا نا۔ گو کہ انھیں پینے میں مجھے تکلیف بہت ہوئی۔ اور اب تو دل اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ہر بار جب آنسو پیتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے دل سے خون ٹپک رہا ہو۔ یہ اشک غم میں پنہاں رہے اور دن کی روشنی میں نہ جھلملائے۔ تم میرے قریب ہوتیں تو اچھا تھا۔ ہائے، کتنی محرومی کی موت ہے۔"

ایک دم اُس نے ہسپتال کی نئی عمارت کو دیکھا اور مسکرایا: "یہ میں ہوں۔"

فرانسس نے اُس کی آنکھیں بند کرنی چاہیں۔

"رہنے دو انھیں۔ میں ابھی اسے، جو میرے سامنے کھڑی ہے، دیکھ سکتا ہوں۔" اُس نے تقریباً ہچکیوں میں کہا۔

فرانسس آنکھیں بند کرتا تھا اور وہ کھول لیتا تھا۔

پھر اُس نے آخری بار آنکھیں کھولیں "فرانسس، یہ دونوں خط میرے کفن میں رکھ دینا۔"

موسمِ بہار کا جھونکا روتا ہوا گزر گیا۔ گندھ راج کی خوشبو سوگوار تھی۔ انھوں نے کہا "وہ جاتا ہے جس کے ہم منتظر تھے۔ مگر وہ آیا تو تھا۔"

شاید۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔"

دس سال بعد اُس نے ہسپتال چھوڑ دیا۔ وہ ختم ہو گیا، جس نے ایک بار محبت کی تھی۔ اُس کے پہلو میں حافظ کے یہ اشعار کھلے تھے۔

Death won the game, Hafiz can loose no more

دیر سے کوئی پرندہ نئی عمارت کے چھجے پہ شور مچاتا تھا۔ مگر وہ غافل تھا۔ دس سال میں پہلی بار وہ اِس ہسپتال میں ایسے بیٹھا تھا جیسے وہ اپنے سے اور سارے ہسپتال سے رُوٹھ گیا ہو۔ جیسے اُسے کسی سے مطلب ہی نہ رہا ہو۔ جیسے وہ کبھی وجود میں آیا ہی نہ ہو۔ اُس کے اشک غم میں پنہاں رہے۔ وہ اُس وقت بھی نہ جھلملائے جب سرجن نے آنکھیں کھول کے اُس کی پتلیوں کو دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ اِن میں موجود تھے۔

قائدِ اعظم جناح
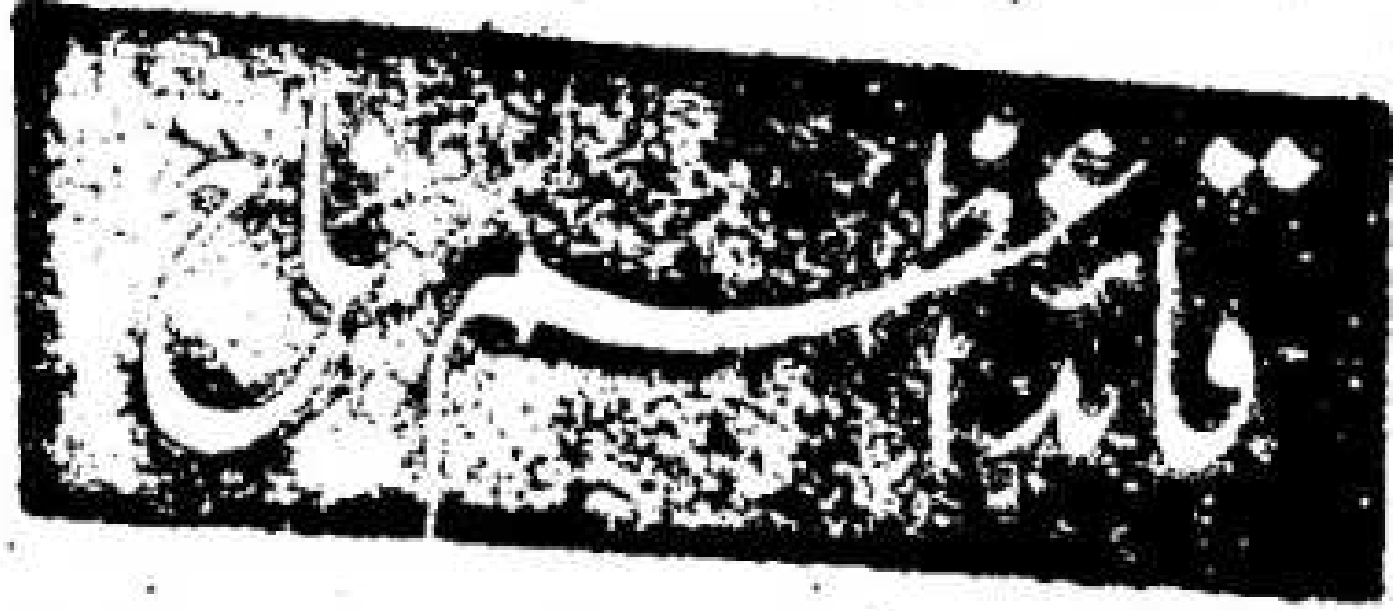
جی۔ الانا

مشہور شاعر، مفکر اور ادیب جی۔ الانا اُن مسلم لیگی لیڈروں میں سے ہیں جنھوں نے قائدِ اعظمؒ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ انھوں نے قائدِ اعظم کی اِس سوانح عمری میں اُن کی نجی اور عوامی زندگی کے اُن بے شمار گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جن تک تاحال کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی۔

قائدِ اعظم جناح — ایک عظیم قائد کی عظیم سوانح حیات ہی نہیں ایک ایسی قوم کی سرگزشت بھی ہے جس نے اپنے لیے ایک منزل متعین کی اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی جب تک خود منزل نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے نہ لگا لیا۔

ملک فیروز خان نون کی یہ خود نوشت سوانح عمری بیسویں صدی (نصف اوّل) کے برصغیر پاک و ہند کی ایک زندہ تاریخ ہے، جس میں انھوں نے اِس عہد کی پوری سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کو سمو دیا ہے۔ تحریک آزادی اور جد و جہد پاکستان کا مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ اندازِ بیان شگفتہ اور محاکاتی۔

بارہ نادر تصویریں۔

فیروز خان نون

فیروز سنز لمیٹڈ

60۔ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور
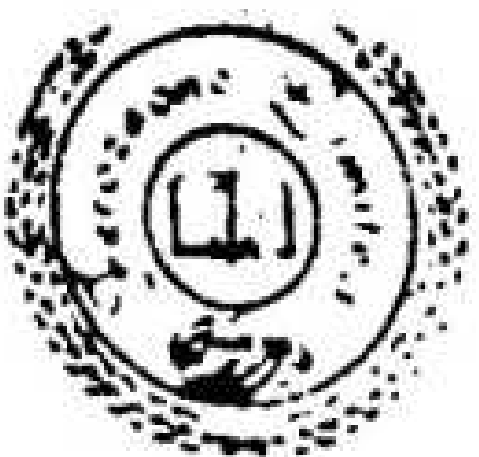
بعض انسانوں کی زِندگی کا آغاز اُن کی
تعلیم اور کیریئر سے ہوتا ہے۔ لیکن نشاط نے
زِندگی سے اپنے تجربے اور تعلیم کا آغاز کیا ہے
ایک ایسے تجربے کا جس نے زندگی کو اس کے
مُقابِل ایک شفّاف شیشے کی طرح لا کر کھڑا
کر دیا ہے۔

نشاط فاطِمہ ادبی دُنیا میں
نئی وارد نہیں جن لوگوں نے ان کا پہلا ناول
"سُنہری گیہوں" پڑھا ہے وہ ان کے اِس
دُوسرے ناول کو توقّعات سے بڑھ کر پائیں
گے۔ کیونکہ اِس درمیانی وقفے میں نشاط کی فنّی
پُختگی اور اِحساس کی شِدّت میں بے پناہ اِضافہ
ہُوا ہے۔

۶ عظیم ناول

● دستک نہ دو : الطاف فاطمہ

اونچے گھرانے کی ایک بے حد حساس لڑکی، گیتی، جس کی سچائی اور سیدھے پن نے اس کو اپنے ماحول کے
بیزار کُن حد تک ناقابلِ فہم بنا دیا تھا۔ اِس گیتی کو سب سے پہلے جس شخص نے سمجھا وہ ایک چینی نوجوان تھا ـــــ مگر وہ
چین کے ایک عظیم فلسفی کے اِس مقولے کا قائل تھا کہ ـــــ "دستک نہ دو۔ مطلوب خود تم تک پہنچ جائے گا۔"
مشہور ادیبہ الطاف فاطمہ نے اُردو ناول کو گیتی کے رُوپ میں ایک ایسا جاندار کردار دیا ہے جس کی یاد نشتر بن کر دلوں کو کچوکے دیتی رہے گی۔

● آدھی رات کا شہر : اے۔ حمید

اے۔ حمید گلاب کی ٹہنی سے لکھتا ہے۔ اس کا ہر لفظ پھول کی پنکھڑی ہے
وہ ہر سطر میں خوشبوئیں اُڑاتا ہے۔ اِس ناول میں اے۔ حمید نے اُن ناکام محبت
رُوحوں کا ذکر کیا ہے جو خوشبوؤں اور یادوں کے جنگل میں بھٹکتی پھرتی ہیں اور جنھیں کہیں قرار نہیں ملتا۔

● بہو بیگم : عادل رشید

ایک ایسی عورت کی پُر درد و المناک رُوداد جو ایک مثالی بیوی، مثالی
بہو اور مثالی ماں تھی ـــــ بہو بیگم ـــــ عورت کی لازوال محبت
مثالی اطاعت شعاری اور ناقابلِ شکست خود اعتمادی کی غیر فانی داستان ہے۔

● لاکھ بلائیں ایک نشیمن : عادل رشید

وہ اپنے محبوب کو دیوانہ وار چاہتی تھی مگر شرم و حیا کے
سبب دل کی بات زبان پر نہ لا سکی۔ اُس نے اپنی رُوح
کو ابدی کربناکیوں اور اذیتوں کے حوالے کر دیا مگر اُف تک نہ کی عادل رشید کا دُوسرا عظیم ناول۔

● [illegible] : بلقیس صادق علی

بلقیس صادق علی کی دُوسری حسین و جمیل پیش کش۔ جس میں
انھوں نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے ـــــ
[illegible] پلاٹ، دلچسپ اور شگفتہ زبان کے اعتبار سے ۱۹۶۷ء کا بہترین ناول ہے۔

● غبارِ کوچہ جاناں : آغا سہیل

غبارِ کوچہ جاناں ایک نظریاتی
فن پارہ ہے۔ جو لوگ ادب
کی افادیت سے منکر ہیں انھیں یہ ناول پڑھ کر یہ تجربہ حاصل ہو گا کہ جب
کسی نقطۂ نظر کو فن کا لباس پہنا دیا جائے تو کیسے ادب کی نوعیت
دو آتشہ ہو جاتی ہے۔